زعفران زار

ودربھ کی منتخب نگارشات

مرتبہ
محمد اسد اللہ

انتساب

اردو ظرافت کی محور اور مرکز
''بیگم''
کے نام

پیش لفظ

شکیل اعجاز

۱۹۸۰ میں جب ہم نئے نئے مشہور ہو رہے تھے۔ محمد اسد اللہ، برصغیر ہند و پاک میں انشائیہ نگار کے طور پر اپنی شناخت بنا چکے تھے۔ ہم لوگ ان کی طرف رشک کی نظر سے دیکھتے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی سوچتے تھے کہ رشک کرنا عنقریب ختم ہو جائے گا جب ہم خود قابلِ رشک ہو جائیں گے لیکن انھوں نے اپنے مسلسل ادبی کارناموں کے سبب ایسا آج تک ہونے نہ دیا۔ وہ ہندوستان میں انشائیے کے علمبردار کہلائے۔
خود کے لیے کھانا بنانا اور خود کھا نا اچھی بات ہے لیکن بہت اچھی بات دوسروں کے لیے بنانا اور دوسروں کو کھلانا ہے۔ دنیا میں یہ Trend ہے کہ ایک فیلڈ کا مشہور اور معزز آ دمی (آ دمی میں عورت بھی شامل ہے) دوسروں کی فلاح و بہبود کے لیے بھی اتنی ہی محنت کر تا ہے جتنی اپنے لیے کر تا ہے۔ کوئی ' ایکٹریس' رفیوجی کیمپ جا کر دلاسا دیتی اور فنڈ فراہم کرواتی ہے۔، ایک حسینۂ عالم، اپاہجوں کے لیے زندگی وقف کر دیتی ہے۔ فٹ بال اور کرکٹ پلیئرس اپنے کھیل کے ساتھ ساتھ دوسروں کی زندگی بہتر بنانے کے لیے کام کرتے ہیں اور آ خر کار اپنے فیلڈ سے زیادہ اپنے فلاحی کاموں سے چاہے جاتے ہیں۔
محمد اسد اللہ بھی یہی کرتے رہے ہیں۔ بعض قلم کار صرف اپنی ہی تخلیقات کی کتابیں چھاپتے ہیں، خود کے لیے انعام اور اوارڈ حاصل کرنے کے کے لیے شب و روز، ماہ و سال فیلڈنگ لگانے میں لگے رہتے ہیں۔ ادبی پروگرام اور سیمینار منعقد کروانا تو دور رہا، ادبی محفلوں میں بطور سامع شرکت نہیں کر تے۔ اپنی پر سکون زندگی میں مگن۔ اپنا ادبی ریکارڈ بنانے میں ہی مصروف رہتے ہیں۔ اس کے بر عکس محمد اسد اللہ نے مختلف روپ میں دوسروں کے لیے خود کو وقف کر رکھا ہے۔ ادبی جلسوں کے انتظامات کر تے ہوئے کر سیاں درست کر رہے ہیں۔ مائک ٹسٹ کر رہے ہیں۔ دعوت نامے لکھ اور تقسیم کر رہے ہیں۔ کسی سیمینار میں پر چہ پڑھنے کے لیے سفر کی تکلیفیں اٹھا رہے ہیں۔ کسی ادبی کمیٹی کے ذمہ دار ممبر ہیں یا صدارت کر رہے ہیں۔ الگ الگ موضوعات پر مواد جمع کرنے کے لیے لائبریریاں چھان رہے ہیں۔ پھر مسودہ ٹائپ کر کے کسی اکادمی

یا قومی کونسل سے گرانٹ پانے کی آس میں اسی مسودہ کا پیکٹ ہاتھ میں لیے پوسٹ آ فس کی قطار میں کھڑے ہوئے ہیں۔
انھوں نے عوامی خدمت کے لیے تحقیق و تدوین جیسے مشکل اور تنازعہ آ ور کام کو منتخب کیا۔ ان کی یہی کتاب ’ زعفران زار‘ پڑھتے ہوئے احساس ہوا کہ اس کا مقدمہ لکھتے وقت کہاں کہاں سے حوالے جمع کیے ہوں گے پھر اس کو دوبارہ اور سہ بارہ لکھ کر، ہر بار کچھ جملے حذف اور کچھ نئے شامل کر کے اس کو فائنل کیا ہو گا۔ یہ چند گھنٹوں کا نہیں ہفتوں کا کام ہے۔ پھر الگ الگ عنوان قائم کر کے ہر عنوان پر محنت کی ہو گی جیسے پہلا عنوان ہے ’ وجود زن‘ اس میں خواتین کے مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ ہر خاتون قلم کار کا ایک مضمون منتخب کرنے کے لیے ان کے مضامین پڑھنا، کمپوزنگ، پروف ریڈنگ، کتاب چھپوانا۔ چھپ کر آ نے کے بعد پیکٹ بنا کر دو تین سو لوگوں کو پوسٹ کرنا۔ تبصرے کروا کر شائع کروانا۔ یہ ساری محنتیں بغیر کسی مالی فائدے کے کرنے کے بعد کسی خاتون کی ڈانٹ ڈپٹ (مجرم ٹھہرا دئے گئے بے قصور کی طرح) سننا کہ میں بھی تو مزاحیہ مضامین لکھتی ہوں، آپ نے ہم کو شامل نہیں کیا۔
کسی کا دل خوش کرنا، اس کو ہنسنے مسکرانے کے مواقع فراہم کرنا، بھی ایک نیکی مانی جاتی ہے۔ یہ کتاب اس قسم کی نیکیوں سے بھری ہوئی ہے۔ ہر قلم کار نے زیادہ سے زیادہ نیکیاں کمانے کی کوششیں کی ہیں۔ مرتب نے ان سب کو کتابی شکل میں پیش کر کے نیکی ہی کا کام کیا ہے۔ میں اپنے تمام پسندیدہ جملے اور اشعار پیش لفظ ہی میں لکھ دوں تو آپ اندر کیا پڑھیں گے ؟ اس لیے دروازے کے سوراخ سے کمرے میں جھانکتے ہوئے جتنا نظر آ جائے بس اتنی چیزوں کا ذکر کرتا ہوں۔ لیجئے اس کتاب کے بے شمار پر مزاح جملوں میں سے چند۔۔ ۔۔ ۔۔

*گذشتہ ہمارے پاس پی ایچ ڈی کا ایک مقالہ جانچ کے لیے آ یا۔ ایک خاتون مقالہ نگار نے اظہار تشکر کچھ یوں کیا تھا۔ ۔۔ میں شکر گذار ہوں خلد نشین نانا جان (سابق ایم ایل اے) کی، جن کے حوصلہ دلانے پر میں نے تحقیقی کا کام ہاتھ میں لیا۔ ہائی کورٹ جج چچا اور ایڈوکیٹ ماموں جان کی جنھوں نے ہر مرحلہ پر میری حوصلہ افزائی کی۔ پرنسپل خالہ کی جنھوں نے لائبریری کی سہولیات بہم پہنچائیں۔ ڈاکٹر بھائی جان کی جنھوں نے اس دوران میری صحت کا خیال رکھا، اکاونٹنس آفیسر شوہر اور انجینیرنگ میں پڑھ رہے دونوں بیٹوں کا جنھوں نے حساب میں میری مدد کی۔ (ڈاکٹر بانو سرتاج)
*ہمارے ایک دوست ہیں ان کے کان پر ہمیشہ قلم رکھا ہوتا ہے اور میز پر کورا کاغذ، چنانچہ وہ لکھتے رہتے ہیں۔ جیسے گھوڑا گاڑی میں جتا چلتا رہتا ہے۔، مشین کپڑے سیے جاتی ہے۔ لکھنے کا مشغلہ ان کو، پڑھنے، غور اور سمجھنے کی مہلت نہیں دیتا۔ تاریخ میں ان کا نام قطب الدین ایبک کے ساتھ لکھا جائے گا۔ اس نے قطب مینار بنایا تھا ہمارے دوست ’کتب مینار ‘بنا رہے ہیں۔ اس لیے ہم نے ان کا نام کتب الدین ایبک رکھ دیا ہے (ڈاکٹر صفدر)
*محلے کا نل اگر صبح و شام عورتوں کی عدالت ہے تو دو پہر میں اسی نل پر نوجوان تاش اور شطرنج کھیلتے ہیں۔ دیر رات تک بزرگ حضرات کی پارلیمنٹ رہتی ہے۔ جب یہ تمام رخصت ہو جاتے ہیں تو کتے اس جگہ پر قبضہ جما لیتے ہیں (ڈاکٹر اشفاق احمد)
*ہمارے ایک بزرگ تنخواہ دار کہا کر تے تھے مہینے کا پہلا عشرہ تر بتر، دوسرا کاٹ کسر اور تیسرا در بدر (ڈاکٹر محمد اظہر حیات)
*ہمارے ملک میں کوٹ پہننے کے لیے مخصوص لباس کی شرط نہیں۔ پٹھان شلوار پر کوٹ پہنتا ہے حیدر آ بادی ڈھیلے پاجامے پر، مراٹھا دھوتی پر اور جنوبی ہند کے باشندے لنگی پر (ڈاکٹر محمد یحییٰ جمیل)
* لوگ باگ کہہ گئے ہیں کہ پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے حالانکہ پیدل چلنے کے لیے پہلے سے صحت کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ (محمد توحید الحق)
* الیکشن میں کھڑے ہونے سے زیادہ بیٹھنے میں فائدہ ہے۔ بعض لیڈروں کا تو یہ باقاعدہ شریفانہ بزنس ہے۔ وہ کسی حلقہ انتخاب سے پرچہ نامزدگی بھر کر الیکشن میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور جن دو افراد میں کڑا مقابلہ ہوتا ہے ان دونوں ہی حضرات سے اچھی خاصی رقم اینٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں (ڈاکٹر شیخ رحمٰن اکولوی)
مہمان بارش کے قطرے کی طرح تنہا نہیں آ تا۔ ۔۔ ان دنوں یہ ہونے لگا ہے کہ مہمان کے رخصت ہو تے وقت میزبان کے ہونٹوں پر سہما سہما سا ایک جملہ لڑکھڑا تا ہے۔ ’شام کا کھانا کھا کر جاتے تو اچھا تھا۔ ‘اندر ہی اندر دل لرزتا رہتا ہے کہ اس کی یہ رسمی پیش کش شرفِ قبولیت سے نواز دی گئی تو یہ بلا ایک دن اور قہر برپا کرے گی۔ اسی لئے وہ مہمان کے انکار کرتے ہی اسے گلے لگا کر خدا حافظ کہتا ہے اور سکھ کا سانس لیتا ہے یا پھولتی ہو ئی سانس درست کر تا ہے۔ (محمد اسد اللہ)
*ہماری شکنتلا (اچلپور سے مرتضیٰ پور ہوتے ہوئے کچھ آ گے تک سفر کرنے والی انگریزوں کے زمانے کی چھوٹی لائن کی ٹرین) کے سگنل کا رویہ عجیب ہی نوعیت کا ہے اسے اٹھائیں تو گرتا ہے اور گرائیں تو اٹھتا ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ اسے گرانے کے لیے سگنل مین کو سگنل پول پر چڑھنا ہوتا ہے جس سے سگنل کم اور سگنل مین زیادہ گرتا ہے۔

(بابو آر کے)
*خدا کو کسی کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے تو وہ اسے مکان کی تلاش میں الجھا دیتا ہے۔ ۔ والد صاحب کا حکم نازل ہوا فوراً ایک عدد مکان تلاش کیا جائے۔ ہمیں والد صاحب سے اس حکم کی قطعی امید نہ تھی۔ کیونکہ ہماری عمر خوبصورت لڑکی تلاش کرنے کی ہے۔ گزشتہ ہفتے ایک مکان کے سلسلے میں ایک ویران محلے میں پہنچے صاحبِ خانہ نے ہماری بیگم کے متعلق دریافت کیا، ہم نے حیرت سے کہا، حضرت ابھی تو ہمارے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے، شادی کہاں سے ہو گی۔
حضرت یکلخت بھڑک اٹھے اور کہنے لگے۔ ''پھر تو آپ کو مکان نہیں مل سکتا۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں تو ٹھیک ورنہ۔ ۔''ہم نے جواب دیا۔ ''یہ مکان ہمارے والدین کو چاہئے وہ خیر سے شادی شدہ ہیں۔ '
(انصاری اصغر جمیل)
ایک دن دفتر سے واپسی پر شوہر خوشی سے پاگل بنا گھر میں داخل ہوا اور بیوی کو پکار کے کہنے لگا۔ بیگم سنو تو سہی بہت بڑی خوشخبری ہے، میں نے لاٹری میں ایک لاکھ کا انعام حاصل کیا ہے۔ بیوی نے سرد لہجے میں دریافت کیا، ' پہلے یہ بتاؤ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے کے لیے تمھارے پاس روپے آئے کہاں سے ؟'(حیدر بیابانی)
*منچلے کی بات سن کر مولانا مد ظلہ العالی اسے گھور کر دیکھنے لگے۔ منچلا مسکین صورت بنا کر مولانا مد ظلہ العالی کو تکنے لگا۔ کچھ دیر ماہر ہپناٹسٹ کی طرح گھورنے کے بعد گرجدار آواز ان کے منھ سے نکلی۔ استغفر اللہ۔ آواز اتنی گرجدار تھی کہ مسجد کی دیوار کی منڈیر پر بیٹھا کالا کوا اڑ گیا۔ شاید کسی جھوٹے کو کاٹنے کے لیے۔ مگر سماج میں جھوٹے اتنے ہو گئے ہیں کہ کالا کوا کاٹے تو کس کس کو کاٹے۔
(محمد طارق)
ہمارے قصبے میں پانچ سو گھر ہیں ہر گھر میں ایک شاعر ہے۔ پھر شاعروں کے چار گروپ ہیں۔ ہر ایک گروپ کا شاعر دوسرے گروپ کے شاعر کو شاعر ہی نہیں مانتا۔ (ڈاکٹر رام پر کاش سکسینہ)
کسی ماہر نفسیات کی طرح اہلیہ کی نظر میری ہر حرکت پر رہتی ہے۔ کون سی بات پر میری آنکھ جھپکتی ہے، کن باتوں پر میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور کس پر میں خود کھڑا ہو جاتا ہوں۔ (سعید احمد خاں)
ان کا اصول ہے ' ٹی۔ وی اپنے گھر کی اور بیوی پڑوس کے گھر کی۔ ہر پڑوسی کے گھر کو وہ اپنا گھر اور پڑوس کے ہر رشتے دار کو وہ اپنا رشتہ دار سمجھتے ہیں۔ پڑوسی اپنی بیوی کو اتنی محبت سے آواز نہ دیتا ہو گا جتنی محبت سے مرزا جی اس کی بیوی کو 'بھابھی' کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن ایسا صرف ان ہی گھروں میں ہوتا ہے جہاں ''بھابی'' خود کو اتنی محبت کے ساتھ ''بھابھی'' کہلوانے کا شوق رکھتی ہوں۔ (حسنین عاقب)
* کتنی ٹھنڈ لگ رہی ہے ؟ٹھنڈ یا سردی؟ دوسرے نے پوچھا لگ رہی ہے یا بج رہی ہے ؟ چوتھے نے جاننا چاہا (رفیع الدین مجاہد)
* عید سے زیادہ لوگ چاند رات مناتے ہیں یا پھر چاند دیکھتے ہی بے تحاشہ عید منانا شروع کر دیتے ہیں۔ بازار میں اتنی بھیڑ کہ تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ گئی رات تک بازار میں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر لگتا ہے کہ لوگ جب چاند رات میں ہی اپنے دل کے سارے ارمان نکال لیں گے۔ (محمد ایوب، کامٹی)
یوں تو سال میں تین موسم ہوتے ہیں لیکن لوگ، پت جھڑ، ساون بسنت، بہار میں سے کسی ایک کا جب ذکر کرتے ہیں تو اسے بھی چوتھا موسم قرار دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک پانچواں موسم پیار کا ہوا کر تا ہے۔ شاید اس بات میں یہ اشارہ موجود ہے کہ پیار کا بھی کوئی بھروسہ نہیں کب موسم کی طرح بدل جائے۔ (سید اسد تابش)
محمد اسد اللہ نے ہر تخلیق سے پہلے تخلیق کار کا مختصر لیکن جامع تعارف تحریر کیا ہے۔ اس تعارف سے نئی معلومات حاصل ہوئیں۔ کتاب کے باب سوم (فردوس گوش)طنز و مزاح نگار شعرا سے۔ بطور نمونہ چند اشعار:

کل پریشان تھے حالات بدلنے کے لیے
آج بدلے ہوئے حالات سے ڈر لگتا ہے (عبد الصمد جاوید، علامہ گنبد)

حشر قربانی کے بکروں کا بہت دیکھ چکے
لوگ اب جذبۂ ایثار کہاں سے لائیں (فیاض افسوسؔ)

سیدھی کمر ہوئی بھی نہیں تھی ابھی کہ پھر
ماری ہے اس نے لات ارے باپ کیا کروں (ناظم انصاری)

تمہارے چہرے کی جھرّی سے ہم کو کیا لینا
تمہاری آنکھ میں کیف و سرور آج بھی ہے (جملوا انصاری)

میکو بولا پائے پک رے، کھا کے جانا بھائی صاب

میرا سالا میکو بناریا، لاتا آفت (سر فراز کاتب)
درشن میری آنکھوں کو کرانے نہیں آتے
کچھ دن سے وہ چکی پہ پسانے نہیں آتے (لقب عمران)
وہ اپنی کھڑکی میں آ --+کے بھونڈے سروں میں اک گیت گا رہا ہے
تو کھد کی گاڑی پہ بیٹھے ہم بھی گھمیلا پھٹکا بجا رہے ہیں (فوجی جلگانوی)
ہم جھاڑیوں میں خوف سے اوندھے پڑے ہوئے
چیتا براجمان ہماری مچان پر (غنی اعجازؔ)
سری دیوی کی کوئی فلم آ جائے جو گاؤں میں
چِتندر کی طرح ہلّڑ مچاتے ہیں بڑے خالو (رفیق شاکر)
اس دورِ سیاست میں ہم نے تو یہی دیکھا
بگلوں کی ہوئی پیشی کوؤں کی عدالت میں (منہ پھٹ ناگپوری)
جھانپڑ دکھائی دیتے ہیں تگڑے ضرور ہم
جا کر مقابلے میں پسر جائیں ہم تو کیا (مسعود احمد جھانپڑ)
اوروں سے تو تھّرانا، اپنوں ہی پہ غرانا
یہ ہمّت مردانہ لا حول و لا قوت
املا انشا درست جن کا اور نہ ہجا ٹھیک
وہ بھی پی ایچ ڈی ہو جائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں (مفلس قارونی)
تیر نظریں، بھوں کٹاری توپ خانہ ہے ادا
کتنے بے لائسنس ہیں ہتھیار تیرے شہر میں (حسین خاں جھنجھٹ اکولوی)
تھوبڑا ان کا سناتا ہے کہانی رات کی
لے کے گورے گال کے بوسے کوئی مچھر گیا (ریاض الدین کامل)
تاکید میری ساس کی بیٹی کو ہے یہی
شوہر ہو سامنے تو سدا منہ پھلا کے رکھ (محمد توحید الحق)
بے خودی میں غیر کو ہسبنڈ سمجھ کر لڑ پڑے
ان کو عادت پڑ گئی ہے ہر گھڑی تکرار کی (ڈاکٹر محمد کلیم ضیا)
ہوکے رہ جائے گی ارمانوں کی ایسی تیسی
وصل کی شب ہی لڑو گی مجھے معلوم نہ تھا (نادر بالاپوری)
مستقل ہو، عارضی اچھی نہیں
چار دن کی چاندنی اچھی نہیں (التمش شمس اکولوی)
بینڈ باجا ترا بجا دیوں کیا؟
نوکری والی ہے جما دیوں کیا؟ (عقیل ساحر اکولوی)
لاتے ہیں مریضوں کو کرامات سنا کر
چلتے ہیں کمیشن پہ یہ باواؤں کے چمچے (ڈاکٹر عمران علی خاں عمرانؔ)

یہ تمام چیزیں پڑھتے ہوئے ایسا لگا کہ چند نام چھوٹ گئے ہیں۔ تحقیق کر کے کتابیں چھاپنے والے ہر شخص کا یہی دکھ ہے کہ جب وہ اخبارات و رسائل میں مواد کی فراہمی کے لیے اعلان کرواتا ہے تو کوئی توجہ نہیں دیتا۔ کتاب چھپ کر آ تی، شہرت پاتی ہے تب سخت اعتراض اٹھتا ہے کہ اس میں ہم کیوں نہیں ؟

یہ کتاب آپ کی نظر سے گزر نے کے بعد کچھ نام ذہن میں آئیں تو قلم کار کا نام، مختصر تعارف اور نمونۂ نثر / نظم، محمد اسد اللہ تک پہچانے کی زحمت فر مائیں۔ اس طرح کی تحقیقی کتابیں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ دس پندرہ برس پہلے شائع ہوئی کتاب میں جو نام شامل نہیں تھے اس وہ اس کتاب میں شامل ہو گئے۔ اس میں جو رہ گئے، آ نے والی کتاب میں ہو جائیں گے۔ تحقیق کی دنیا میں یہ سلسلہ چلتا رہتا ہے۔

سخت محنت، تلاش و جستجو کے باوجود، ہر قلم کار تک رسائی نہیں ہو پاتی اس لئے مرتب یا محقق کی نیت پر شک کرنے کے بجائے اس پر محبت کی نظر رکھیں ورنہ یہ لوگ ایسے عرق ریزی والے کاموں سے دست بر دار ہو کر چین سے بیٹھ رہیں گے۔ اس بات کو اسی کتاب میں فیاض افسوسؔ نے یوں کہا ہے۔

حشر قربانی کے بکروں کا بہت دیکھ چکے
لوگ اب جذبۂ ایثار کہاں سے لائیں۔
شکیل اعجاز

مقدمہ

محمد اسد اللہ

مشہور مزاح نگار یوسف ناظم نے ودربھ کے ایک مزاح نگار کی کتاب کے پیش لفظ میں سنہ ۱۹۹۰ میں یہ تاریخی جملہ لکھا تھا:

’’ودربھ نے ادھر مزاح کے میدان میں اتنے کھلاڑی پیدا کئے ہیں جتنے کہ کیرالہ اور کر ناٹک نے تیز دوڑنے والے پیدا کئے ہیں۔‘‘ 1

نثر میں اس قبیل کی کتابوں کی اشاعت کا سلسلہ ودربھ میں ۱۹۸۱ سے شروع ہوا تھا۔ 2۔ یہ ہنسی ابھی رکی نہیں ہے۔ اب جب کہ اس کاغذی کھلکھلاہٹ کو چالیس برس ہونے کو آئے، وہیں ’، زندہ دلانِ ودربھ‘، کا بورڈ آویزاں کئے بغیر وہی زندہ دلی بر قرار ہے، برسوں کی اس چلہ کشی کے دوران تقریباً ڈیڑھ درجن نثر نگار اور لگ بھگ اتنے ہی شاعر اپنی بغلوں میں ہنستی مسکراتی کتابیں دابے میدانِ ظرافت میں قارئین کو گد گدا رہے ہیں۔ بے کتابے طنز و مزاح نگاروں کی تعداد بھی ان سے کچھ کم نہیں ہیں جو گاہے بگاہے رسائل اور اخبارات میں گل کھلاتے ہیں جنھیں پڑھ کر قارئین کھلکھلاتے رہتے ہیں۔ اس کتاب میں ان تمام کی نمائندگی کا اہتمام کیا گیا ہے۔ اس لحاظ سے ان کی تین ٹولیاں بنتی ہیں۔

*باب اول۔ صاحبِ کتاب ظریفانہ نثر نگار۔
*باب دوم۔ بے کتاب ظریفانہ نثر نگار۔
*باب سوم۔ طنز و مزاح نگار شعرا۔

قبل اس کے کہ ہم اس دیوارِ قہقہہ تک پہنچنے کی کوشش کریں، ذرا دیکھ تو لیں علاقۂ ودربھ کا محلِ وقوع کیا ہے۔

علاقۂ ودربھ۔ ایک تعارفی نوٹ

مہاراشٹر اسٹیٹ کو سرکاری انتظام کے تحت ممبئی، پونا، اورنگ آباد اور ناگپور ڈیویژن کے نام سے چار حصّوں میں تقسیم کیا گیا تھا۔ موجودہ ودربھ گیارہ اضلاع پر مشتمل ہے۔ اس کا مشرقی علاقہ برار کہلاتا ہے جس میں امراؤتی، ایوت محل، آکولہ، بلڈانہ اور واشم اضلاع شامل ہیں۔ مغربی حصّے میں ناگپور، بھنڈارہ، گوندیا، چندرپور، گڑچرولی، وردھا ضلعے ہیں یہ علاقہ گونڈوانہ کے نام سے مشہور تھا۔ علاقۂ ودربھ میں علمی اور ادبی سرگرمیاں عہدِ قدیم ہی سے جاری و ساری رہی ہیں۔ گونڈوانہ کی بہ نسبت سابق صوبہ متوسط برار میں علمی و ادبی شخصیات کے کارنامے یہاں کی علمی فضا کو پروان چڑھانے میں معاون ثابت ہوئے۔

تاریخ امجدی (چراغ برار) میں مورخِ جناب امجد حسین خطیب رقم طراز ہیں:

’’ایسا لکھا ہے کہ اصل نام صوبہ برار کا وردھا تٹ یعنی وردھا کا کنارا اور وردھا برار کی مشہور نہروں میں سے ہے اور تٹ کنارہ کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ خطہ اس ندی کے کناروں پر واقع ہے اس واسطے اس کا اصل نام وردھا تٹ ہے۔ بہرحال خطہ برار حسبِ اقوال خلاصۃ التاریخ وغیرہ کے مابین دو پہاڑوں کے ہے ایک کوہِ بندیاچل اور سینہاچل عبارت انہیں پہاڑوں سے ہے۔‘‘

ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اس علاقہ کی تاریخ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

’’دورِ آصفیہ میں یہ علاقہ ’ملک مانی حیدر آباد‘ کے نام سے یاد کیا جاتا تھا۔ اس وقت اس میں چھ اضلاع شامل تھے۔ لیکن ستمبر ۱۹۰۵ء میں جب برار کا الحاق صوبہ متوسط سے ہو گیا تو ایلچپور و امراؤتی اور باسم کو اکولہ میں ملا کر چار اضلاع بنائے گئے۔ یہ چاروں اضلاع یکم مئی ۱۹۶۰ء کو اس نئی ریاست میں شامل کر لئے گئے جو ریاستِ مہاراشٹر کہلاتی ہے۔ برار میں مسلم تہذیبی و تمدّنی تاریخ کا باقاعدہ آغاز ۱۲۹۴ء میں دیو گری پر علاو الدین خلجی کے حملے سے ہوتا ہے۔ لیکن شاہ دولہا

رحمن غازی کے مشہور و معروف واقعۂ جہاد سے یہ بات بھی ثابت ہوتی ہے کہ اس حملے سے تقریباً ۲۹۰سال پہلے مسلمانوں نے اس علاقہ میں اپنا قدم جما لیا تھا۔
برار میں سب سے پہلے جن نثری تصنیفات کا تذکرہ ملتا ہے وہ ان سندھی علماء کی تصانیف ہیں جو بہمنی دور میں صفدر خاں سیستانی ناظم صوبۂ برار کے قائم کردہ مدرسہ میں تعلیمی و تدریسی خدمات انجام دیتے تھے۔ یہ ۱۳۴۹ء کا زمانہ تھا۔ منشی حیات خاں مظہر، سیّد مبین الرحمن، خواجہ لطیف احمد، حبیب الرحمن صدیقی راشد اللہ انعامدار اور میر غلام احمد حسن کے نام اس علاقہ کے نثرنگاروں میں لئے جاتے ہیں۔(۳)
ودربھ میں آزادی کے بعد ہی تخلیقی نثر کو فروغ حاصل ہوا اور بیشتر نو جوان مختلف اصناف کی جانب مائل ہوئے ان میں طنز و مزاح اور منی افسانے کے علاوہ افسانوں کی تخلیق کا سلسلہ شروع ہوا۔ برار کی بہ نسبت ناگپور اور کامٹی میں افسانہ نگاروں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد مو جود تھی یہ وہی زمانہ تھا جب اس علاقہ سے اردو اخبارات شائع ہونے لگے تھے۔ ناگپور میں ۱۸۵۷ء میں اردو صحافت کی بنیاد پڑ چکی تھی۔ ’’ترجمان‘‘ ناگپور (۱۸۸۴ء) صوبۂ متوسط برار کا پہلا قابلِ ذکر اخبار تھا۔
عبد الستار فاروقی جنھوں نے ۱۹۳۱ء میں کامٹی سے ہفتہ وار ’’امّید‘‘جاری کیا تھا۔ اپنے مضامین میں افسانوی طرزِ اظہار کو بروئے کار لا کر افسانہ نگاری کے لئے ابتدائی نقوش ثبت کئے انھیں ودربھ کے اوّلین افسانہ نگاروں میں شمار کیا جاتا ہے، برار میں سیّد حبیب الرزّاق کی تحریروں میں چند مضامین ملتے ہیں جن میں واقعات کو شگفتہ انداز میں بیان کیا گیا۔

ودربھ میں مزاح نگاری

طنز و مزاح کے سلسلے میں سید عبد الرزّاق کے دو مضامین قابلِ ذکر ہیں ’’سائیکل میں ریڈیو‘‘ اور ’’ماڈل گرل‘‘ جو ناگپور کے رسائل میں شائع ہوئے تھے۔ ودربھ میں ۱۹۷۰ کی دہائی میں کئی نوجوان لکھنے والے سامنے آئے جنھوں نے اس نئے میدان میں قدم رکھا اور ظرافت نگاری ایک ادبی وبا کی شکل اختیار کر گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے ان ہی جراثیم سے متاثرہ مضامین اور کتابیں منظرِ عام پر آنے لگیں۔ اسی دوران شہر اکولہ میں اسی موضوع پر سیمینار بھی منعقد ہوا جس میں اردو کی مشہور ادبی شخصیات یوسف ناظم، ظ انصاری، خواجہ عبد الغفور، ڈاکٹر صفدر، ڈاکٹر محبوب راہی، شکیل اعجاز اور شیخ رحمٰن اکولوی موجود تھے۔ جن ادیبوں نے ودربھ میں ظرافت کو اپنے ادبی اظہار کا وسیلہ بنایا یا منھ کا مزہ بدلنے کے لئے چند مضامین سپردِ قلم کئے ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں۔

نثر نگار

سیّد صفدر، شکیل اعجاز، شیخ رحمن اکولوی، بانو سرتاج، محمّد اسد اللہ، بابو آر کے، رفیق شاکر، انصاری اصغر جمیل، ایس ایس علی، محمد خورشید نادر، ڈاکٹر جابِل ناگپوری، صوفی غلام حیدری، حیدر بیابانی، ڈاکٹر رام پر کاش سکسینہ، ثریا صولت حسین، عمر حنیف، طارق کھولا پوری، ڈاکٹر اشفاق احمد، آر یو خان، سعید احمد خان، سمیع بن سعد، رحمت اللہ مالوی، ایم آئی ساجد، شکیل شاہجہاں، نثار اختر انصاری، اظہر حیات، شاہد رشید، یحییٰ جمیل، ڈاکٹر اظہر ابرار، محمد رفیع الدین مجاہد، محمد توحید الحق، خان حسنین عاقب، محمد ایوب، اسد تابش وغیرہ۔

شعرا

حافظ محمد ولایت اللہ، عبد الصمد جاوید (علامہ گنبد)، فیاض افسوس، ناظم انصاری، جمال الدین جملوا انصاری، سرفراز کاتب، فنی ایوت محلی، عبد الحفیظ لقب عمران (اچلپور)، فوجی جلگانوی، رفیق شاکر کھامگانوی، انوار احمد قریشی نشتر (اکولہ) منہ پھٹ ناگپوری، مسعود احمد جھانپڑ (ناگپور)، مفلس قارونی، خواجہ زین العابدین۔ نایاب، غنی اعجاز (اکولہ)، حیدر بیابانی، متین اچلپوری، فصیح اللہ نقیب (اکولہ) ،ح خ جھنجھٹ اکولوی، ریاض الدین کاملؔ، محمد توحید الحق (کامٹی)، نادر بالاپوری، انیس احمد شوق، وحیدؔ شیخ (ناگپور)، التمش شمس اکولوی، عقیل ساحر، بشیر بشر، بدنیرہ، ڈاکٹر عمران علی خاں عمران (اکولہ)، آصف نعیم (منگرول پیر)، شاداب انجم (کامٹی)، جمیل انصاری وغیرہ۔

احتساب

زیرِ نظر کتاب ودربھ کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور شاعروں کی تخلیقات کا ایک انتخاب ہے۔ ودربھ میں شائع ہونے والے اس قسم کے انتخابات میں شاعری میں غزلستانِ برار (۲۰۱۵) کو خاص طور اہمیت حاصل ہے۔ اس کتاب کے ذریعے شاعروں کی ایک کثیر تعداد کو پہلی مرتبہ نمونۂ کلام سمیت متعارف کروایا گیا تھا۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل نے اپنی کتاب ''ناگپور میں اردو'' (۱۹۹۳) میں ناگپور کے کئی ایسے ادیبوں اور شاعروں کا تعارف مع کلام پیش کیا ہے جن کے ہاں ظرافت جزو تحریر ہے۔
ماہنامہ شگوفہ نے معروف مزاح نگار اور مصور شکیل اعجاز کے تعاون سے جولائی ۱۹۹۴ میں ''گوشۂ ودربھ'' شائع کیا تھا جس میں ظریفانہ رنگ میں موجود شعری و نثری تخلیقات شائع کی گئی تھیں۔ ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن کی کتاب 'برار میں اردو زبان و ادب کا ارتقاء' (۲۰۱۱)، 'شخصیاتِ ودربھ' (۲۰۱۵)، 'ادبیات ودربھ' (۲۰۱۳) میں بھی ودربھ کے کئی فنکاروں کو خراجِ تحسین پیش کیا گیا ہے۔ اسی طرح ڈاکٹر عبد الوحید نظامی کی کتاب ''برار میں طنز و مزاح'' (۲۱۰۸) میں پندرہ طنزیہ و مزاحیہ مضامین شامل ہیں۔ راقم الحروف کی کتاب ''پیکر اور پر چھائیاں'' (۲۰۱۲) میں شامل تین مضامین میں ان ظرافت نگاروں کی ادبی کاوشوں کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی تھی۔
'زعفران زار۔ ودربھ کی منتخب نگارشات' میں شاعروں اور نثر نگاروں کی منتخب تخلیقات پیش کی جا رہی ہیں تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ ظرافت کی تخلیق کے معروف مراکز میں ودربھ بھی ایک اہم علاقہ ہے جہاں اس مخصوص ادبی طرزِ اظہار کی آبیاری کرنے والے فنکاروں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے۔
ودربھ کے چند اہم مزاح نگاروں کا تعارف ذیل کی سطور میں پیش کیا جار ہا ہے۔

شفیقہ فرحت

شفیقہ فرحت کا تعلق شہر ناگپور سے تھا اور وہ ملازمت کے سلسلے میں بھوپال منتقل ہوئیں تو اسی شہر کو اپنا وطن ثانی بنا لیا تھا۔ ڈاکٹر صفدر نے ان کے متعلق لکھا تھا: شفیقہ فرحت جس قدر طنز و مزاح میں بسی ہوئی ہیں، اسی قدر بھوپال میں بس گئی ہیں مگر بیٹی کہیں بھی رہے پرائی نہیں ہوتی۔ شفیقہ فرحت مہاراشٹر کی بیٹی ہیں۔
شفیقہ فرحت نے قیام ناگپور کے زمانے میں بچوں کے رسائل ماہنامہ ''چاند'' اور ''کرنیں'' شائع کئے تھے۔ ادب میں اب کی پہچان ایک طنز و مزاح نگار کے طور پر مستحکم ہوئی تھی۔ خواتین مزاح نگاروں کی اس زمانے میں بھی کمی تھی اور یہ قلت اب بھی برقرار ہے۔ شفیقہ فرحت کا مزاح ان کے اسلوب سے پھوٹتا ہے اور زندگی کے ان گوشوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا ہے جن میں آس پاس کی رنگا رنگی اور خوشیاں کبھی ہمیں مسکرانے پر آمادہ کرتی ہیں اور کبھی ہم بے اختیار ہنس پڑتے ہیں۔
''لوگ جب ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہیں یعنی ریٹائر ہو جاتے ہیں تو خواہ صدر جمہوریہ کے عہدے سے ہوں یا چپراسی کے، تو انھیں فرصت ہی فرصت ہوتی ہے۔ پنشن اور مختلف فنڈس کے ساتھ ایک ''چین'' کی بنسی ملتی ہے جسے وہ بجاتے رہتے ہیں۔ اب اس ''چین'' کی بنسی والی کہاوت سے یہ راز نہیں کھلتا کہ بنسی ملک چین سے برآمد کی جاتی ہے یا بذات خود چین نامی کسی دھات یا لکڑی کی ہوتی ہے یا سیدھی سادی عام قسم کی بانسری کو چین سے بیٹھ کر چین اور اطمینان کے تال کے سروں میں بجایا جاتا ہے۔ اس کے بجانے کی ٹریننگ لی جاتی ہے یا رٹائر ہونے کے ساتھ ہی الہامی طور پر اس فن پر عبور حاصل ہوتا ہے۔''
(بعد سبک دوشی)

بانو سر تاج

بانو سر تاج بحیثیت افسانہ نگار اردو ادب میں ایک مشہور نام ہے۔ ان کے متعدد مضامین مزاحیہ رنگ و آہنگ لئے ہوئے چند رسائل میں شائع ہوئے۔ ان کی ظریفانہ تحریروں میں افسانوی انداز غالب ہے۔ ارد گرد بکھری زندگی کی ناہمواریوں کو وہ شگفتہ انداز میں بیان کرتی ہیں۔ ان کی تحریروں میں واقعات سے مزاح پیدا کرنے کی کوششیں نمایاں ہیں۔
ظریفانہ رنگ میں ان کی دو کتابیں ہیں۔ ترا ممنون ہوں (۲۰۰۴) اور خطرے کا الارم
(۲۰۱۰)۔ ماہنامہ شگوفہ نے ان کی طنزیہ و مزاحیہ تخلیقات اور تعارفی مضامین پر مشتمل گوشہ شائع کر کے ان کی خدمات کو نمایاں کیا ہے۔ ان کے ایک مزاحیہ مضمون کا اقتباس ملاحظہ
فرمائیں:

’’دوسرے روز میدان میں تشریف لے آئیں بہت دیر تک نہایت دلچسپی سے ہماری جد و جہد ملاحظہ فرماتی رہیں پھر گویا ہوئیں۔ اگر آپ کو سائیکل پر بٹھا کر ایک شیر آپ کے پیچھے چھوڑ دیا جائے تو یا یقیناً آپ سائیکل لے کر بھاگ نکلیں گی۔ ہمیں بہت شرم آئی اور ایک گھنٹے کے اندر ہم سیٹ پر بیٹھنا اور سائیکل آگے بڑھانا سیکھ گئے۔‘‘
(ہم نے سائیکل سیکھی، خطرے کا الارم۔ ص ۱۲۱)

ثریا صولت حسین

ثریا صولت حسین نے افسانہ نگاری اور شاعری میں اپنی پہچان بنائی تھی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ مدو جزر ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا جس میں ۱۸، افسانے اور پانچ مزاحیہ مضامین اور خاکے ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ نیند پری، یور آنر، اندھے عقیدے، رنگِ بہار اور ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے۔

ڈاکٹر صفدر

ایک صاحبِ نظر ناقد اور جدید شاعر کی حیثیت سے ڈاکٹر صفدر کی شخصیت اردو ادب میں محتاجِ تعارف نہیں ہے۔ ان کی ناقدانہ تحریروں میں بھی ظریفانہ اندازِ نگارش وارث علوی کی یاد دلاتا ہے۔ لیکن اس قبیل کے بیان کے لئے جو وسعت چاہئے یہاں دستیاب نہیں، شاید اسی اظہار کی تشنگی نے ان سے مزاحیہ مضامین لکھوائے۔ ان کی خالص مزاحیہ تحریروں میں ان کے اندر چھپے ظرافت نگار کی شوخ مزاجی، اور طنز کی سفاکی اور ایک انشائیہ نگار کی تخیل پروازی نمایاں ہے۔ ڈاکٹر صفدر نے اخباروں کے لئے کالم بھی لکھے جن میں ادب، سماج اور انسانی زندگی کے ایسے گوشوں کو نمایاں کیا گیا ہے جن کی عجیب و غریب کیفیت کو ہم بے چینی کے ساتھ محسوس تو کرتے ہیں لیکن مزاح نگار کے قلم سے وہ معرضِ اظہار میں آتے ہیں تو ہم مسکرائے بغیر نہیں رہ پاتے۔ ان کے مضامین: پوسٹ مین، مچھروں کی مدافعت میں اور کرسی نامہ، ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوئے۔ ان کے مزاحیہ مضامین اور کالموں کا مجموعہ ’’آئینۂ خنداں‘‘ (۲۰۱۹) منظرِ عام پر آ چکا ہے اور خاکوں کا مجموعہ ’’ذکرِ شہرِ یاراں‘‘ زیرِ طبع ہے۔ مورخہ ۲۶، مارچ ۲۰۲۱ کو ان کا انتقال ہو گیا۔
کرسی نامہ میں لکھتے ہیں:
’’کرسی کے چار پانو ہوتے ہیں مگر یہ چوپایہ نہیں کہلاتی۔ اس لئے کہ چوپایہ جان دار ہوتا ہے اور کرسی بے جان۔ جب اس پر کوئی شخص اپنے دو پانو کے ساتھ بیٹھ جاتا ہے تو کرسی میں جان پڑ جاتی ہے اور یوں چھ پانو والی ہو کر چوپایوں سے زیادہ حیوان ہو جاتی ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یوں بیان کی جا سکتی ہے کہ کرسی چوپائے سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔ یہ چوپائے سے زیادہ خطرناک اور بے قابو ہوتی ہے۔ یہ چوپائے سے زیادہ دودھ دیتی ہے، اگر دودھ دینے والی ہو۔ اور چوپائے سے زیادہ خونخوار ہوتی ہے اگر خون پینے والی ہو۔‘‘ (کرسی نامہ۔ صفدر۔ آئینۂ خنداں)

شیخ رحمن اکولوی

شیخ رحمٰن اکولوی کی کتاب ’’بلا عنوان‘‘ (۱۹۸۱) کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ ودربھ میں شائع ہونے والا طنزیہ و مزاحیہ ادب کا پہلا مجموعہ تھا۔ اس سے قبل ثریا صولت کا افسانوی مجموعی مد و جزر (۱۹۸۶) منظرِ عام پر آیا تھا جس میں افسانوں کے ساتھ پانچ مزاحیہ مضامین بھی شامل تھے۔
شیخ رحمٰن اکولوی نے ابتدا منی کہانیوں سے کی تھی عکس ریز (منی کہانیوں کا مجموعہ)کی اشاعت کے بعد سیدھے مزاح کے بڑے پردے پر آ گئے۔
عصری زندگی کی نا ہمواریوں کو گہری نظر سے دیکھا اور پھر ان کے مضامین میں طنز کے بھر پور وار اور مزاح کی پھوار نے ایک خوشگوار فضا کا احساس دلایا۔ ان کے اندر کا مزاح نگار ’’الف سے قطب مینار‘‘ اور ’’ناٹ آوٹ‘‘ کی اشاعت کے بعد کھل کر سامنے آ گیا۔
مضمون مونچھیں میں لکھتے ہیں۔
’’شہید بھگت سنگھ اور چندر شیکھر آزاد کو ان مونچھوں سے دلی لگاؤ تھا۔ اسی لئے اپنی مشہور زمانہ تصویروں میں وہ مونچھوں پر تاؤ دیتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ رعیت ہونے کے ناطے ان کا مونچھوں پر بار بار تاؤ دے کر حکومت کے خلاف باتیں کرنا انگریزوں کو بہت کھٹکتا تھا۔‘‘ (مونچھیں۔ بلا عنوان)

شکیل اعجاز

شکیل اعجاز بنیادی طور پر مصوّر ہیں ان کی مزاح نگاری بھی مصوری کا اعجاز ہے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا پہلا مجموعہ ’’در اصل‘‘ شائع ہوا تو مزاح نگاری کے بھر پور امکانات سے لبریز تحریروں نے سبھی کو چونکا دیا۔ نثر کا عمدہ نمونہ اور کرداروں کے مزاحیہ خد و خال کو فنکارانہ انداز میں جزو تحریر بنانے کا ہنر، زبردست قوتِ مشاہدہ اور مزاح نگاری کی جس روش کا انتخاب انھوں نے کیا، ذرا الگ تھا، یہ انداز تھا نامور مزاح نگار مشتاق یوسفی کا جس کے قائل تو سب ہیں مگر اس کے اسلوبِ نگارش کا اتّباع ہر ایک کے بس کی بات نہیں۔ شکیل اعجاز نے اس مشکل زمین میں اپنی راہ نکالی اور اپنی انفرادیت کا لوہا منوا لیا۔ ان کی دوسری کتاب ’’چھٹی حس‘‘ میں یہ انداز اور نکھر کر سامنے آیا۔ اس میں خاکے، رپورتاژ، کہانیاں ہیں۔ حس مزاح کا بھر پور استعمال ان کی تحریروں کو دلچسپ اور قابلِ مطالعہ بناتا ہے:

’’ہر شخص اپنی سوجھ بوجھ کے مطابق کسی چیز کا استعمال کرتا ہے اس لئے ایک ہی چیز کے کئی استعمالات ہوتے ہیں۔ کتاب کو لے لیجئے۔ بظاہر یہ علم حاصل کرنے کا وسیلہ ہے ہزاروں میں تین چار ایسے بھی نکل آئیں گے جو واقعی اس سے علم حاصل کرتے ہوں گے لیکن عموماً یہ کثیر الاستعمال پائی جاتی ہے۔ امّی اسے ادھر ادھر پھینک کر غصّے کا اظہار کرتی ہیں بچّے ورق ورق الگ کر کے شرارتوں کی ابتدا کرتے ہیں۔ دکاندار اس میں شکر دال نمک وغیرہ باندھ کر پیسہ کماتے ہیں۔ اور تو اور بلّی اپنے بچّوں کو شکار کرنے اور جھپٹنے کی تربیت دینے کے لئے بھی اس کو تختہ مشق بناتی ہے۔ (۔ ر ریڈیو، شکیل اعجاز، مطبوعہ دو ماہی الفاظ، دسمبر ۱۹۸۴ء)

محمّد اسد اللہ

محمّد اسد اللہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں۔ مزاحیہ مضامین اور ریڈیو ٹاکس کے مجموعے ’’پر پرزے‘‘ (۱۹۹۲)، ’ہوائیاں‘ (۱۹۹۸) اور ’’ڈبل رول‘‘ (۲۰۱۵) کے علاوہ مراٹھی مزاحیہ ادب کے تراجم پر مبنی کتابیں ’’جمالِ ہم نشیں‘‘ اور ’’دانت ہمارے ہونٹ تمہارے‘‘ بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ’’بوڑھے کے رول میں‘‘ ان کے انشائیوں کا مجموعہ ہے۔ مزاحیہ مضمون ’’پنگھٹ‘‘ کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

’’اس دور میں چور کو سزا تک پہنچنے کے لئے پکڑے جانے سے پہلے چوری کا ثابت ہونا اور چوری ثابت ہونے کے بعد پکڑا جانا ضروری ہے۔ ان مراحل کے بغیر قانون کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہیں دیکھتا۔ ہمارا قانون دن بہ دن شریف ہوتا جا رہا ہے صرف شریفوں سے واسطہ رکھتا ہے جرائم پیشہ عناصر اس کے لئے نا محرم کا درجہ اختیار کرتے جا رہے ہیں۔‘‘ (پنگھٹ۔ پر پرزے)

رفیق شاکر

مرزا رفیق شاکر کا تعلق کھام گاؤں سے تھا۔ ان کے شعری مجموعے بھی شائع ہو چکے ہیں۔ مزاحیہ مضامین کے دو مجموعے ’’سیکنڈ ہینڈ‘‘ اور ’’بنئے کا دھنیا‘‘ (۱۹۹۴) بحیثیت مزاح نگار ان کے ادبی شناخت نامے ہیں۔ ظریفانہ رنگ میں ان کا کلام ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوتا رہتا ہے۔ ان کے مضامین علمی و ادبی ذوق اور حس مزاح کے سبب عمدہ تخلیقی نثر کی مثالیں ہیں۔ افراد اور اشیاء سے ان کا رابطہ استوار ہوتے ہی فضا میں قہقہے بکھرنے لگتے ہیں:

’’دوسرے ہی ہفتے شبّیر خاں صاحب ہمارا فوٹو لئے ہمارے گھر پہنچ گئے۔ ہم نے کہا کیوں بھائی! اسے تو آپ نے بچّوں کو ڈرانے کے لئے کھنچوایا تھا۔ ظالم نے جواب دیا، ہاں بات تو یہی تھی، لیکن اسے دیکھ کر بڑے بڑے بھی ڈر رہے ہیں۔ کچھ خواتین تو نیند میں سے چیختی چلاتی ہوئی گھبرا کر اٹھ جاتی ہیں۔ اور جدھر راستہ ملے ادھر بھاگنے لگتی ہیں۔ ہم انھیں پکڑنے لئے کب تک پولس کی مدد لیتے رہیں پرسوں ہماری خالہ جان پر یہی کیفیت طاری ہوئی۔ ڈاکٹر سے علاج کروایا پھر عامل صاحب کو بتایا کچھ فائدہ نہ ہوا آخر ننھے پیر صاحب نے کہا۔ گھر میں کسی آسیب کی تصویر ہے اسے ہٹا دو اسی لئے ہم یہ تصویر واپس کرنے آئے ہیں‘‘ ۔ (مجھ زود پشیماں کا پشیماں ہونا، رفیق شاکر، مطبوعہ بنئے کا دھنیا، اکولہ، جون ۱۹۹۴ء ، ص ۲۱)

غلام صوفی حیدری

غلام صوفی حیدری کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ بکواس (۱۹۸۳) منظرِ عام پر آیا جس میں زبان کا چٹخارہ اور روز مرہ زندگی کے واقعات کو مصنّف نے دلچسپ انداز میں بیان کیا ہے۔ اس کتاب کے مضامین کی زبان اور مزاحیہ طرزِ تحریر کو کتاب میں شامل پیش لفظ میں عصمت چغتائی نے سراہا ہے۔ نمونہ تحریر:
''اکثر دیکھا گیا ہے اور پرکھا بھی گیا ہے کہ شریر بچّے ذہین ہوتے ہیں۔ خاکسار عالی وقار پر یہ مثال سو فیصد صادق آتی تھی۔ ہمیں سال کے سال پاس ہونے کے سوا دوسرا کام ہی نہ تھا۔ ہمارے ٹیچر کو ہر سال یہ حسرت رہ جاتی کہ کاش یہ لڑکا ہماری کلاس میں دو سال ہی رہتا کہ اس کی چھاؤں دوسرے بچّوں پر پڑتی۔'' (بکواس، اکولہ ۱۹۸۳ ، ص ۵۹)

ڈاکٹر جاہل ناگپوری

ڈاکٹر جاہل ناگپوری نے چند ادبی کالم تحریر کئے تھے جو اردو اخبارات میں اور بعد میں ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوئے۔ ان کا مخصوص اسلوب ہے جو بڑی بے باکی کے ساتھ دو ٹوک انداز میں افراد کی بے اعتدالیوں اور سماج کی کمزوریوں کو طشت از بام کرتا ہے۔ وہ ایک کامیاب طنز نگار کے روپ میں سامنے آئے ہیں۔ ان کا مضمون ''تو یہ ہیں ہمارے چچا'' ایک ایسے شاعر کا خاکہ ہے جس کے لئے ادب جلبِ منفعت کا ذریعہ ہے۔
''بچپن میں ہم نے ایک فلم دیکھی تھی جس کا ہیرو ایک شطرنجی بردار تھا۔ وہ شطرنجی اسے کیا زمین کیا آسمان اور کیا خلا ہر جگہ کی سیر کراتی تھی، ہمارے چچا یہی کام شاعری سے لیتے ہیں۔ ان کی شاعری بھی کسی طلسمی شطرنجی سے کم نہیں جس پر بیٹھ کر وہ جہاں جی چاہے ہو آتے ہیں۔ ریڈیو، ٹی وی، مشاعرہ، سیمینار، یونیورسٹی، کنوینشن، اجلاس، سیمپوزیم، انجمن، اکاڈیمی، غرض کوئی گوشہ ہو ان کی شطرنجی، (معاف کیجئے شاعری) انھیں چاروں کھونٹ گھماتی ہے۔'' (ماہنامہ شگوفہ، ستمبر ۱۹۸۷)

بابو آر کے

بابو آر کے مزاح نگاروں کی اس مجلس میں ذرا دیر میں آئے اور پہلی صف کا ثواب لوٹنے لگے۔ ان کی دو کتابیں: ''خطا معاف'' (۱۹۹۱) اور ہو بہو (۱۹۹۱) زبردست حسِ مزاح، زبان و بیان کی لذّت اور عصری زندگی کی تصویر کشی کے لئے یاد رکھی جائیں گی۔ برار اور خاص طور پر اچلپور کے اطراف کا ماحول، رسم و رواج اور کلچر اپنی مقامی آوازوں سمیت اس براری بابو کی تحریروں میں منعکس ہوا ہے۔ دوسروں کی بہ نسبت ان کی جڑیں اپنی زمیں میں زیادہ گہری ہیں۔ ان کی یہ علاقائیت جہاں ان کی طاقت ہے وہیں کمزوری بھی ہے کہ اس کے سبب ان تحریروں کی آفاقیت ختم ہو جاتی ہے۔
''سب نے ایک زبان ہو کر تحکمانہ لہجے میں کہا بیٹھ جاؤ۔ ہم سعادت مندی سے بیٹھ گئے۔ اس وقت ہمیں محسوس ہوا جیسے ہم ہٹلر، چنگیز، ہلاکو اور تیمور جیسے تاریخ کے تمام ظالموں کے نرغے میں آ پھنسے ہیں۔ اسی بیچ انٹرویو لینے والے پینل میں سے ایک صاحب نے اپنی پوٹلی نما پگڑی کا پٹارا میز پر رکھا۔ ان کی دیکھا دیکھی دوسرے صاحب نے اپنے ہاتھ کا موٹا سا چم چم کرتا ڈنڈا میز پر لٹا دیا تیسرے صاحب تمباکو کی ڈبّی جیب سے نکال کر ہتھیلی پر چونا تمباکو اور اپنی ہتھیلی کا میل، تینوں چیزیں رگڑ نے لگے۔ اس طرح سوائے ایک صاحب کے باقی سب اپنے اپنے کر تب دکھانے میں مشغول ہو گے۔
تھوڑے وقفے کے بعد موضوع سے میل کھاتا ایک اور سوال اچھالا گیا۔ بولے بندر ہمیشہ کیوں کھجاتے ہیں۔ اور پھر یہ صاحب بندر کی طرح کھجا کر اپنے سوال کی وضاحت بھی کرنے لگے۔ ہم اس سوال پر سٹپٹا گئے پھر بھی ہم نے کہا: دیکھئے بندروں کے پاس کھانے اور کھجانے کو ہوتا ہے اس لئے وہ کھجاتے ہیں۔''
(ہمارا پہلا انٹرویو، با بو آر کے، ہو بہو، ص: ۲۴)

حیدر بیا بانی

ادبِ اطفال کا ایک اہم نام حیدر بیا بانی ہے۔ اچلپور ان کا وطن، اپنی دلچسپ نظموں اور خاص طور پر بچّوں کے لئے لکھی گئی تخلیقات کے لئے مشہور ہیں۔ نثر میں ان کی کتاب(۱۹۹۰) چشم دید اس حقیقت کی ضامن ہے کہ وہ نثر اور نظم ہر دو اصناف میں ظرافت کو عمدگی سے برتنے پر قادر ہیں۔ ان کی زبان رواں دواں اور اندازِ تحریر دلچسپ ہے۔ مذکورہ کتاب میں چند مضامین کے عنوانات درج ذیل ہیں: باکمال شوہر، بد زبان بیویاں، نمک کی چمک، ٹر کی اہمیت، ہم صاحبِ کتاب ہوئے۔ نمونہ

تحریر درج ذیل ہے:
’’زمانے کے ساتھ بیوی کے رہنے سہنے، پہننے اوڑھنے حتیٰ کہ سوچنے سمجھنے کے انداز میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ پچھے دنوں اگر شوہر پردیس گیا ہوتا تو بیچا ری بیوی برہن بنی ہوئی دن رین برہ کی آگ میں جلتی رہتی تھی لیکن آج کی بیوی ایسی کچھ نہیں ہے شوہر دورے پر گئے ہیں بیوی سوچتی ہے، ادھر بنارسی ساریاں سستی اور اچھّی ملتی ہیں دیکھیں انھیں لانا یاد رہتا بھی ہے یا نہیں یا پھر پہلی تاریخ ہے، تنخواہ کا دن بیوی راہ میں آنکھیں بچھائے راہ نہارتے نہارتے گھبرا اٹھتی ہے۔ ہائے اللہ شام ہو گئی نہ جانے کب آئیں گے؟ کب بازار جائیں گے، کب سودا سلف آئے گا، کہیں پیسہ ادھر ادھر نہ کر دیں مہینہ بھر تنگی رہے گی۔
موجودہ دور ملاوٹ کا دور ہے بیوی بھی خالص نہیں ملتی۔ اب نہ شام کی جوگنین ہیں نہ پر دیسی کی برہنیں، نہ ہجرت کا لطف ہے نہ وصل کی لذّتیں، زمانے کے الٹ پھیر نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔‘‘ (داستانِ بیوی، چشم دید، حیدر بیابانی، امراؤتی، ۱۹۹۰ء ، ص: ۳۴)

انصاری اصغر جمیل

انصاری اصغر جمیل ناگپور کے ایک اہم مزاح نگار ہیں ’ مزاح نامہ‘ نامی ایک رسالہ جاری کیا تھا۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ لگی منظرِ عام پر آ چکا ہے۔ سماجی زندگی میں پھیلی ہوئی بدعنوانیاں، سیاسی شعبدے بازیاں، انجمنوں میں چلنے والی کاروائیاں ان کے طنز کا ہدف رہے ہیں۔ روایتی مزاح نگاروں کی طرح بیوی ان کا پسندیدہ موضوع ہے نگاہ موضوع پر ہو تب بھی ان کا نشانہ کہیں اور ہوتا ہے یہ نیک فال ہے بشرطیکہ وہ بیوی یعنی اس موضوع کو کبھی کبھی تنہا بھی چھوڑ دیں انھوں نے ناگپور کے چند ادیبوں اور شاعروں کو کامیابی کے ساتھ اپنے خاکوں کے شیشے میں اتارا ہے:
’’آہا کتنا پیارا لفظ ہے خادمِ قوم، خادمِ قوم یعنی قوم کے خادم قوم کی خدمت کرنے والے کو خادمِ قوم کہا جاتا ہے۔ یوں تو قوم کی خدمت کئی طریقوں سے کی جا سکتی ہے۔ جیسے کہ تن من اور دھن سے لیکن عقل اگر کام کر جائے تو اس سے بھی قوم کی خدمت کی جا سکتی ہے جس میں نہ ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی چوکھا آئے۔‘‘ (ہم ہیں خادمِ قوم، انصاری اصغر جمیل، مطبوعہ شگوفہ حیدرآباد، فروری ۱۹۸۳ء)

محمد طارق کھولاپوری

محمد طارق بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ سعادت حسن منٹو ان کا پسندیدہ افسانہ نگار ہے۔ اس کا اثر ان کی تحریروں پر بھی نظر آتا ہے۔ وہ معاشرے کے ان اندھیرے گوشوں پر اپنی نگارشات کی بنیاد رکھتے ہیں جو منٹو کا موضوع رہے ہیں۔ وہ لوگوں کی ریا کاری اور دہرے معیار کو طنز کا نشانہ بناتے ہیں۔ یہی خوبی ان کے ان طنزیہ و مزاحیہ مضامین میں بھی موجود ہے جو ’’چوزے کی حمایت میں‘‘ شامل ہیں۔

خورشید نادر کامٹوی

خورشید نادر کامٹوی کے مزاحیہ مضامین شگوفہ میں شائع ہو چکے ہیں ان کی فارسی آمیز زبان اور مزاح کا اعلیٰ معیار، خوش ذوق قارئین کو متاثر کرتا ہے۔ نادر کامٹوی کے کئی مضامین طنز و مزاح اور صنف انشائیہ کے متعلق شائع ہوئے ہیں جن میں مختلف اصنافِ میں ظریفانہ ادب کا تنقیدی جائزہ لیا گیا ہے۔ ان کے مضمون والدین کا ایک اقتباس:
بعض والدین عجیب الوضع ہوتے ہیں۔ بعض غریب القطع، بعض شاخِ بے ثمر کی طرح ہوتے، بعض کثیر ایصال اور قلیل الغذا۔ کچھ قِران السعدین کے نمونے ہوتے ہیں، کچھ اجتماع ضدّین کے، بعض میں موزونیت پائی جاتی ہے بعض میں شتر گربگی۔ بسا اوقات ماں ٹینی ہوتی ہے باپ کلنگ اور بچے رنگ رنگ۔ بعض عجیب الخلقت مجموعوں کو دیکھ کر ایمان لانا پڑتا ہے کہ ان کی جلد سازی میں یقیناً دستِ قدرت کا دخل ہے۔ لیکن قدرت ایسے ماڈل تفریح طبع کے لیے نہیں، دیدۂ عبرت نگاہ کے معائنہ کے لیے فراہم کرتی ہے، بقیہ معاملات میں خود حضرتِ انسان کی کاوش و انتخاب کا دخل ہوتا ہے۔ بعض مضحکہ خیز جوڑے شرارت یا دانستہ چشم پوشی کے باعث بھی وجود میں آتے ہیں۔

شکیل شاہجہاں

شکیل شاہجہاں کا تعلق کامٹی سے ہے۔ ان کے یک بابی ڈراموں کا مجموعہ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کافی مقبول ہوا۔ انھوں نے اپنے کئی مزاحیہ ڈرامے اسٹیج کیے اور انعامات سے بھی نوازے گئے۔ ان کی جو تحریریں ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوا کرتی تھیں ان میں مزاح قدرے زیادہ تھا۔

"جب بیوی بہت زیادہ پیار جتائے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی جیب کی خیر نہیں، یعنی کوئی فرمائش ہونے والی ہے۔ ایک دن ہماری بیگم بہت خوش نظر آئیں۔ ہم سمجھ گئے کہ کوئی "مانگ" ہے۔ کیونکہ مانگ بھرنے کے بعد مانگوں کو پوری کرنے کی زحمت شوہر کو تا عمر اٹھانی پڑتی ہے۔"

اظہر حیات

ناگپور کے مزاح نگاروں میں اظہر حیات اپنے چند مضامین کے ذریعے متعارف ہوئے۔ مختلف اخباروں میں شائع ہونے والے ان کے کالموں میں بھی طنز کی نشتریت محسوس کی جا سکتی ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ "بس کچھ نہ پوچھئے" زیرِ ترتیب ہے اپنے مضمون "بس کچھ نہ پوچھئے" میں انھوں نے تنخواہ دار ملازمین کی زندگی میں گزر بسر کے مسائل کو دلچسپ انداز سے پیش کیا ہے۔

"مہینے کے آخری دنوں میں آپ اسکوٹر گھر میں رکھ کر صحت بنانے کے لیے پیدل چل سکتے ہیں اس طرح سے آپ گلی کوچوں کی راہ سے گھر بھی پہنچ سکتے ہیں جس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دکاندار کی نظر سے بچ جاتے ہیں۔ یہ سب اور بہت کچھ آپ کوکر سکتے ہیں لیکن مہمان سے بچنا ذرا مشکل ہی ہے۔ مگر بڑے تجربہ کاروں نے اس کے بھی راستے نکال لیے ہیں۔ آسان ترکیب بتائی ہے کہ آپ خود کسی کے گھر مہمان بن کر چلے جائیں اور گھر پر ذرا بڑا سا تالا ڈال جائیں۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ آپ نے دیر کی اور کوئی مہمان آپ کے گھر آ دھمکا۔"

سمیع بن سعد

سمیع بن سعد کے کئی مضامین ماہنامہ شگوفہ، حیدر آباد اور روزنامہ اردو ٹائمز، ممبئی میں شائع ہو چکے ہیں۔ پروفیسر سمیع اللہ نے جن کا تعلق امراوتی سے ہے، مزاح نگاری کے لئے اس نام کا انتخاب کیا اور چند دلچسپ مضامین تحریر کر کے خاموشی اختیار کر لی۔ انداز شگفتہ اور تاریخی واقعات کو استعمال کر کے نئے مفاہیم پیدا کرنے کا سلیقہ ان کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ ان کا ایک دلچسپ مضمون تزکِ چغدی ہے:

"لا پر اعتراض ہوا کائنات کی تخلیق ہوئی، زمیں کی ویرانی پر اعتراض ہوا باوا آدم کی تخلیق ہوئی، فرشتوں کو آدم کو سجدے کا حکم دیا گیا جو اس لفظ سے واقف نہیں تھے بے چوں و چرا جھک گئے لیکن حضرتِ ابلیس جو واقف تھے، سجدے پر اعتراض کیا کہ یہ خاک کا میں آگ کا، بھلا میری اس کی برابری، سجدہ نہیں کیا۔ اسی اعتراض کی وجہ سے حضرت ابلیس اور آدم کی اولاد میں وہ دشمنی ہوئی جو جہنّم کی آبادی کا باعث بنی خدا نے حضرتِ آدم کو شجرِ ممنوعہ کے قریب جانے سے منع کیا، بھلا ابلیس جو اس لفظ سے واقف تھا کہاں چوکتا اسے آدم کے خدا کا حکم ماننے پر اعتراض ہوا اور اس نے یہ لفظ بی بی حوّا کے کان میں پھونک دیا۔ ان دونوں نے اعتراض کو اپنا حق مانتے ہوئے ثمرِ ممنوعہ نہ کھانے پر اعتراض کیا۔ اور اسے کھایا پھر ان کا سفر کرہ ارض کی آبادی کا سبب بنا۔ اب آپ ہی بتائیے، دنیا کی آبادی کا باعث کون؟ اعتراض اب آپ کو کوئی اعتراض ہے؟"(اعتراض، سمیع بن سعد، مطبوعہ ماہنامہ شگوفہ، حیدر آباد، فروری، ص۸۳)

ایس ایس علی

ایس ایس علی نے ابتدا میں انگریزی کالم لکھے اور ان کے اردو مضامین میں طنز کی تلخی نمایاں ہوئی۔ اپنے آس پاس پھیلی بد عنوانیوں اور شخصیات کی ناہمواریوں کو انھوں نے بیان کیا ہے۔ ایس ایس علی نے ظریفانہ انداز میں چند خاکے بھی قلمبند کئے ہیں۔ معروف مزاح نگار اور آرٹسٹ شکیل اعجاز کے خاکے میں لکھتے ہیں:

"ٹائم ٹیبل کی جو نقل ان کو دی جاتی ہے رکھ کر بھول جاتے ہیں۔ پھر سال بھر اندازے سے پیریڈ لیتے ہیں۔ ان کو یہ معلوم تو نہیں رہتا کہ میرا آف پیریڈ کون سا ہے اور بتائے بھی کون؟ اس لئے ایک پیریڈ لینے کے بعد ساری کلاسوں میں جھانکتے ہیں جہاں کلاس خالی نظر آئی وہاں اپنا پیریڈ سمجھ کر پڑھانے لگتے ہیں۔ اس کلاس کا ٹیچر جب دور سے دیکھ لیتا ہے کہ شکیل

صاحب میری کلاس میں چلے گئے تو وہ مسرور ہو کر کینٹین یا ٹیچرس روم کی آرام کر سی کا رخ کرتا ہے۔'' (بابو بھولے بھولے، ایس ایس علی، مطبوعہ ماہنامہ شگوفہ، جولائی۱۹۹۴ء ، ص۴۳)

سعید احمد خاں

سعید احمد خاں کا تعلق اکولہ سے ہے۔ بید براری کے نام سے ماہنامہ شگوفہ میں مزاحیہ مضامین لکھتے رہے۔ انھوں نے چند جا سوسی ناول بھی شائع کر وائے جو پسند کئے گئے۔ ان کے مضمون موکھے میں سے کا ایک اقتباس:
اس سال بھی رمضان شریف کچھ یوں ہی بے کیف گزر رہے تھے کہ ہمارا ایک بچپن کا دوست آ گیا۔ جس کے ساتھ ہم تھیٹر میں افطار کیا کرتے تھے۔ کہنے لگا منوج کمار کی کلرک لگی ہے، سکنڈ شو چلیں گے۔ ہم نے اطمینان کا سانس لیا کہ اس بھری دنیا میں کوئی تو ہمارا ہوا۔ میں نے کہا: سکنڈ شو ہی کیوں، میٹنی شو کیوں نہیں؟
کچھ نمازیں قضا ہو جاتی ہیں یار۔ اس نے شرما کر بتایا۔
(موکھے میں سے، سعید خاں، مطبوعہ ماہنامہ شگوفہ، جو لائی ۱۹۹۴ء)

رحمت اللہ مالوی

رحمت اللہ مالوی بھی مزاح نگاروں کے اس قافلے میں شامل رہے ان کی کئی شگفتہ تحریریں منظرِ عام پر آئیں۔ ان کے ہاں حسِ مزاح زبردست تھی جو ان کے مضامین کی انفرادی خوبی ہے۔ ان کے مضامین کا مجموعہ کتاب نا شناسی شائع ہو چکا ہے۔ مدت ہوئی ظرافت نگاری کا سلسلہ بند ہے۔ ان کے ایک مضمون کا اقتباس ملاحظہ فرمائیں:
ریلوں اور بسوں کے قاعدے ہی کچھ ایسے ہیں کہ کبھی تو مسافر بے بس ہو جاتے ہیں اور کبھی محکمہ کی بے بسی عمر کے ہاتھوں قابلِ دید ہوتی ہے۔ بارہ برس سے پندرہ برس والی عمر کے بچّے اچانک چھوٹے ہو کر آٹھ یا دس کی حدود میں آ کر آدھی ٹکٹ کے مزے لوٹتے ہیں۔ اور پانچ یا چھے برس کی عمر اچھل کر ماں باپ کی گود میں براجمان ہو جاتی ہے۔ یہ کھیل اس وقت شروع ہوتا ہے جب رِنگ ماسٹر T.C. رِنگ میں آتا ہے۔
(عمر تماشا یا تماشائی، رحمت اللہ مالوی، ماہنامہ شگوفہ، جو لائی، ص۹۳)

مزاح نگاروں کے اس کارواں میں یقیناً ایسے لوگ بھی تھے جن کی تحریروں کو پڑھ کر بے ساختہ ایک واہ زبان پر آ جاتی تھی، افسوس اب ان میں سے اکثر کا ذکر آتا ہے اور اس خبر کے ساتھ کہ وہ تھک کر بیٹھ گئے، مزاح نگاری تو کب کی طاقِ نسیاں ہو چکی، تو ہم ایک آہ کھینچ کر رہ جاتے ہیں۔

ودربھ کے لکھنے والوں کے اس ہر اول دستہ کے بعد نئے لکھنے والے بھر پور صلاحیتوں اور قہقہہ بار قلم کے ساتھ سامنے آئے ان میں سے چند نام درج ذیل ہیں۔

محمد یحییٰ جمیل
ودربھ کے نئے ابھرنے والے مزاح نگاروں میں۔ یحییٰ جمیل نے بہت کم مدت میں اپنی فطری صلاحیتوں کو ظریفانہ تحریروں کے ذریعے منظر عام پر لا کر اپنی پہچان بنائی ہے وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ یحییٰ جمیل کی بیشتر ظریفانہ تحریریں خاکوں پر مشتمل ہیں جن میں ان کے آس پاس موجود کوئی شخص طنز کے نشانے پر نظر آتا ہے۔
''پھر ہر دوچار روز بعد ایک سر جھاڑ منہ پھاڑ غزل بنا کر لے آتے کہ ایک نظر دیکھ لیجیے۔ حکومت اگر بے وزن شاعری پر چالان شروع کر دے تو کروڑوں روپئے سرکاری خزانہ میں جمع ہو سکتے ہیں اور ہم اس کارِ نیک کے لیے مخبری جیسا پوچ کام کرنے کو بھی تیار ہیں۔ خیر، غازہ مسی سے کیا کام بنتا، سرجری کرنی پڑتی اور ہم جونہی غزل کی پلاسٹک سرجری سے فارغ ہوتے، وہ فوراً اسے دوسرے کاغذ پر نقل کرتے اور تصحیح شدہ پرچہ پرزہ پرزہ کر کے پھینک دیتے۔ (فنا فی الشعر۔۔ محمد یحییٰ جمیل)

محمد توحید الحق
محمد توحید الحق نے نظم اور نثر دونوں میں ظرافت کو بخوبی برتا ہے۔ سماجی برائیوں اور انسانوں کی فطری کمزوریوں پر

گہری نظر رکھتے ہیں اور انہیں مبالغے کے ساتھ بیان کرتے ہیں۔ گٹکے اور کھرّے پر سر کار کی جانب سے پابندی عائد کرنے کے بعد ایک اسکول ٹیچر پر کیا گزری ان کی زبانی ملاحظہ فرمائیں۔
’’پچھلے دنوں اسکول میں اچانک کسی ٹیچر کے غش کھا کر گرنے کی خبر آئی، ساتھی اساتذہ بہت پریشان ہوئے۔ کسی نے پیاز سنگھانے کی تجویز پیش کی تو کسی نے چپل۔ کسی نے زور زور سے پانی کے چھینٹے مارنے شروع کر دیے۔ ایک صاحب تو بار بار دل کی دھڑکن ہی دیکھ رہے تھے کہ اچانک کسی ٹیچر کی جیب سے کھرّے کی پڑیا گر پڑی۔ اس کی موجودگی سے ہی غش کھائے ٹیچر کو تھوڑا ہوش آ گیا۔ فوراً فرسٹ ایڈ کے طور پر انہیں کھرّا پیش کیا گیا۔ اور وہ ذرا دیر میں نارمل ہو گئے۔ انھوں نے بتایا کہ در اصل کھرّا کھائے کافی دیر ہو گئی تھی اس لیے انہیں چکر آ گیا۔‘‘ (ہائے کمبخت تو نے پی ہی نہیں)

حسنین عاقب
حسنین عاقب نے شاعری اور تنقید کے علاوہ میدانِ ظرافت میں بھی اپنے پر بہار قلم سے سے گل کاریاں کی ہیں۔ ان کی تحریر یں ان گوشوں کو دلچسپ انداز میں نمایاں کرتی ہیں جن میں انسانی نفسیات کے انوکھے پہلو ان کے مشاہدے میں آئے ہیں۔ اپنے مزاحیہ مضمون مکان کی چھت میں چھت کو گھر کی حفاظت کا ایک اہم حصہ سمجھنے کے ساتھ ہی وہ اس سے متعلق پوشیدہ حقائق کو بھی بے نقاب کرتے ہیں۔
’’عشق کی ابتداء ہی چھتوں سے ہوتی تھی۔ معشوق چھت پر کپڑے سُکھانے آئی ہے۔ پڑوس کی چھت پر کھڑا مُنڈا اُسے تاک رہا ہے۔ اُس زمانے میں اتنی شرافت تو تھی کہ چوری چھُپے تاکا جاتا تھا۔ لیکن معشوقہ بھی کم ہوشیار نہ ہوتی تھی۔ وہ بھی سمجھ جاتی تھی کہ کوئی چالاک سیار ہے جو اس کی تاک میں ہے۔ لہٰذا وہ بھی معاملے کے ابتدائی مرحلے میں ناراضی کا اظہار کرتی تھی اور چھت سے پاؤں پٹکتے ہوئے سیڑھیاں اُتر جاتی تھی۔ اُتر نہیں جاتی تھی بلکہ صرف ڈھونگ کرتی تھی اور وہیں چھُپ کر یہ دیکھنے کے لئے رُک جاتی تھی کہ مُنڈا اُچک اُچک کر اِدھر ہی دیکھ رہا ہے یا اس کی طرح وہ بھی نیچے اُتر گیا۔ بس یہی سلسلہ چلتا رہتا تھا۔ پھر رضامندی کی منزل آتی تھی۔ آگے چل کر عشق پختہ ہو جاتا اور بات چٹھی چپاٹی تک پہنچ جاتی۔‘‘ (مکان کی چھت)

ظریفانہ شاعری

.ودربھ کے قدیم شعرا کے کلام میں بھی طنز و مزاح کے نمونے پائے جاتے ہیں۔ ان میں وہ ہجویات اور شہر آشوب بھی شامل ہیں جن پر سودا اور نظیر کا رنگ نمایاں ہے۔ قدیم شاعر نواب محمد نامدار خاں پنّی(پیدائش ۱۷۹۰ء)جو اپنے والد کے انتقال کے بعد ۱۸۲۵ء کو برار کے گورنر مقرر ہوئے تھے۔ جنرل آرتھر ولیزلی نے انھیں ’ جنرل ڈیوک ‘کے خطاب سے نوازا تھا، وہ جرنیل کو بطور تخلص استعمال کرتے تھے ان کا تعلق اچلپور سے تھا ان کے متعلق ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن لکھتے ہیں۔ جن خوبیوں کی وجہ سے نظیر اکبر آبادی کو ہندوستانی عوامی شاعر کہا جاتا ہے کم و بیش وہی خوبیاں ان کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ جرنیل کی ہجویات کا باب کافی طویل ہے جس میں انھوں نے ایسے نازیبا الفاظ کا استعمال بھی کیا ہے جن کا احاطۂ تحریر میں لانا مناسب نہیں ہے۔ ان کے چند اشعار درج ذیل ہیں۔

نواب محمد نامدار خاں پنّی
رکھتا ہوں ایک جان جو حاضر ہے آپ پاس
منظور ہو تو لیجئے تکرار مت کرو
یہ نہ معلوم تھا آخر کہ تو اس طور ستی
الفتیں غیر سے اور ہم سے کرے گا پرواز

ہجویات کے اشعار
جب مچھو میاں گھر سے کھا پان نکلتے ہیں
اور جورو کے ہاتھ سے حیران نکلتے ہیں
مونچھوں کے تئیں اپنے یوں تان نکلتے ہیں
گویا کہ دلوں کے سب ارمان نکلتے ہیں
شیخ حجرے میں آتا ہے نظر جر نیلؔ مجھے

گھونسلے میں جس طرح بیٹھے دبک الو سفید 4
شیخ محمد احسن سرکار نواب صلابت خاں میں ملازم تھے تاریخِ امجدی میں ان کی دو غزلیں اور شہر آشوب شامل کئے گئے ہیں۔ شہر آشوب کے چند اشعار:

شیخ محمد احسن

کر سان اس عصر میں ہوئے ہیں گے سب غنی
اس دہر میں جو دیکھو دہریوں کی ہے بنی
ملتا نہ تھا جنوں کے تئیں نان بیسنی
کیا اس کے تئین کہیں جو کوئی ہوئے ہر فنی
بریانی کھاتے ہیں وہ بہت ناک کو چڑھا
جو لوگ تھے خفی تو ہوئے ہیں گے اب جلی
مچھر نما جو تھے سو ہوئے ہیں گے اب بلی
دہقانی فارسی کو جو پڑھتے ہیں ہر گلی
کیا کام ہر خلاف زمانے کا ہے پڑا
نو سو چوہوں کو کھا کے بلی حج کو ہے چلی5

حافظ محمد ولایت اللہ

حافظ محمد ولایت اللہ (۴، ستمبر ۱۸۷۳۔ ۱۲، نومبر ۱۹۴۹)، ہندوستان کے سابق نائب صدر اور سپریم کورٹ کے چیف جسٹس محمد ہدایت اللہ کے والد تھے۔ ان کے دو شعری مجموعے، سوز و گداز(۱۹۴۱) اور تعمیر حیات (۱۹۴۹) شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے کلام کا غالب رنگ طنز و مزاح ہی تھا۔ اس علاقے میں وہ 'اکبرِ ثانی' کے نام سے مشہور تھے۔ (بحوالہ ناگپور میں اردو ڈاکٹر شرف الدین ساحلؔ ۔ ۱۹۹۳ص ۷۳)
ان کے چند اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

چلتے ہیں سارے کام چندوں سے
صرف ان کا حساب ہے غائب
رہ گئیں دیکھنے کی بس آنکھیں
نظرِ انتخاب ہے غائب
ہے سہارا خضاب کا ان کو
گر چہ عمرِ شباب ہے غائب
لیڈروں کی زبان پر ہے درد
قلب سے اضطراب ہے غائب
ان کی اسکیم ایک خیمہ ہے
جس کی ہر اک طناب ہے غائب

ودربھ میں مزاح نگاری کا باقاعدہ آغاز نئی نسل کے با صلاحیت فنکاروں کی آمد کے بعد ہی ہوا جن میں سے چند اردو ادب میں پہلے ہی اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ ان اولین مزاح نگاروں میں سے بیشتر کا تعلق علاقہ برار سے رہا ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ لسانی، تہذیبی اور جغرافیائی اعتبار سے برار حیدر آباد سے قریب رہا ہے۔ آج بھی برار میں بولی جا نے والی زبان اور سماجی زندگی پر حیدر آباد کے لسانی اثرات نظر آتے ہیں حیدر آباد کے مزاح نگاروں نے دکنی کو تخلیقی بنیادیں فراہم کیں ان کی یہ کوششیں آل انڈیا مشاعروں میں خراجِ تحسین حاصل کر چکی ہیں اسی طرح ودربھ کے فنکاروں نے بھی مقامی اور براری زبان میں گل کھلانے کی کوشش کی، دکنی زبان کی شوخی کو کاغذی پیرہن بھی نصیب ہوا لیکن براری مزاحیہ شاعری مشاعروں کی واہ واہ کے دائرے سے باہر نہ آ سکی۔
سر فراز کاتب مرحوم نے اپنا مجموعہ گاورانی کلام مرتب کر لیا تھا لیکن وہ نقشِ فریادی تا ہنوز زیورِ طبع سے آراستہ نہیں ہو پایا۔ ان کا کلام بظاہر ایک ایسی بولی میں ہے جو اپنی ضعیف العمری کے سبب اشاعت کی سر زمیں پر اپنے قدموں کی

لڑکھڑاہٹ کے ساتھ چلنے سے بھی قاصر رہی اور اندھیرے مستقبل کے سبب آنکھوں کے آگے کوئی منظر بھی نہیں ہے۔ اس وقت شاعر سر فراز کاتب نے گویا شرون کمار کا رول ادا کرنے کی کوشش کی اور اپنی اس زبان کو بوڑھے ماں باپ کی طرح اپنے کاندھے پر سوار کر کے لے کر چلے تو تھے مگر اجل کے تیر سے گھائل ہو کر اس سفر کا اختتام ثابت ہوئے۔ براری بولی میں ان کا مرتبہ مزاحیہ شاعری کا مجموعہ اب بھی اشاعت کا منتظر ہے۔ حالانکہ مشاعروں کے سامعین ان کے اکثر اشعار دہراتے ہوئے سنے جاتے ہیں۔

سر فراز کاتب

نیلے پیانٹ پہ پیلا کرتا، اودی ٹوپی، جوتے لال
کالے خاں پیغام کو جاریا، لاتا آپھت
باپ کی قبر کاں پر ہے تو مالوم نئیں
غیبی شا کا عرس بھرا ریا، کرتا وانده
جھوڑپے کھانا میرا، باوا کے، بھایوں کے تیرے
اور ہلدی میں تیرا آنسو ملانا یاد ہے
اپنے پوٹٹے کو لائے میارٹ میں
کیسا گھپلا کیا ہو ماسٹر صاب
سال بھر تو پڑھائے تھے تم نے
پھر کیوں پھرنا پڑا ہو ماسٹر صاب
ایک نظم شادی کارڈ کے چند اشعار درج ذیل ہیں:
اپنی بائی کی جڑ گئی شادی
دن ہے اتوار کا مئی چوبیس
سن کونتا آتا کیا معلوم
اردو تاریخ تم نے لکھ لینا
نام نوشہ کا کالے خاں لکھنا
عرف ببو ذرا بڑا لکھنا
پوٹٹی دسویں میں خط نہیں پڑھتی
پوٹٹا میٹرک ہے کچھ نہیں آتا

اس سلسلے کے ایک اور اہم شاعر ہیں صوبیدار فوجی ان کی بعض ہزلیں براری الفاظ کا چٹخارہ لئے ہوئے ماہنامہ شگوفہ حیدر باد، میں شائع ہوئی تھیں۔

صوبیدار فوجی

وہ اپنی کھڑکی میں آ کے بھونڈے سُروں میں اک گیت گا رہی ہے
تو کھت کی گاڑی پہ بیٹھے ہم بھی گھمیلا پُھٹکا بجا رہے ہیں
ساقیا کس نے کہہ دیا تجھ سے کہ تیرے باعث کھلے ہیں میخانے
ساری رونق ہمارے دم سے ہے، ورنہ اوندھے پڑے تھے پیمانے

ہر ایک ویکتی میں یہ ہمّت نہیں ہے
محبّت ہے، کوئی گمّت نہیں ہے
عشق کی اپنے اُلنگ واڑی ہوئی
حسن کا اس کے بھی سروا ہو گیا
ہے لانا ضروری نئی سرمے دانی
بہت مرگیا ان کی آنکھوں کا پانی
یہی انداز رفیق شاکر کی اس غزل میں بھی نمایاں ہے:

رفیق شاکر
چاندنی سے چٹک گئے پُھپّا
بس کے پیچھے لٹک گئے پُھپّا
پُھپّی بی اے بھی ہو گئیں لیکن
پانچویں میں لٹک گئے پُھپّا
فنّی ایوت محلی کے یہاں بھی اس قسم کے اشعار ملتے ہیں:

فنّی ایوت محلی
مکھّی بن کر پچھتاؤ گے
چیونٹی بن کر پیڑے کھا لو
بات پتے کی کہہ دیتا ہوں
ایڑے بن کر پیڑے کھالو
اس قبیل کی شاعری کو ادب کا ہر قاری سمجھ نہیں سکتا کیونکہ اس میں علاقائی الفاظ کا استعمال تفہیم کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ تعلیم اور بدلتی ہوئی سماجی صورتِ حال کے سبب بیشتر الفاظ ان علاقوں میں بھی نا مانوس ہوتے جا رہے ہیں۔ ناظم انصاری کے مجموعہ ’’گوبھی کے پھول‘‘ (۱۹۸۰) میں عصری زندگی کی جھلکیاں اور عشقیہ مضامین ظریفانہ رنگ لئے ہوئے ہیں۔

ناظم انصاری
دیوانہ اس نے کر دیا اک بار دیکھ کر
ہم کر سکے نہ کچھ بھی لگا تار دیکھ کر
مرے بڑھاپے میں پھر سے بہار لانے کو
سنا ہے ایک بڑی بی مری تلاش میں ہے
فیلڈ ہو کوئی کلر اپنا جمائے رکھئے
ٹانگ ٹوٹی ہی سہی پھر بھی اڑائے رکھئے
معروف شاعر محبوب راہی نے جہاں دیگر اصنافِ ادب میں اپنی صلاحیتوں کا مظاہرہ کیا ہے، ان کے قلم سے ظریفانہ رنگ میں بھی خواہ نظم ہو یا نثر، بے شمار چیزیں متنوع انداز میں منظرِ عام پر آئیں ہیں۔ انھوں نے مفلس قارونی کے نام سے مزاحیہ شاعری بھی شائع کی اور اپنے حقیقی نام محبوب راہی کے بینر تلے بھی طنز و مزاح پیش کیا۔ ان کی منظومات میں عصری زندگی کی جھلکیاں اور تلخیاں دونوں نمایاں ہیں۔

محبوب راہی
راتوں کو ڈر کے مارے گھر سے نہیں نکلتے
سڑکوں پہ دن اجالے ہم تیس مار خاں ہیں
پھرتے ہیں لے کے پھندے،
کرتے ہیں کھوٹے دھندے
کھاتے ہیں تر نوالے ہم تیس مار خاں ہیں

دئے دن میں جلانا چاہتے ہیں
مجھے گھر سے بھگانا چاہتے ہیں
گدھے تو ہیں مزے میں، کس لئے ہم
انھیں انساں بنانا چاہتے ہیں
محبوب راہی کے علاوہ اس دیار میں ظریفانہ شاعری کا ایک اہم نام فیاض افسوس ہے ان کا مجموعہ کلام ’کفِ افسوس‘ زیورِ طبع سے آراستہ ہو چکا ہے۔

فیاض افسوس
کیوں نہ ہوں لختِ جگر سر کے ہوئے
جب کہ ہیں مادر پدر سر کے ہوئے
جنگ رکتی ہی نہیں سسرال میں
کچھ ادھر ہیں کچھ ادھر سر کے ہوئے
یہ زمیں یہ رشکِ جنّت چھوڑ کر
جا رہے ہیں چاند پر سر کے ہوئے

ودربھ کے کئی شاعروں نے اپنے آپ کو ظریفانہ شاعری تک محدود رکھا اور اپنی پہچان بنائی اس قسم کے چند شعرا کا کلام یہاں پیش کیا جا رہا ہے:

عبد الصمد جا وید، گنبدؔ
فائر انجن کو خبر کیجئے فوراً آئے
کپڑا بازار میں کچھ شعلہ بدن جاتے ہیں
منحنی لاغر بدن باریک ململ کی فراک
بیٹیاں حوا کی بنتی جا رہی ہیں ہولناک

ودربھ کے مختلف شعراء گاہے بگاہے ظرافت کو شاعری کے سانچے میں ڈھالتے رہے۔ ظاہر ہے یہ ان کی پہچان نہیں البتّہ ان کے کلام کا ایک رخ یہ بھی ہے۔ ان میں سے چند شعراء کا کلام جو ہمیں دستیاب ہو سکا اس کے نمونے یہاں پیش کئے جا رہے ہیں۔

فصیح اللہ نقیب:
لگا کر چلم کا جو دم دیکھتے ہیں نظر جو نہ آئے وہ ہم دیکھتے ہیں
کہ سوکھے ہوئے کو بھی نم دیکھتے ہیں جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں
خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

خواجہ سعید الدین سرخابؔ اکولوی
وقت کی زد میں تخلص بھی ہمارا آ گیا
پہلے تھے نواب اب سر خابؔ ہو کر رہ گئے
آج کل مل جائیں گے فیشن کے مارے اس قدر
درزیوں نے جن کو مادر زاد ننگا کر دیا

یہاں یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ ودربھ کی آب و ہوا اشک آور نہیں بلکہ فضا کو زعفران زار بنانے کے لئے بڑی ساز گار ہے۔ ذرا نم ہو تو یہ مٹّی بڑی زر خیز ہے ساقی۔ اس کا ثبوت مراٹھی زبان میں مو جود مزاحیہ ادب ہے جو ڈرامے کے بعد اس زبان کا طرہ امتیاز سمجھا جاتا ہے۔ مراٹھی میں مقامی وراہڑی بھاشا کو نہ صرف نظم بلکہ نثر میں بھی کتابی شکل میں پیش کیا گیا اور کئی کتابیں اس بولی کے مزاحیہ ادب کی مو جود ہیں۔ ودربھ کے دیگر ہزل گو شعرا کے اشعار بطور نمونہ یہاں درج کئے جا رہے ہیں۔

ح خ جھنجھٹ، اکولوی
چاند تارے جھانکتے رہتے ہیں ہر سوراخ سے
آسماں لگتا ہے میرے گھر کا چھپّر رات کو
بیوی مینیجر ہے میں چپراسی اور بچے کلرک
سب اکٹھا ہوتے ہیں بنتا ہے دفتر رات کو

لقب عمران
جب سے آئے ہیں وہ خیالوں میں
عمر کٹتی ہے ایڑے چالوں میں
قصیدے شان میں اس بت کی گائے ہیں یعنی

چنے کے جھاڑ پر اس کو چڑھا کے بیٹھ گئے ُ

احمد خاں جلگانوی۔ ثمرؔ
ذرا ان بجلیوں کو روک کر اے آسماں سمجھا
میں رکھ دوں گا ترے سر پر اٹھا کر آشیاں سمجھا
ہم سے کوئی بھلا کیا کھیٹے گا
ہم سرہانے پہاڑ رکھتے ہیں

نجیب چشتی۔قاضی فہیم الدین
قسمت سے جن کو بہنوئی بھوندو میاں ملے
یوں ان کو انگلیوں پہ نچاتی ہے سالیاں
میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں
کاش پوچھو کہ ذائقہ کیا ہے

محمد ابرار ملکا پوری، لیڈ رؔ
جس کوچے میں گم ہو گیا بیگم کا پریچھم
اس کوچے کی ہم خاک ابھی چھان رہے ہیں
ہمارے باپ کی اب تم بہو بنو نہ بنو
تمہارے باپ کا داماد بن گیا ہوں میں

منہ پھٹ ناگپوری
اس دیش میں تو لوگ چرا لیں کفن کے پھول
آئے یہاں بہار، ارے جاؤ بھی میاں
ممکن نہیں ہے ایک کے نخرے کو جھیلنا
تم اور چار چار، ارے جاؤ بھی میاں

محمد طاہر کھام گانوی، فڑ توس
جوتیاں سارے زمانے کی اٹھا نے والا
آج پکڑا گیا مسجد میں چرانے والا
شعر بوگس ہیں تو فڑتوس تخلص ہے مرا
میں تو ہوں آپ کو بس غم میں ہنسانے والا

عبد الحفیظ پاگلؔ
میں یہ سمجھا کہ انھیں مجھ سے محبت ہو گی
وہ یہ سمجھے کہ میری جیب میں پیسہ ہو گا
جیب خالی جو نظر آئی تو ہنس کر بولے
تم ہی بولو نہ بھلا ایسے سے کیسا ہو گا
آج ہوٹل میں تری یاد جو آئی مجھ کو
چائے میں بھیگا ہوا میں نے بٹر چھوڑ دیا

سوامی کرشنانند سوختہ
کا کا کی حکومت میں بھتیجوں کے مزے ہیں
پیرس کی کریں سیر کہ انگلینڈ کو جائیں

لندن کی سیاحت کے یہ شوقین بھتیجے
دیہات کی دنیا میں بھی تشریف تو لائیں

علاقۂ ودربھ میں اردو کے تعلیمی اداروں کی کثیر تعداد اردو زبان کی ترویج و بقا کی ضامن ہے۔ ابتدا ہی سے یہاں بے شمار قلم کار اردو ادب کی مختلف اصناف میں پر ورش لوح و قلم کا فریضہ انجام دیتے رہے ہیں۔ یہاں سے متعدد اخبارات و رسائل اور کتابیں شائع ہوئیں۔ اس ادبی سفر کی روئیداد کئی ناقدین و محققین کے رشحات قلم سے کتابوں میں محفوظ ہے۔ اس سلسلے میں جامعات میں ہونے والی تحقیق کے علاوہ بھی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ اسی طرح مختلف اصناف میں فنکاروں کی نمائندہ تخلیقات بھی شایع کی گئی ہیں۔

’’زعفران زار‘‘ میں شاعروں اور نثر نگاروں کی منتخب تخلیقات پیش کی جا رہی ہیں تاکہ اس سے اندازہ ہو سکے کہ ظرافت کی تخلیق کے معروف مراکز میں ودربھ بھی ایک اہم علاقہ ہے جہاں اس مخصوص ادبی طرزِ اظہار کی آبیاری کرنے والے فنکاروں کی ایک قابلِ لحاظ تعداد موجود ہے۔

***

اظہارِ تشکر

اس کتاب کی نگارشات کے جمع کرنے اور ترتیب و تدوین کے سلسلے میں جن کرم فرماؤں نے تعاون سے نوازا اور رہنمائی فرمائی ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں۔ ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن۔ ڈاکٹر صفدر، جناب شکیل اعجاز، جناب یعقوب الرحمٰن، ریحان کوثر (مدیر، الفاظِ ہند، کامٹی)، ناصر الدین انصار، خواجہ ساجد، جناب ریاض کامل۔ یہ کتاب قومی کونسل برائے فروغِ اردو کے مالی تعاون سے منظرِ عام پر آئی اس کے لئے میں تہہ دل سے شکر گزار ہوں۔

حوالۂ جات

۱۔ خطا معاف، یوسف ناظم، مصنّفہ: بابو آر کے، اچلپور، ۱۹۹۰۔ ص: ۹
۲۔ بلا عنوان۔ شیخ رحمٰن اکولوی۔ ۱۹۸۱
۳۔ برار کی تمدنی و علمی تاریخ، از: ڈاکٹر شرف الدین ساحل، ۲۰۰۱، ص۳۴
۴۔ ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن، برار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ناگپور، ۲۰۱۱، ص۱۳۵
۵۔ ڈاکٹر آغا غیاث الرحمٰن، برار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا، ناگپور، ۲۰۱۱، ص۱۳۹

وجودِ زن

باب اول

اس باب میں ودربھ کی خواتین قلم کاروں کی طنزیہ و مزاحیہ نگارشات پیش کی جا رہی ہیں۔

شفیقہ فرحت

اردو کی مشہور مزاح نگار شفیقہ فرحت کی پیدائش ۲۶ اگست ۱۹۳۱ کو ناگپور میں ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی عمر کا بڑا حصہ بھوپال میں گزارا جہاں وہ حمیدیہ کالج میں لکچرر تھیں اسی لیے اس شہر کے ساتھ ان کا نام جڑا رہا۔ شہر ناگپور میں ان کی ادبی خدمات میں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ وہ ناگپور سے شائع ہونے والے بچوں کے رسالے ’’ماہنامہ چاند‘‘ سے وابستہ تھیں۔ یہ رسالہ جنوری ۱۹۵۲ میں جاری ہوا تھا۔ فیض انصاری اور شفیقہ فرحت اس کے مدیر تھے بعد میں شفیقہ فرحت نے اس رسالے سے علاحدگی اختیار کر کے اپنا ذاتی رسالہ ’’کرنیں‘‘ ۱۹۵۴ میں ناگپور ہی سے جاری کیا تھا جو ڈیڑھ برس تک نکلتا رہا۔

اردو کے قلم کاروں میں بہت کم خواتین نے طنز و مزاح کو اپنے تخلیقی اظہار کا ذریعہ بنایا۔ شفیقہ فرحت ان میں ایک اہم نام ہے۔ انھوں نے اپنے منفرد اسلوب اور حسِ مزاح سے اس شعبے میں اپنی شناخت قائم کی۔ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ''گول مال''، ''رانگ نمبر'' ''ٹیڑھا قلم'' اور ''لو آج ہم بھی''، اردو کے ظریفانہ ادب میں گراں قدر اضافہ ہیں۔ ۲، فروری ۲۰۰۸ کو ان کا انتقال ہو گیا تھا۔

بعد سبک دوشی

شفیقہ فرحت

لوگ جب ملازمت سے سبکدوش ہوتے ہیں یعنی ریٹائر ہو جاتے ہیں تو خواہ صدر جمہوریہ کے عہدے سے ہوں یا چپراسی کے تو انھیں فرصت ہی فرصت ہوتی ہے۔ پنشن اور مختلف فنڈس کے ساتھ ایک ''چین'' کی بنسی ملتی ہے، جسے وہ بجاتے رہتے ہیں۔ اب اس ''چین'' کی بنسی والی کہاوت سے یہ راز نہیں کھلتا کہ بنسی ملک چین سے برآمد کی جاتی ہے یا بذات خود چین نامی کسی دھات یا لکڑی کی ہوتی ہے یا سیدھی سادی عام قسم کی بانسری کو چین سے بیٹھ کر چین اور اطمینان کے تال کے سروں میں بجایا جاتا ہے۔ اس کے بجانے کی ٹریننگ لی جاتی ہے یا رٹائر ہونے کے ساتھ ہی الہامی طور پر اس فن پر عبور حاصل ہوتا ہے۔

خیر بانسری کی تفصیلات پر پھر کبھی غور کر لیں گے اور بات بن گئی تو ایک نیشنل سطح کی کانفرنس منعقد کر لیں گے اور بقیہ عمر دوسرے قسم کی چین کی بنسی اور اونچے سروں میں بجائیں گے۔

فی الحال تو صرف چین اطمینان سے واسطہ اور تعلق رکھیں۔

ہاں تو رٹائر منٹ کے بعد ساری مصروفیات ایک دم ختم کرنے کو کچھ ہوتا ہی نہیں تو جلد باز قسم کے لوگ کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کر کے اپنے گلے میں اپنے ہی ہاتھوں پھندا ڈال لیتے ہیں (بعضوں کو ہم نے اس پھندے کو کھینچتے ہوئے بھی دیکھا ہے۔۔۔!)صاحبِ علم و ادب کاغذ قلم سنبھال کر یاد داشتیں لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور ملازمت کے تجربات بیان کرتے ہیں جو ساری دنیا میں تہلکہ اور ہنگامہ مچا دیتے ہیں۔

ملازمت ہماری نہایت غیر اہم تھی، لہٰذا تجربات بھی بے رنگ، بے روح، لیکن رٹائر منٹ کے بعد جو نئے پہلو سامنے آرہے ہیں اور جو نئے نئے گوشے کھل رہے ہیں اور جس شدت سے مصروفیات میں اضافہ ہوتا جا رہا ہے اسے دیکھتے ہوئے ہم نے طے کیا کہ پڑھنے والوں کو بھی ہم اپنی رٹائر منٹ والی دنیا میں شامل کر لیں، کہ ایک نہ ایک دن تو آپ کو بھی رٹائر ہونا ہی ہے۔

ویسے اگر آپ اس لکھے کو پڑھ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ آپ رٹائر ہو چکے ہیں۔ آج تک دنیا میں کام دھندے سے لگے آدمی کے پاس اخبار کی سرخی تک دیکھنے کا وقت نہیں اپنی اس ضرورت کو چلتے پھرتے دیگر مصروفیات و مشغولیات کے ساتھ ٹی وی یا ریڈیو کے ذریعے پوری کر لیتا ہے۔

ہمارے ایک ہمدرد نے ذرا جھجھکتے جھجھکتے ہم سے پوچھا۔۔ ' آج کل آپ کیا کر رہی ہیں؟' ہم نے جواب دیا۔۔ ''کوئی خاص کام نہیں۔۔ ۔۔ '

انھوں نے لہجے میں کچھ اور ہمدردی گھول کے کہا۔ ۔ ''پھر تو وقت مشکل سے کٹتا ہو گا۔''

''ارے نہیں۔۔ ۔ ہم تو پہلے سے بھی زیادہ مصروف ہو گئے ہیں۔ کاٹنے کے لیے وقت ڈھونڈے ڈھونڈے نہیں ملتا۔''

اس کو وہ ہماری ادا اور عادت سمجھ کے خاموش ہو گئے۔ لیکن خود اپنی عادت سے مجبور ہو کر دوسرا سوال داغ دیا۔

''گذر بسر بھی ذرا تنگی سے ہوتی ہو گی۔''

''تو بہ کیجئے۔ تنخواہ سے زیادہ ٹھاٹھ ہیں۔۔ ۔''

ہم نے ان کی ساری مایوسی پر پانی پھیر دیا۔

''ہاں ہاں کیوں نہیں۔ وہ جی۔ پی۔ ایف وغیرہ انٹریسٹ اچھا خاصہ مل جاتا ہو گا۔۔ ۔'' انھوں نے اپنے حسابوں سے ہماری آمدنی کا حساب لگانا شروع کیا۔

''حضور کیسا جی۔ پی۔ ایف اور کہاں کا سود۔ وہ تو ابھی ملا ہی نہیں''

''پھر۔۔؟'' ان کی حیرت بے حساب اور بے اندازہ بڑھنے لگی۔

ہم نے سوچا انھیں زیادہ پریشان کرنا مناسب نہیں ہے۔ ویسے ہی دل کے مریض ہیں۔ (محاورتاً نہیں حقیقتاً) اوپن ہارٹ سر جری ہونے والی ہے۔ کچھ ہو ہوا گیا تو دیگر لا تعداد الزامات کی طرح یہ الزام بھی ہمارے سر آئے گا۔ لہٰذا معمے کا حل معمے کے

ساتھ منسلک کر دینا چاہئے۔
چہک کے ہم نے کہا۔ ۔ تنگی ونگی کیسی۔ سلامت رہیں یہ کانفرنس اور ورک شاپس۔'' سیدھے سادے آدمی ہیں سمجھنے کے بجائے اور الجھ گئے۔
' کیا کوئی آل انڈیا کانفرنس اینڈ ورک شاپ ڈپارٹمنٹ کھل گیا ہے۔ ۔ ۔؟''
''کس منسٹری کے تحت۔؟''
یہاں صاحب جب کھیل کود گلی ڈنڈا، کشتی، دنگا ناچ رنگ، یاترا پد یاترا ہر چیز کے شعبے قائم کیے جا چکے ہیں تو پھر کانفرنس کا شعبہ کیوں نہیں۔ خیر ابھی نہ سہی پھر کبھی۔ بیسویں صدی میں نہ سہی اکیسویں صدی میں یہ شعبہ ضرور قائم ہو گا۔ وزیر کابینہ کے درجے کے ساتھ۔
ہم نے ان ہمدرد صحت صاحب کو اطمینان دلا دیا کہ فی الحال ایسا کوئی شعبہ قائم نہیں ہوا ہے۔
آپ اس میں کسی پوسٹ کو حاصل کرنے کے لیے دوڑ بھاگ نہ کیجئے۔
تو حضور آپ سب کی اطلاع کے بھی عرض ہے کہ موسمِ بہار تو سال میں ایک بار آتا ہے اور اب تو اس کے لیے بھی حالات سازگار نہیں۔ مگر کانفرنس اور ورک شاپ موسمِ خزاں کی طرح سال بھر چلتی رہتی ہیں۔ آج تعلیمی کانفرنس ہے تو کل کتابیں پڑھاؤ اور بستہ بڑھاؤ ورک شاپ تو پر سوں بستہ اتارو اور کتابیں پھینک سیمینار۔ کسی دن درخت اگاؤ پر بات چیت ہے تو کسی دن جنگل بچاؤ۔ شیر پالو۔ گیدڑ بڑھاؤ کی مہم کے تحت جنگل میں منگل منایا جا رہا ہے۔ کہیں بیگم بھاؤ بتا رہی ہیں تو کہیں سدبھاؤ کے لاڈ دلار ہو رہے ہیں۔ کہیں اہلِ نظر کی فکر و نظر پر فلسفیانہ گفتگو ہو رہی ہے۔ تو کہیں نا بیناؤں کے مسائل پر روشنی ڈالی جا رہی ہے۔ (علمی و ادبی کانفرنسوں کا تو فی الحال ذکر ہی نہیں۔)
غرض یہ کہ ہزار جلوے ہیں اور منوں ٹنوں حلوے مع منڈوں کے۔ بس نظر اٹھائیے، ہاتھ بڑھائیے اور عقل چلائیے۔ پھر تو راوی کو چین کے علاوہ اور قسمت میں لکھنے کے لیے کوئی اور لفظ ملے گا ہی نہیں، کہ بھارت ورش میں سونے کی چڑیاں اب بھی ہیں اور سونے کے انڈے دینے والی مرغیاں بھی۔ یہ اور بات ہے کہ یہ چڑیا ہر کسی کے پنجرے میں اور مرغیاں ہر ڈربے میں قید نہیں ہو سکتیں۔ مگر گنگا تو ہر ایک کے لیے بہتی ہے۔ ہم تو ہاتھ دھو ہی رہے ہیں۔ آپ بھی دھوئیے جب تک اس کا پانی اس قابل رہے۔ ۔!
اتنا کہنا بھی ہمارے ہمدرد کے لیے کافی نہیں تھا، کہ اشاروں کنایوں کی عمر سے وہ آگے نکل گئے تھے لٰہذا ہم نے پرچۂ امتحان کی طرح مزید تشریح کی۔
'''جناب اب تو آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ ہر شعبے میں بڑی بڑی کانفرنسیں اور لمبی لمبی ورک شاپس ہوتی ہیں۔ رقم خطیر بھی اس خانہ حقیر میں رقم کی جاتی ہے۔ جس میں سے کچھ خرچ بھی کی جاتی ہے، اور کانفرنس ہال میں رونق، ہنگامے، شور و غل، آوازوں اور کبھی ختم نہ ہونے والی اور کسی نتیجے پر نہ پہنچنے والی بحث مباحثوں کے لیے چاہئے آبادی کہ ایسے موقعوں پر ' بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔
(افسوس کہ کسی زمانے میں سر اٹھتے، جھکتے اور گنے جاتے تھے، قلم کرنے کے لیے)
تو ایسی لا تعداد کانفرنسوں کے بے گنتی دعوت نامے موصول ہوتے ہیں۔ سروس والوں کو چھٹی نہیں ملتی اور سیاست والوں کو فرصت۔ تو خط بھیج کر زبانی اقرار کروا لیا جاتا اور نیم چڑھے ہوئے یا قسمت کے ستاروں کی بلندی کا ایک سبب اور بھی ہے۔ حالات جدیدہ کے تحت عورتیں رونقِ محفل نہیں بلکہ ضرورتِ مجلس بن گئی ہیں۔ ہم ادیب بھی کہلاتے ہیں، دانشور بھی سمجھے جاتے ہیں، اور الپ سنکھیک بھی تھری ان ون۔ مت سہل ہمیں جانو، والا معاملہ ہے۔ اکثر سواری کا انتظام کر دیا جاتا ہے۔
کنوینشن الاؤنس ملتا ہے۔ پھر چائے ناشتہ، کھانا۔
اب تو دنوں دن ہمارے ہاں کھانا نہیں پکتا۔ چولہا جلتا ہے تو صرف صبح اور رات کی ہنڈی کے لیے (رات کی مڈ ٹی کی تشریح پھر کبھی) یا کبھی کبھار ہونے والی دعوتوں کے لیے یہ ہمارا بے حد پرانا یعنی کرانک مرض ہے۔ ویسے ایک آدھ بے تکلف اور
بے ضرورت کو تو ہم وہیں کانفرنس میں مدعو کر لیتے ہیں کہ
''بھئی آج لنچ ہمارے ساتھ فلاں فلاں بلڈنگ یا فلاں فلاں ہوٹل میں لینا۔ ہم بھی خوش۔
اکثر ہم ذوق ساتھیوں سے انہیں انواع و اقسام کی کانفرنسوں میں ملاقات ہو جاتی ہے اور گفتگو بھی۔ کانفرنس کے اصل موضوع کی خبر تو سوائے کانفرنس کرنے والوں کے کسی کو نہیں پھر بتائیے پیسے ہمارے خرچ ہوں تو کس مد میں۔ پہلے اگلی تنخواہ کا انتظار تیسری چوتھی تاریخ سے شروع ہو جاتا تھا۔ اب مہینوں پنشن نکالنے کی ضرورت پیش نہیں آتی۔
ہم نے ان کی بصیرت اور بصارت کے لیے کچھ نئے باب اور کھولے۔ ' دیکھئے جس کاغذ پر ہم مضمون لکھ رہے ہیں وہ بھی کسی کانفرنس کے تفصیلی پروگرام کا اتنا اچھا۔ اتنا دبیز، اتنا چکنا ریشم کہ قلم خود بخود دوڑنے لگے۔ (دماغ کی بات ہم نہیں کر

رہے کہ وہ تو کم یاب و نایاب ہے۔۔ ۔''
اسی ایک کے سہارے کتنوں کو تیرتے پار لگتے ہم نے دیکھا ہے۔
اگر آپ اپنے آپ پر ایک ظلم اور کر لیں تو دو ایک کانفرنسوں کی جھلکیاں پیش کی جائیں۔ جس کانفرنس میں ہم بنیادی طور پر مدعو تھے وہ اس دن شہر کی سب سے اہم کانفرنس تھی جس کا افتتاح ہمارے وزیرِ اعلیٰ کے نازک ہاتھوں سے ہونے والا تھا۔ وزیر اعلیٰ کو گاہے گاہے اپنے رخِ تاریک کا دیدار کر وا دینا، ان کا سلام لینا، ان سے ہمکلام ہونا، یہ نئی صدی کے باب ہیں۔ سو ہم بھی پہنچے۔ وہاں سے قیمتی قلم فائل وغیرہ وغیرہ چائے اور وائے سے فارغ ہو کر ہم ان صاحبہ کی تلاش میں نکلے جو ہماری گلی سے گزر نے والی تھی۔ ابھی ان تک پہنچنے بھی نہ پائے تھے کہ پھر گرفتار کر لیے گئے۔ پیچھے سے آواز۔
''ارے آپ۔۔ آئیے۔ آئیے۔۔ ۔۔''
''ہم تو جانے کے لیے آرہے ہیں۔''
''جانے کے لیے تو سبھی آتے ہیں۔ لیکن ابھی آپ کیسے جا سکتی ہیں چلئے ہال نمبر دو میں بنیادی تعلیم والی کانفرنس ہے، اس میں شرکت کیجئے۔''
پھر وہی نمبر دو۔۔ ۔۔
بڑی بے تعلقی سے ہم نے ان کی پیشکش ٹھکرانی چاہی۔۔ ۔۔
''دیکھئے اول تو تعلیم۔ پھر بنیادی۔ اس سے ہمارا کیا تعلق؟''
''ہم سے تو ہے۔'' انھوں نے گھسا پٹا ٹوٹا ٹاٹا رشتہ جوڑا۔ وہ ہماری کسی شاگرد کی دوست تھیں۔ اور پکڑ دھکڑ کر ہمیں ہال میں لے گئیں۔ اور حکم دیا۔ ''دیکھئے آپ بولئے گا ضرور۔ یعنی بحث میں حصہ لیجئے۔''
''بھئی کیسی بحث، ہم بھڑبھڑائے۔''
''وہ تو آپ کو خود ہی سمجھ میں آ جائے گا۔'' اور غائب۔ غالباً گرفتاری مہم کے سلسلے میں۔
خیر پانچ سات منٹ میں اس شاک سے Recover ہو کر ہم بحث میں جوش خروش سے حصہ لینے اور اسے آگے بڑھانے بلکہ اسے الجھانے کے قابل ہو گئے۔ ہماری آواز ہال میں دبکے بیٹھے دوسرے گروپ تک پہنچی۔ ایک صاحب نے وہیں سے ہاتھ ہلا کر ہمیں دل بدلنے اور فلور کراس کرنے کا مشورہ دیا جسے ہم نے اپنی نا سمجھی کی بنا پر رد کر دیا۔ تب وہ اٹھ کر آئے۔
''آپ ہمارے گروپ میں آ جایئے۔''
''دیکھئے ہمیں ان لوگوں نے پکڑا ہے۔'' وفاداری کا کچھ تھوڑا سا جذبہ اب بھی کبھی کبھی کہیں کہیں نظر آ جاتا ہے۔
''تو اب ہم پکڑ رہے ہیں۔''
قصہ مختصر ہم نے اس میں بھی زبانی شرکت کی۔ دونوں طرف سے بستے کاغذ قلم اور ''زاد راہ'' کے لفافے بٹورے اور انھیں کی گاڑی میں شان سے واپس آ گئے۔ اب ہمارے پاس اتنے بیگ، پورٹ فولیو۔ فائل کور وغیرہ اکٹھے ہو چکے ہیں کہ ہم ان کا Clearance Sale کرنے والے ہیں۔ یا پھر ''بھوپال میں کانفرنس اور سیمینار'' کے عنوان سے آرٹ گیلری لگائیں گے۔ اور دولت کے ساتھ شہرت بھی بٹوریں گے۔
ہمارے ہمدرد کہ جن کے اب ہم ہمدرد بن چکے تھے ہمارے طول طویل داستان پہ کان دھر نے کے بجائے بھاگے۔ ہم سمجھے ہمارا حشر سیاسی نیتاؤں کا سو ہو رہا ہے۔ ہم نے پوچھا ''آپ کہاں اور کیوں بھاگ رہے ہیں۔'' کہنے لگے۔۔ ۔ استعفیٰ دینے۔۔ ۔۔! کہ ہم بھی کانفرنسوں کے سہارے عیش کریں گے۔۔ ۔''
(ٹیڑھا قلم۔ ۲۰۰۳)

ڈاکٹر بانو سرتاج

ڈاکٹر بانو سرتاج بحیثیت افسانہ نگار اور ادب اطفال کے شعبے میں اپنی خدمات کے لیے مشہور ہیں۔ انھیں ادبِ اطفال کے سلسلے میں ساہتیہ اکادیمی ایوارڈ بھی مل چکا ہے۔
۱۷، جولائی ۱۹۴۵ کو پانڈھر کوڑا، ضلع ایوت محل میں پیدا ہوئیں۔ ایم اے اور پی ایچ ڈی کی ڈگری لینے کے بعد جنتا کالج آف ایجوکیشن کی پرنسپل کی حیثیت سے خدمات انجام دیں اور چند برس پہلے سبک دوش ہوئیں۔ ان کے کئی افسانوی مجموعے منظرِ عام پر آ چکے ہیں۔ ان کی چند تحریروں کے ہندی تراجم بھی شایع ہوئے ہیں۔
بانو سرتاج کے مزاحیہ مضامین میں روزمرہ زندگی کے واقعات ظریفانہ رنگ میں اپنا الگ تاثر پیدا کرتے ہیں۔ ڈاکٹر سید

مصطفیٰ کمال بانو سرتاج کے بارے میں لکھتے ہیں: ان کی مزاحیہ تحریروں میں بھی ایک علمی شان ہے۔ ان تحریروں میں تفکر و تبسم شیر و شکر کا رول ادا کرتے ہیں۔ ’’
خطرے کا الارم‘‘ اور ’’تیرا ممنون ہوں‘‘ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ ان کے کئی مزاحیہ مضامین ماہنامہ شگوفہ، حیدر آباد میں بھی شائع ہو چکے ہیں۔

تیرا ممنون ہوں

ڈاکٹر بانو سرتاج

گزشتہ دنوں ہمارے پاس پی۔ ایچ۔ ڈی کا ایک مقالہ جانچ کے لیے آیا۔ مختلف جامعات سے مقالات ہمارے پاس آتے ہی رہتے ہیں لیکن ان پر فوری طور پر اظہار رائے کر کے رپورٹ روانہ کرنا ہمارے معمولات میں داخل نہیں۔ اس لیے کہ ہم ایسا کریں تو مصروف ممتحن اور اہم شخصیت کیوں کر کہلائیں۔؟
چنانچہ ہم خاصہ وقت رپورٹ بھیجنے میں گزار دیتے ہیں۔ یہاں ہمارے ضبط کا اور ارباب جامعہ کے صبر کا امتحان بھی مقصود ہوتا ہے۔ رپورٹ کی فوری روانگی اس ممتحن کے ذریعے عمل میں آتی ہے جنھیں یہ زرین موقع پہلی مرتبہ ملا ہوتا ہے یا جنھیں اس نوع کی ذمہ داریاں ہمیشہ نہیں، کبھی کبھار غلطی سے میسّر آ جاتی ہیں۔
قابل ممتحن وہ ہوتا ہے جو نہایت مصروف رہتا ہے۔ مصروف نہ بھی ہو تو تاثر یہی دیتا ہے۔ اس طرح وہ اعلیٰ درجہ کا ادا کار یا منافق ہوتا ہے۔ یہ دکھاوا، یا تاثر اور عرف عام میں یہ ناٹک اس کی فطرت ثانیہ کا جزو اول ہوتا ہے۔
وائے ناکامی کہ احساس زیاں جاتا رہا
ہم بھی کچھ ایسے ہی مصروف ممتحنوں کی فہرست میں اپنا نام درج کرانے کے خواہاں تھے۔ اس لیے مقالہ کی وصول یابی کے فوراً بعد ہی ادھر رجوع ہونے اور پڑھ کر رائے قائم کرنے کی غلطی کا ارتکاب کم از کم ہماری ذات سے متوقع و ممکن نہ تھا۔ پہلے مہینے میں ہم مقالہ کا کوَر کھولتے۔ دوسرے مہینے میں مقالہ کی جلد کی خوبصورتی، مضبوطی اور پائداری کا جائزہ لیتے۔ تیسرے ماہ میں نفس مضمون پر نگاہ غلط انداز ڈالتے۔ چوتھے ماہ میں مقالے کی جانچ کرتے۔ پانچویں ماہ میں رپورٹ تیار کرتے۔ تب تک یونیورسٹی سے یاد دہانی کے دو چار خطوط آ جاتے مگر وہ ممتحن ہی کیا جو خطوط پر دھیان دے کہ یہ بھی پروفیسرانہ شان کے منافی ہے۔ تار وار آئے تو کوئی بات بھی ہے۔ تار کا انتظار کرتے۔ تار ملنے پر ہی رپورٹ روانہ کرتے۔ مگر ان دنوں ہم بے اداس تھے۔ بیگم میکے سے لوٹنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھیں۔ اس لیے مقالہ کے آتے ہی ہم نے اسے کھول لیا کہ کچھ تو ہو جس سے دل بہلا یا جائے۔ تو نہیں ہے۔ کوئی تدبیر تو ہے۔ دوسرے ممتحن سب سے پہلے مقالے کا خلاصہ پڑھتے ہیں بلکہ صرف خلاصہ ہی پڑھتے ہیں۔ ہم اظہار تشکر و ممنونیت کے اظہار کے لیے مختص صفحے کا مطالعہ کرنا اپنا اولین فرض گردانتے ہیں کہ ہم ایسے اہلِ نظر ان ہی صفحات سے مقالہ کے وزن و وقعت کا اندازہ کیا کرتے ہیں۔
در اصل ہم چاہتے ہیں کہ خوشگوار موڈ میں مقالے کی جانچ کریں کہ مبادا ہمارے مزاج کا کسی پر برا اثر پڑ جائے۔ اکثر مقالات کے مخصوص صفحات اتنے دلچسپ ہوتے ہیں کہ ان کی شگفتگی، مقالہ نگار کا بیڑا پار لگانے میں معاون ثابت ہوتی ہے۔ مقالہ نگار اپنے سرپرست و رہنما(تحقیق کی نا پسندیدہ لیکن مرغوب اصطلاح میں اس نوع کی مخلوق کے لیے گائیڈ کا لفظ مقبول ہے۔)سے شروع کر کے، اپنے خاندان کے جملہ افراد کو لے کر ہر اس شخص کے تئیں اظہار ممنونیت کرتا چلتا ہے جس سے تحقیق کے دوران اس کا رائی برابر بھلا ہوا ہو۔ گائیڈ کی نگاہ کرم(دستخط)کے بغیر مقالہ یونیورسٹی میں قابلِ قبول نہیں ہوتا اس لیے اس کے نام نامی سے ممنونیت کا اظہار ضرور ہی ہوتا ہے۔ چیلنج اور اختلافِ رائے کا خدشہ نہیں ہوتا کہ کہ تحقیقی مقالے پڑھنے کی چیز نہیں ہوتے۔ چنانچہ پڑھے بھی نہیں جاتے اس لیے گائیڈ کو بلا تامل جید عالم، باصلاحیت رہنما اور فراخ دل شخصیت کے خطابات عطا کیے جاتے ہیں۔ بعد ازاں روئے سخن گائیڈ کی شریک حیات کی طرف ہوتا ہے۔ کئی تعریفی کلمات ان کے نذر کرنے کے بعد کالج کے پرنسپل اور اگر نجی ادارہ ہے تو ادارہ کے صدر معتمد اراکین وغیرہ ہم کو مکھن لگایا جاتا ہے۔ ادب کی جس فیکلٹی میں تحقیق کی ہے۔ اس کے دو چار ڈاکٹروں اور پروفیسروں کا ذکر مقالہ کا وزن بڑھاتا ہے۔ خود کی شریک حیات کا نمبر اس کے بعد آتا ہے۔ گھر میں چاہے جوتیوں میں دال بٹتی ہو مگر اظہارِ تشکر پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہر دو کی قربانیوں کی وجہ ہی سے تحقیق کا کام پایہ تکمیل کو پہنچا ہے۔ خواتین زیادہ جذباتی ہوتی ہیں۔ حسد کرنے میں پیش پیش رہتی ہیں محبّت کرنے میں بھی پیچھے نہیں رہتیں۔ سب کا حساب صاف رکھتی ہیں۔ خاتون مقالہ نگار مجازی خدا کے ساتھ اپنے جگر گو

شوں کا بھی شکریہ ادا کرتی ہے۔ دوسرے الفاظ میں حال کے ساتھ مستقبل پر بھی نظر رکھتی ہے۔ ایک مثالی اظہارِ تشکر Acknowledgement کے ذریعے ہمیں اس خاتون مقالہ نگار کے حال اور مستقبل کے ساتھ ماضی کی شاندار تاریخ کا بھی تعارف حاصل ہوا تھا۔ اس نے کچھ یوں لکھا تھا۔ میں شکر گزار ہوں اپنے خلد نشین نانا جان (سابق ایم۔ ایل۔ اے) کی، جن کے حوصلہ دلانے پر میں نے تحقیق کا کام ہاتھ میں لیا۔ ہائی کورٹ جج چچا اور ایڈوکیٹ ماموں جان کی جنھوں نے ہر مرحلے پر میری حوصلہ افزائی کی۔ پرنسپل خالہ کی جنھوں نے لائبریری کی سہولیات بہم پہنچائیں۔ ۔ ڈاکٹر بھائی جان کی جنھوں نے تحقیق کے دوران میری صحت کا خیال رکھا۔ اکاؤنٹس آفیسر شوہر اور انجینئرنگ میں پڑھ رہے دونوں بیٹوں کی جنھوں نے حساب میں میری مدد کی۔ اظہارِ تشکر سات صفحات پر محیط تھا جس میں آگے چل کر بھائی بھتیجوں، نند، بھاوجوں اور پڑوسنوں کے ساتھ ہو سٹل کی میٹرن کا بھی شکریہ ادا کیا گیا تھا۔ ہاں تو ہم کہہ رہے تھے کہ عادت کے مطابق اس مقالہ کا بھی وہ صفحہ ہم نے سب سے پہلے پڑھا جسے ابھی ہم اپنا من بھاتا کہہ چکے ہیں اور فریفتہ ہو گئے انداز تحریر اور جدت بیانی پر، آپ بھی پڑھیے اور لطف اٹھائیے۔ لکھا تھا۔

اظہارِ ممنونیت نہایت فرسودہ فضول لیکن نا گزیر رسم ہے۔ اس سے عہد بر آ ہونا مقالہ نگار کے لیے تقریباً لازم ہے۔ تحقیقی کام مکمل کر کے کسی بھی مشکور نہ ہونا ایسا ہی ہے جیسے دنیا کے پیدا ہونے کو خالص اپنا کارنامہ گرداننا۔ یا خدا کے وجود سے انکار کرنا۔ ہر چند دنیا ایسے ملحدوں سے خالی نہیں جو سمجھتے ہیں کہ ہم از خود پیدا ہوئی مخلوق ہیں۔ سمجھتے رہیں میری بلا سے۔ مگر تحقیق کے میدان میں اس طرح کا خیال بھی گناہ ہے۔ تحقیق کی کتابوں میں لکھا ہے کہ (کسی عالم کا فرمودہ ہے؟ کون سی قابلِ ذکر تصنیف سے مرقوم ماخوذ ہے اس وقت ہمیں یاد نہیں۔ ویسے اس کی ضرورت بھی کیا ہے؟ محض اظہار تشکر ہے اور برحق ہے کہ اظہارِ تشکر اور ممنونیت کے الفاظ میں تحقیق کا عنصر اور رد و توثیق کا خوف شامل نہیں ہوتا۔) اگر گائیڈ سے تمھارے تعلقات خوشگوار ہیں تو اظہارِ ممنونیت کرو اور اگر تعلقات خوشگوار نہیں ہیں تو ضرور بالضرور اظہار ممنونیت کرو یعنی مکھن لگا نے کا زرین موقع ہاتھ سے نہ جانے دو۔ مگر ایسا کیوں کروں؟ میں نے مکمل ساڑھے پانچ برس تک اپنے گائیڈ کی خوشامد کی ہے۔ جب بھی ان کے گھر گیا۔ آنند بھنڈار کے رس گُلّے ضرور لیتا گیا۔ ان کے بیٹے کی شادی میں صدر دروازے پر کھڑا ہو کر بیگانی شادی میں عبد اللہ دیوانہ کی تابندہ تصویر بن مہمانوں کو خوش آمدید کہا۔ ان کے منجھلے بیٹے کے یہاں بیٹی کی پیدائش پر چاندی کی پازیب تحفتاً پیش کیں۔ ان کی شریک حیات کو بلڈ پریشر کی جانچ کروانے تین مرتبہ اسپتال لے گیا۔ وغیرہ وغیرہ۔ میں اپنے کالج کے لکچرر اور اسٹاف ممبران کا جھوٹ موٹ بھی شکریہ ادا کرنا نہیں چاہتا کیونکہ یہ لوگ میرے منہ پر بھلے ہی میری حوصلہ افزائی کرتے ہو۔ پشت پر مبینہ طور پر بیان بازی میں مشغول پائے گئے کہ دیکھتے ہیں۔ پی۔ ایچ۔ ڈی کیسے کرتا ہے؟ یا۔ دیکھ لی پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے والوں کی صورت!

جن افراد نے میرے تحقیقی کام میں کسی بھی طرح میری مدد کی، ان سب کی کوئی نہ کوئی غرض میرے اس کام سے وابستہ تھی۔ بے غرض خدمت کا اب زمانہ کہاں؟ کلجگ نہیں کر جگ ہے یہ۔ یاں دن کو لے اور رات کودے۔

کرجگ نہیں کل جگ ہے یہ۔ ست یگ نہیں کل یگ ہے یہ اس لیے ان سب کا شکریہ ادا کرنے کا سوال ہی نہیں اُٹھتا۔ مثال کے طور پر، میری نصف بہتر نے ساڑھے پانچ برس تک جو ذہنی سکون مجھے بہم پہنچایا تو اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کی دونوں چھوٹی بہنوں کو ڈاکٹر شوہر ملے تھے۔ وہ شدید احساسِ کمتری میں مبتلا ہو گئی تھی۔ میں اسے احساسِ کمتری سے چھٹکارا دلانے جا رہا ہوں، اس کے لیے اسے میرا ممنون ہونا چاہیے نہ کہ مجھے اس کا۔

مختلف جامعات کی جن لائبریریوں میں جا کر میں نے مطالعہ کیا وہاں کے لائبریرین حضرات کا شکریہ ادا کرنے میں کوئی شک نہیں۔ لائبریرین کا تقرر اسی لیے ہوتا ہے کہ وہ مطالعہ کے لیے کتب فراہم کرے۔ کتب فراہم کرتا ہے تو کوئی احسان نہیں کرتا۔ ٹائپسٹ نے مانا کہ مقالہ بہت اچھا ٹائپ کیا ہے مگر ایسا کرنا اس کے پیشے کے لیے ضروری ہے۔ خراب ٹائپ کرے گا تو اس کے پاس جائے گا کون؟ پھر اس نے تمام رقم پیشگی وصول کی تھی۔ دوم مقالہ کی ٹائپنگ شروع ہونے سے پہلے ہم میں ایک معاہدہ ہوا تھا کہ اگر کسی صفحہ کی ٹائپنگ سے میں مطمئن نہ ہوا تو اسے وہ دو بارہ ٹائپ کرنا ہو گا اور اگر میں خوش ہوا تو فی صفحہ پچیس پیسہ اسے انعام دوں گا۔ اس ہوشیار شخص نے مجھے کسی بھی صفحہ کی ٹائپنگ سے غیر مطمئن نہ ہونے دے کر اپنی محنت تو بچائی ہی پچھتّر روپیے انعام کے بھی وصول کر لیے۔ تحقیق کے میرے موضوع کے ان ماہرین اور اساتذہ حضرات کا میں قطعی شکریہ ادا کرنا نہیں چاہتا جنھوں نے میرے سوالنامے کا رسپانس تو دیا مگر اس وقت جب میرا مقالہ ٹائپنگ کے لیے جا چکا تھا۔

البتہ میں ممنون ہوں۔

سوالنامہ کو رسپانس نہ دینے والوں کا جنھوں نے سوالنامے کو ردّی میں فروخت کیا ہو، بچّوں کو ناؤ بنا کر دی ہو چولہے میں جلایا ہویا چاہے جو کیا ہو مگر بذاتِ خود یا بچوں سے اُلٹے سیدھے نشان لگوا کر مجھے نہیں بھیجا۔ (واپسی کے لیے رکھے گئے لفافے کو دو روپے دس پیسے کے ڈاک ٹکٹوں کے ساتھ اپنے پاس رکھ کر وہ زندگی بھر کے لیے میرے مقروض ہیں۔)اپنے

گائیڈ کے گھر پر نہ ملنے کے اسباب کا جنھوں نے مجھ میں قوت برداشت کو فروغ دیا۔ غصّہ ضبط کرنے اور ہر طرح کے حالات سے سمجھوتا کرنے کی صلاحیت بڑھائی۔ میری خود داری کی جو ہر جگہ میرے آڑ آتی تھی، نفی کرنے میں میری مدد کی۔

اسٹیٹ روڈ ٹرانسپورٹ کارپوریشن کا جس نے میرے شہر سے گائیڈ کے شہر تک جانے کے لئے پانچ سو پچاس چکروں میں سے پانچ سو مرتبہ اپنی ڈائریکٹ خدمات سے مجھے مستفیض کیا۔

ریلوے کے محکمے کا، جس نے پانچ سو پچاس چکروں میں سے پچاس مرتبہ چھوٹ جانے پر اپنی ریلوں میں سفر کرنے کا موقع مجھے عطا کیا۔

اس سبزی والے کا جس کی دوکان پر کھڑا ہو کر میں گائیڈ کے گھر لوٹنے کا انتظام کیا کرتا تھا۔ جہاں مجھے سبزیوں اور ان کے داموں کی اتنی پہچان ہو گئی تھی کہ برا وقت پڑنے پر میں اس علم سے مکمل فیض اُٹھا سکتا ہوں یعنی سبزی بیچ کر بھی گزارا کر سکتا ہوں۔

اس بھورے کتّے کا، جس نے گائیڈ کے گھر سے ناکام لوٹتے دیکھ کر کبھی میرا مذاق نہیں اُڑایا بلکہ دف دف کر کے مجھ سے ہمدردی کا اظہار کیا۔

اس رکشہ والے کا، جو مجھے اسٹینڈ پر بس سے اترتے دیکھ دوڑا دوڑا آتا تھا نہ صرف گائیڈ کے کوچے میں پہنچاتا تھا بلکہ (منجدھار میں نہ چھوڑ کر) میرا انتظار کرتا تھا کیونکہ جانتا تھا کہ گائیڈ گھر پر ملیں گے نہیں اور مجھے فوری اپنے شہر واپس جانا ہو گا۔

اس مجذوب کا، جو مجھے گائیڈ کے گھر کے قریب چوک میں دیکھتے ہی ہاتھوں سے چڑیا اُڑ جانے کا اشارہ کیا کرتا تھا۔ جدید علامتی نظموں کے مفہوم کی طرح اس کا ما فی الضمیر بھی مجھے بہت دنوں بعد سمجھا اور جب سمجھا تو چوک ہی سے واپس لوٹ جانے لگا۔

قریبی شہر کی اس آرگنائزیشن کا، جس نے عین ان ہی دنوں اپنی گولڈن جوبلی منائی اور میرے گائیڈ کو بطور مہمانِ خصوصی مدعو کیا۔ جب میرے گائیڈ نے ایمرجنسی کال کر کے مجھے طلب کیا تھا۔ میرے پہنچنے پر ساری کہہ کر مہمان خصوصی بن کر چلے گئے تھے۔ میں نے لوٹ کر کالج جوائن کر لیا تھا اور میری ایک ہفتہ کی رخصت ایل۔ بی۔ ڈبلیو ہونے سے بچ گئی تھی۔

گائیڈ کی دھرم پتنی کا، جو نہایت شفقت سے پیش آتی تھیں۔ اپنے پتی دیو کی گھر میں عدم موجودگی کی اطلاع دے کر ایک ہاتھ سے پانی کا گلاس ضرور پیش کر دیتی تھیں۔ گھر کی بڑی تھیں، مگر کبھی نہ بتاتی تھیں کہ ان کے پتی دیو کا محل وقوع کیا ہو سکتا ہے؟

ڈاک تار کے محکمے کا، جنھوں نے حسابیات والا حصّہ گیارہ مرتبہ کرنے کی مشق کے نتیجے میں پیدا شدہ آدھے سر کے درد سے مجھے نجات دلائی۔

ڈاکٹر جنھوں نے تحقیق کے لیے بھاگ دوڑ کے دوران میرا بلڈ پریشر نارمل رکھا۔

ڈاکٹر ج کا جنھوں نے میرا نروس بریک ڈاؤن ہونے سے بچایا۔ (میں نے گائیڈ کے انتقال پر ملال کی جھوٹی خبر کہیں سے سن لی تھی۔)

ڈاکٹر ''د'' کا جنھوں نے میڈیکل سرٹیفیکیٹ دے دے کر مجھے چھٹی دلائی۔

نیز سرٹیفیکیٹ میں نئی نئی بیماریوں کے حوالے دے کر اپنے سرٹیفکیٹ کو اعتبار بخشا اور میرے علم میں اضافہ کیا۔

اس اظہار تشکر کو پڑھ کر تین باتیں ہم پر واضح ہوئیں۔ اوّل تو یہ کہ مقالہ نگار اور اس کے گائیڈ ریاست کے دو مختلف اور دور دراز مقامات کے رہنے والے ہیں۔ دوّم یہ کہ تمام دوسرے گائیڈوں کی طرح اس گائیڈ نے بھی اسکالر کو ناکوں چنے چبوائے اور سوّم یہ کہ مقالہ نگار تحقیق سے کم، چکروں سے زیادہ عاجز آیا۔ (ذیلی نتائج چاہے آپ جتنے اخذ کر لیں۔)

ہم نے مقالہ کی جانچ کر کے رپورٹ تیار کی اور مقالہ نگار کو زبانی امتحان کے لیے طلب کر لیا۔ وہ فوراً پہنچا۔ تیس بتیس برس کا خو برو جوان تھا۔ ہم نے کہا۔ ہم تم سے صرف دو سوال پوچھ رہے ہیں۔ اگر تشفی بخش جواب دے سکے تو ابھی رزلٹ دے دیں گے۔ پہلا سوال اس معیار اور انداز کے اظہار تشکر کے ساتھ تم نے گائیڈ سے دستخط حاصل کرنے میں کامیابی حاصل کیسے کی؟ دوسرے کیا تم ادب میں دلچسپی رکھتے ہو؟

اس نے چونک کر ہمیں دیکھا۔ سر جھکا لیا۔ چند لمحوں کی خاموشی کے بعد بولا۔ سر! میں بے حد عاجز آ گیا تھا۔ میرا پرموشن کا چانس چلا گیا۔

ہم نے اسے روک کر کہا۔ وہ سب ہم سمجھ گئے ہیں تم ہمارے سوالات کے جواب دو ہم نے رپورٹ تیار کر رکھی ہے۔ تم اگر اطمینان بخش جواب دیتے ہو تو ہم ابھی اسی وقت رپورٹ روانہ کر دیں گے۔ اس نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور پھر کہا۔ گائیڈ کو

میں نے جو کاپی دی اس میں روایتی ڈھنگ سے لکھا ہوا اظہارِ تشکر تھا۔ بقیہ چار کاپیوں پر دستخط کر دیے۔ دوسرے سوال کا جواب اثبات میں ہے۔ میں فلاں فلاں کے نام سے طنزیہ و مزاحیہ مضامین لکھتا ہوں۔
گُڈ! ہم نے خوش ہو کر کہا۔ ہمارا اندازہ صحیح نکلا۔ یہ لو۔ دیکھو۔ او۔ کے رپورٹ۔ اسے ہم ابھی روانہ کر رہے ہیں۔ وہ خوشی خوشی چلا گیا۔
اب ہم نے طے کر لیا ہے کہ کبھی کسی طنز و مزاح نگار کو اپنی سر پر ستی میں تحقیق کی اجازت نہیں دیں گے۔ جو طلباء فی الحال ہماری سر پر ستی میں کام کر رہے ہیں وہ دستخط کے لیے مقالے ہمارے پاس لائیں گے تو خواہ اصل مقالہ اور نفس مضمون نہ پڑھ سکیں لیکن مقالہ کاپی کا اظہار تشکر ضرور بالضرور اور غور سے پڑھیں گے اور پھر دستخط کریں گے۔
تجربے سے آدمی کو کچھ تو سیکھنا چاہیے۔
***

ثریا صولت حسین

ثریا صولت حسین کو علاقۂ برار کی مشہور شخصیت ادیب اور مورخ سید امجد حسین کی پوت بہو ہونے اور حضرت امیر مینائی کی پر نواسی ہونے کا شرف حاصل ہے۔ ان کے شوہر قاضی سید صولت حسین سیشن جج تھے اور بحیثیت نعت گو شاعر ادبی حلقوں میں اپنی پہچان بنا چکے تھے۔ قاضی صاحب اپنے آخری ایام میں ممبئی میں سکونت اختیا ر کر چکے تھے، وہیں ان کا انتقال ہوا۔
ثریا صولت حسین کی پیدائش ناگپور میں ہوئی، ان کے بچپن ہی میں ان کے والد حیدر آباد منتقل ہو گئے تھے۔ ثریا صولت حسین نے ناگپور یونیورسٹی سے اردو میں ایم اے کیا تھا۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ ’’مدو جزر‘‘ ۱۹۸۶ء میں شائع ہوا تھا جس میں ۱۸ افسانے اور پانچ مزاحیہ مضامین اور خاکے ہیں جن کے عنوانات درج ذیل ہیں۔ نیند پری، یور آنر، اندھے عقیدے، رنگِ بہار اور ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے۔ ان کے متعلق ڈاکٹر منشا الرحمٰن نے لکھا ہے۔ ’’مقامِ مسرت ہے کہ آپ اصلاحی قسم کے افسانے اور کہانیاں بھی لکھتی ہیں اور دلچسپ و دلپذیر انشائیے بھی تحریر فرماتی ہیں۔ مشق شعر گوئی کا یہ عالم ہے کہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو محفل میں خواتین کی شعری نشست کے لیے شاعرات کی تلاش ہوئی تو سب سے پہلے ہماری نظر اسی ثریا پر پڑی۔‘‘

یور آنر

ثریا صولت حسین

خیر سے ہمارے یور آنر یعنی ہمارے شوہر بہت نیک صفت اور ہمہ اقسام خوبیوں کے مالک ہیں لیکن جب ان کی فطرت میں حلول کی ہوئی کسی زاہدِ خشک کی روح ان پر غالب آ جاتی ہے تو ہم ان سے اور وہ ہم سے بیزاری کا اظہار کرنے پر تل جاتے ہیں۔ ہماری بذلہ سنجی اور شاعرانہ اندازِ گفتگو ان کے منصفانہ مزاج پر گراں گزرتی ہے کیونکہ اکثر ہم نے محسوس کیا ہے جیسے وہ ہم سے ہمارے ہر جملے پر سوال کر رہے ہوں کہ
تم ہی کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے۔
یور آنر کا قول ہے کہ اچھی اور کامیاب شریکِ حیات وہی ہے جو خود کو سیاں جی کے رنگ میں رنگ لے۔ جو کھلائے وہ کھائے، جو پہنائے وہ پہنے اور جو بلوانا چاہے ویسا ہی بولے، وغیرہ وغیرہ لیکن ہمیں ان کے ان تمام نظریات پر سخت اعتراض ہے۔ ہم سوچتے ہیں کہ ہر شخص کی اپنی انفرادیت ہوتی ہے، اسے بر قرار رکھتے ہوئے بھی مل جل کر ایک ساتھ زندگی گزاری جا سکتی ہے۔ جس طرح قوسِ قزح کے سات رنگ جدا جدا ہوتے ہوئے بھی صدیوں سے ایک ساتھ رہتے آرہے ہیں۔ لیکن بھئی! یور آنر کو تو جیسے قائل ہونے کی عادت ہی نہیں۔ وہ بڑے بڑے تگڑے وکیلوں کو بھی بعض اوقات شکست دیتے ہیں تو بھلا ہم، کیا پدی کیا پدی کا شوربہ۔
ابتدا میں ہم دونوں کے مزاج کا یہ اختلاف ہم دونوں کے درمیان اچھی خاصی مہابھارت کا سبب بن جاتا تھا۔ پھر رفتہ رفتہ ہم لوگ سرد جنگ کے عادی ہوتے گئے۔ اس کے علاوہ اس جانب نے ’’جی حضوری‘‘ کے کچھ ایسے گر سیکھ لیے جس سے ہماری انا

پر کوئی آنچ بھی نہیں آتی۔ اور ہم اپنے یور آنر سے سعادت مندی کی داد بھی وصول کرتے رہتے ہیں۔ ویسے ہمیں ان کی بھولی صورت پر ہمیشہ ترس آتا رہا ہے۔ میکے سے رخصت کے وقت جو اقوالِ زرین ہمارے گوش گذار کئے گئے تھے، بارہا ان کی بازگشت ہمیں اپنے اندر سنائی دیتی رہی ہے۔ مثلاً یہ کہ شوہر مجازی خدا ہوتا ہے (نعوذ باللہ)، شوہر کی مرضی اللہ کی مرضی ہوتی ہے۔ چلئے اگر ہم ان تمام باتوں کے دل سے معترف ہو بھی جائیں تو اس کا اظہار ہم یور آنر سے تو نہیں کر سکتے نا!
آخر ہماری خود داری بھی کوئی شے ہے۔ عورت کے قدموں تلے بھی تو جنت کی نشاندہی کی گئی ہے، پھر عورت کو ادنیٰ اور مرد کو اعلیٰ کیسے قرار دیا جا سکتا ہے۔ یہ منطق ہمارے لئے بعید از قیاس ہے۔ ہم تو مرد کو صرف بہ لحاظ جسمانی قوت مقابلتاً دس نمبر زیادہ دینے کے قائل ہیں ؛ ورنہ مرد اور عورت ہر لحاظ سے مساوی حیثیت رکھتے ہیں۔ عورت کو یہ حق حاصل ہونا چاہئے کہ وہ اپنے جذبات، احساسات اور اپنی پسندو ناپسند کی تنِ تنہا مالک بنے۔ تو بھلا ہم کیوں اتنی آسانی سے اپنا چولا بدل لیتے ہیں۔ ہمارا مزاج، ہماری عادتیں اور ہمارا اندازِ گفتگو ہمارے میکے کی دین ہے، یہ ہمارے میکے کی یادگاریں ہیں۔ انھیں ترک کر دینا گویا میکے سے قطع تعلق کر لینا ہے۔ نہیں صاحب! یہ ہمیں کسی قیمت پر بھی منظور نہ تھا۔
دوسری طرف یہ کب منظور تھا کہ ہم اپنے مجازی خدا کے معیار پر پورے نہ اتریں، نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔
کافی عرصے تک ہم اس نسخۂ کیمیا کی جستجو میں رہے جو ہمیں بظاہر اپنے مجازی خدا کی حکم کی بندی بنا دے اور ادھر ہماری خودی اور انا کو بھی ٹھیس نہ لگے۔ ایک دن اچانک ہمارے ذہن میں ایک کوندا سا لپکا اور ہم نے ایک ترکیب سوچ لی۔
یعنی ہم نے ایکٹنگ کرنے کی ٹھان لی۔ اسکول اور کالج کے زمانے میں ہم پڑھائی سے زیادہ ڈراموں میں دلچسپی رکھتے تھے۔ ایک مرتبہ تو بیجا پور کی چاند بی بی کے کردار میں ہم نے گویا روح پھونک دی تھی۔ اس وقت ہماری اداکاری کو بہت سراہا گیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی ہمارے رگ و پے میں مسرت کی لہریں دوڑنے لگیں۔ آخر ہمارے میکے کا ہنر ہمارے کام آنے والا تھا۔
جب ہم نے ایکٹنگ کا مصمم ارادہ کر لیا تو سب سے پہلے ہم نے یور آنر کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو بہت دھیان سے سننا شروع کیا۔ ان کے چہرے کے اتار چڑھاؤ اور ہر ادا کو اپنے ذہن کے کیمرے میں بند کیا، پھر تنہائی میں ان کے دہنِ مبارک سے نکلے ہوئے تمام الفاظ دہرائے۔ فرصت کے لمحات میں انڈین پینل کوڈ اور مسلم پرسنل لا کی ورق گر دانی کی۔ اس طرح مختصر عرصے میں ہم ما شا اللہ حسبِ ضرورت ترقی کر گئے۔ قانونی نکات اور اصطلاحوں کے اچھے خاصے ذخیرے کو ہم نے کسی ڈرامے کا ایک پارٹ سمجھ کر زبانی یاد کر لیا اور پھر ہم دلہن وہی جو پیا من بھائے کی طرح یور آنر سے اپنی قابلیت کا لوہا منوانے لگے۔ وہ بے چارے ہماری سعادت مندی اور قابلیت پر داد دے دے کر تھک جاتے لیکن ہم خود کو اپنی کامیاب ایکٹنگ پر داد دیتے ہوئے کبھی نہیں تھکتے۔ غرض کہ ہماری زندگی کی گاڑی ایک ہموار راستے پر چل پڑی۔
وہ جیسے ہی کورٹ سے گھر آتے تو ہم کھڑے ہو کر پھر جھک کر ان کا استقبال کرتے اور فوراً ان کی پسندیدہ قانونی زبان میں ان سے گفتگو کرنے لگتے۔ ’’بھئی! آج تو چائے کے ساتھ پورا انصاف کیا جائے گا۔‘‘ یور آنر نے کورٹ سے آ کر تھکے ہوئے لہجے میں فرمایا۔
’’لیکن جناب اس طرح تو آپ رات کے کھانے کے ساتھ نا انصافی کریں گے۔‘‘ ہم نے دخل اندازی کی گستاخی کی۔
’’ہم کچھ سمجھ نہیں پائے! پلیز Proceed! انھوں نے سوالیہ نظروں سے ہماری طرف دیکھا۔
’’یور آنر! بات در اصل یہ ہے کہ آج ہم وہی مرغی پکا رہے ہیں جو پچھلے دو ماہ سے آپ کے ڈربے میں قید با مشقت کی سزا بھگت رہی تھی۔ روز رات کو پڑوس کا کالا بلّا کسی جلاد کی طرح اس کے سر پر سوار رہتا تھا کہ کب وہ باہر نکلے اور وہ اس کی گردن دبوچے، لہٰذا ہم نے سوچا، اس سے پہلے کہ وہ اس غریب اس کے خوف سے تل تل کر کے مر جائے کیوں نہ ہم اسے ذبح کروا کر اس کشمکش سے ہمیشہ کے لئے آزاد کر دیں۔‘‘ ہم وضاحت کرنے لگے تو انھوں نے ہم کو گھور کر دیکھنا شروع کر دیا۔ ہم نے سہمے انداز میں ان سے پوچھا، ’’کیوں جناب! کیا قانون میں مرغی کو بھی سزائے موت دینے کے لیے کوئی خاص Procedure ہے؟ ہماری بات سن کر وہ خلافِ معمول بلند آواز میں ہنس پڑے اور تحسین آمیز نگاہوں سے ہماری طرف دیکھتے ہوئے بڑے دل آویز انداز میں بولے، ’’بھئی بیگم! تم ہو بڑی جلاد‘‘ ۔
’’توبہ کیجئے! اگر ہم جلاد ہوتے تو اس وقت دفعہ ۳۰۲ والے کسی مجرم کی گردن ناپ رہے ہوتے یا تختۂ دار کے آس پاس منڈلا رہے ہوتے۔‘‘ ہم نے نہایت سنجیدگی کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان کی بات کا جواب دیا۔
’’پلیز بیگم! No argument‘‘ جائیے جا کر چائے لائیے۔‘‘
’’تو باقی کل کے لیے adjourn کر دیا جائے نا؟‘‘ ہم نے بلند آواز میں ان سے پوچھا اور باورچی خانے میں جا پہنچے۔
ایک دن ہم نے محسوس کیا کہ باورچی خانے سے پسی ہوئی مرچ اور ہلدی اکثر کم ہو جاتی ہے۔ ہمیں اپنی ملازمہ پر شک تھا۔ جب یہ تماشا ہمارے آگے شب و روز ہونے لگا تو ہمارے صبر کا پیمانہ چھلک ہی گیا اور ہم اس ملازمہ پر بری طرح برس پڑے۔ ہمارے یور آنر نے یہ سب سنا تو ہمیں بلا کر کہنے لگے۔ ’’بیگم! آپ کو ملازموں سے اس طرح نہیں پیش آنا چاہئے، آپ کے پاس کیا پروف ہے کہ مرچ اس ملازمہ ہی نے چرائی ہے؟‘‘

''ڈبے میں سے مرچ غائب ہے کیا یہ ثبوت کم ہے؟'' ہم نے بپھر کر کہا لیکن پھر کچھ سوچ کر سنبھل بھی گئے۔
''ڈبے میں مرچ نہیں ہے اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں، ہو سکتا ہے آپ بھول گئی ہوں یا مرچ آپ ہی کے ہاتھوں خرچ ہو گئی ہو یا پھر کسی اور نے نکال لی ہو۔'' انھوں نے argumentشروع کر دئے۔ ''ہمیں پورا یقین ہے یہ اسی ملازمہ کی کارستانی ہے۔ چپراسی وغیرہ تو باورچی خانے میں کم ہی جاتے ہیں۔'' ہم نے انھیں قائل کرنا چاہا۔
' ' نہیں بیگم! یہاں اس ملازمہ کو یقیناً benefit of doubt ملنا چاہئے۔'' انھوں نے اپنا فیصلہ سنا دیا اور ہم مصلحتاً چپ ہو گئے کیونکہ ظاہر ہے ہمیں اپنی ایکٹنگ کو کامیاب بنانا تھا۔
اسی طرح ایک دن شام کی ڈاک سے ہمیں ہمارا محبوب پرچہ ملا تو ہم
بے حد اشتیاق سے اس کے مطالعے میں غرق ہو گئے۔ اتنے میں ہمارے یور آنر کورٹ سے آ گئے اور آتے ہی وہ پرچہ ہمارے ہاتھ سے اچک لیا اور فرمایا ''واہ بیگم! ہم تھکے ہارے کورٹ سے آئے ہیں اور آپ یہ الّم غلّم پڑھ رہی ہیں۔''
''تو کیا حکم ہے حضور!'' ہم نے بمشکل اپنا غصہ ضبط کیا اور پھر ایکٹنگ شروع کر دی۔ ''چائے لائیے! پھر ہم آپ کو اس عجیب و غریب کیس کے بارے میں بتاتے ہیں جو آج ہمارے کورٹ میں پیش کیا گیا تھا۔ بیگم! کیا یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی ماں اپنی ہی بیٹی کو زہر دے کر مار ڈالے اور خود داماد سے شادی کر لے۔'' یور آنر نے چائے کا بھی انتظار نہیں کیا اور شروع ہو گئے۔
''جی ہاں، ضرور ہو سکتا ہے بشرط یہ کہ بیٹی سوتیلی ہو''۔ ہمارا جواز سن کر ان کی آنکھوں میں نئی چمک پیدا ہو گئی اور اس سے پہلے کہ وہ اس کیس پر مزید روشنی ڈالیں ہم چائے کے بہانے وہاں سے اٹھ گئے۔ چائے کے بعد وہ اخبار بینی میں مصروف ہو گئے اور ہم گھریلو بکھیڑوں میں الجھ گئے۔ لیکن رہ رہ کر ہم کو اپنے محبوب پرچے کا خیال آتا رہا اور ہم خود کو یہ کہہ کر تسلی دیتے رہے کہ رات کو سونے سے پہلے پورا پرچہ پڑھ کر ہی سوئیں گے۔ چنانچہ رات کو جب ہم اپنی تمام گھریلو ذمہ داریوں کو نمٹا کر بستر پر آئے تو وہ پھر آ دھمکے اور فرمایا۔ ''بیگم! آپ پھر بور کرنے لگیں۔'' انھوں نے وہ پر چہ ہم سے چھین لیا اور ہمیں حکم دیا کہ ہم ان کے پاس بیٹھ کر کورٹ میں ہونے والی دن بھر کی کاروائی سنیں۔'' مرتے کیا نہ کرتے گیارہ بجے رات تک ہم ہوں ہاں کی ایکٹنگ کر کے ان کو سنتے رہے۔ پھر جب ان پر نیند کا غلبہ ہو گیا تو ہم نے دوسرے کمرے کی راہ لی اور نصف شب تک اپنے محبوب پرچے سے لطف اندوز ہوتے رہے۔ صبح جیسے ہی چھے بجے کا الارم ہوا تو یور آنر نے اٹھ کر نماز کا ارادہ فرمایا اور ہمیں آوازیں دے کر جگانے لگے۔ بے خوابی کی وجہ سے ہمارا سر بھاری ہو رہا تھا اور آنکھیں جل رہی تھیں۔ لہٰذا بستر سے اٹھنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ ''طبیعت بہت خراب ہے، چکر آ رہا ہے۔'' ہم نے نہایت مریل سے آواز نکالی۔ یہ سنتے ہی وہ سب کچھ بھول کر ہمارے پاس آ بیٹھے۔
''کیا بات ہے جان عزیز!'' انھوں نے اپنا دستِ مبارک ہماری پیشانی پر رکھ دیا اور ہم نے دیکھا کہ ان کے رخِ انور پر سخت تردد کے آثار نمایاں تھے۔ یہ بھی حقیقت ہے کہ سخت اختلاف رائے کے باوجود ہمارے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے بھر پور محبت و خلوص کے جذبات موجزن رہتے ہیں۔
''بیگم! یوں کرتے ہیں ہم آج سی ایل لے لیتے ہیں اور ڈاکٹر کے پاس چلتے ہیں۔ آپ نے کافی عرصے سے اپنا بلڈ پریشر بھی چیک نہیں کروایا۔'' یور آنر نے بے حد خلوص سے اپنی رائے کا اظہار کیا۔ لیکن ان کا یہ مشورہ بم کی طرح ہمارے سر پر پھٹا۔ ہماری بیماری اور ہمارے چکر سب رفو چکر ہو گئے۔ ہم فوراً اٹھ کر باتھ روم کی طرف روانہ ہوئے تاکہ اپنے روزانہ کے معمولات میں مصروف ہو جائیں۔ ہمیں ڈر تھا کہ اگر انھوں نے سی ایل لے لی تو پھر دن بھر ہمیں قانون کی سولی پر لٹکنا پڑے گا۔ گڑے مردے اکھاڑے جائیں گے اور ان تمام مقدمات پر از سرِ نو روشنی ڈالی جائے گی جن کے فیصلے ہمارے یور آنر نے کئے تھے۔ ہم نے سیدھا باورچی خانے کا رخ کیا اور وہاں دو گھنٹے آرام سے گزارے لیکن اس دوران ہم نے انھیں کئی بار آ آ کر باورچی خانے کی کھڑکی سے جھانکتے ہوئے دیکھا۔ وہ بیچارے ملازمہ کی موجودگی کی وجہ سے باورچی خانے میں آ کر ہماری خیریت دریافت کرنے یا پھر کسی نئے کیس کا ذکر چھیڑنے میں تکلف کر رہے تھے ضروری چھٹیوں کو تو ٹالا نہیں جا سکتا لیکن رخصت اتفاقی وغیرہ سے ہم ان کو حتی الامکان گریزاں رکھتے تھے۔ البتہ اگر کبھی خدا نخواستہ ہمارے یور آنر کا مزاج گرامی ناساز ہو جائے تو اپنی ساری ایکٹنگ کو بالائے طاق رکھ کر ہم صدق دل سے ان کی تیمار داری میں جٹ جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ سے ان کی صحت کے لیے دعا بھی کرتے جاتے ہیں اور گڑ گڑ ا کر اپنے یور آنر سے یہ التجا کرتے ہیں کہ ''بس، آپ اچھے ہو جائیے اور اس کے عوض چاہے ہمیں اپنی مکمل کیس ہسٹری سنا ڈالئے۔''
ویسے ہمارے حال پر فضلِ ذوالجلال ہے کہ ہمارے یور آنر شاذ و نادر ہی علیل ہوتے ہیں ورنہ شاید ہماری کل زندگی ان کی کیس ہسٹری کی سماعت میں ہی صرف ہو جاتی۔
(مدو جزر۔ ۱۹۸۶)

مردِ میداں

طنزیہ و مزاحیہ مضامین
اور
خاکے

ڈاکٹر صفدر

صفدر یکم جولائی ۱۹۴۶ کو اچلپور (ضلع امراؤتی)میں پیدا ہوئے۔ ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی اسناد حاصل کیں۔ اردو ہائی اس کو ل، وروڈ (ضلع امراؤتی) میں تدریسی خدمات انجام دیں اور اسی ادارے کے پرنسپل کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے اور امراؤتی میں سکونت پذیر رہے۔
ڈاکٹر صفدر بنیادی طور پر جدید شاعر اور تنقید نگار ہیں۔ ان کے تنقیدی مضامین کا اسلوب سلیم احمد اور وارث علوی کی یاد دلاتا ہے۔ اسی شگفتہ انداز میں انھوں نے مضامین کے علاوہ ’’روزنامہ صدائے ودربھ‘‘ امراؤتی میں ’’نیم کا رس‘‘ کے نام سے مزاحیہ کالم لکھے۔ ان نگارشات پر مشتمل ان کی کتاب ’’آئینۂ خنداں‘‘ منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ اُن کی تحریر میں طنز کی زبردست کاٹ اور شگفتگی ہے۔ اسی منفرد انداز کے سبب وہ اس علاقے کے اہم مزاح نگاروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔
۲۶مارچ ۲۰۲۳ء کو ان کا امراؤتی میں انتقال ہو گیا۔

قطب الدّین ایبک اور ہمارے کتب الدین

ڈاکٹر صفدرؔ

ہمارے ایک دوست ہیں۔ ان کے کان پر ہر وقت قلم رکھا ہوتا ہے اور میز پر کورا کاغذ۔ چنانچہ وہ لکھتے رہتے ہیں۔ لگاتار، بے تکان، بے حساب۔ جیسے گھوڑا گاڑی میں جتا چلتا رہتا ہے۔ چلتا رہتا ہے۔ مشین کپڑا سیے جاتی ہے۔ سیے جاتی ہے۔ ایسے ہی ہمارے دوست لکھے جاتے ہیں۔ لکھے جاتے ہیں۔
کاغذ سازی کے کارخانے میں ایک طرف سے لکڑی، بانس داخل کئے جاتے ہیں، دوسری طرف سے کاغذ نکلا چلا آتا ہے۔ یا یوں سمجھئے کہ وہ کھاتے ہیں۔ ہضم کرتے ہیں۔ پھر کھاتے جاتے ہیں، بعینہ ہمارے دوست لکھے جاتے ہیں۔ کسی کتاب کا پڑھنا اُن کے لئے ایک مسئلہ ہوتا ہے۔ لکھنے کا مشغلہ پڑھنے، غور و فکر کرنے اور سمجھنے کی مہلت ہی نہیں دیتا۔ چنانچہ بقول خود وہ صبح سے شام تک قلم گھسیٹتے رہتے ہیں۔
لکھنا اور لکھے جانا اُن کا مرض ہے۔ یہ کوئی مرض ہے تو اس کا کچھ علاج بھی ہونا چاہیے۔ اُن کے معالج نے ’’ھو الشافی‘‘ لکھ کر لکھا۔
وہ لکھیں اور پڑھا کرے کوئی
پڑھنے کے لیے قاری چاہئے۔ ان کے احباب ہی اُن کے قاری ہیں۔ مگر وہ بھی یہ پڑھتے پائے جاتے ہیں کہ۔۔ ۔ ۔، اس مرض کی دوا کرے کوئی۔
ہماری رائے میں ہمارے یہ دوست تاریخ ساز شخصیت ہیں۔ موصوف اپنے ہر ممدوح کو عہد ساز شخصیت لکھتے ہیں۔ چونکہ اس ترکیب کے معنی ہماری سمجھ میں نہیں آتے۔ اس لئے ہم نے انہیں تاریخ ساز شخصیت لکھا ہے۔ تاریخ میں ان کا نام قطب الدین ایبک کے نام کے ساتھ لکھا جائے گا۔ قطب الدین ایبک نے قطب مینار بنایا تھا۔ ہمارے دوست ’’کتب مینار‘‘ بنا رہے ہیں۔ ہر سال

چھ مہینے میں ان کی دو ایک کتابیں چھپ جاتی ہیں۔ یہ کام موصوف پورے ہوش و حواس، توجہ، انہماک اور ایمانداری سے انجام دیے جا رہے ہیں۔

ہم اگرچہ تاریخ کے ماہر نہیں ہیں، مگر تاریخ پر رائے دینے کا جمہوری حق تو رکھتے ہی ہیں۔ اسی لئے ہم نے اپنے دوست کا نام کتب الدین رکھ دیا ہے۔ ہم اپنے کتب الدین کو ''قطب الدین'' ایبک پر ترجیح دیتے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ قطب مینار کی چند منزلیں ہیں۔ زیادہ تھیں بھی تو اب چند رہ گئی ہیں۔ گذرتے وقت کے ساتھ شاید اور کم ہو جائیں۔ مگر کتب الدین کا کتب مینار ہر سال ایک دو منزل بلند ہو جاتا ہے۔ قطب مینار کی بلندی گھٹ رہی ہے۔ مگر کتب مینار کی بلندی میں مسلسل اضافہ ہوا جاتا ہے۔

آپ کو شاید حیرت ہو رہی کہ کیا کتاب لکھنا اتنا آسان کام ہے؟ آپ کی حیرت بجا۔ اردو کے آسمان پر مہر منور بن کر جگمگانے والے حضرت غالبؔ کا ایک دیوان ہے۔ اور بس میرؔ کے پانچ سات دیوان ہوں گے۔ میرؔ، غالبؔ، مومنؔ، پطرس مشہور ضرور ہیں مگر قلم کے سامنے عاجز ہیں۔ کتب الدین کے لئے کتاب دینا بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ بلکہ یہ ان کے دائیں اور بائیں دونوں ہاتھوں کا کھیل ہے۔ وہ کسی کتاب یا ادیب پر نظر ڈالتے ہیں تو ایک نئی کتاب بر آمد ہو جاتی ہے۔ بقول شخصے۔۔ ع۔ ۔ نگاہ مرد مومن سے نکل آتی ہیں تحریریں۔

سنا ہے عالم اَرواح میں ہمارے بزرگ شعراء اور ادیب منہ چھپائے پھرتے ہیں۔ لوگ پوچھ لیں کہ حضرت کتب الدین کے کارناموں کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے تو کیا جواب دیں گے۔

یہ بھی سنا ہے کہ تمام آنجہانی شعراء اور ادبا دعا کرتے رہتے ہیں کہ اللہ کتب الدین کی عمر دراز فرما۔ وہ مر کر یہاں آئیں اور ہمارا آمنا سامنا ہو، اس شرمندگی سے ہماری حفاظت فرما۔ وہ اس خوف سے لرزتے رہے ہیں کہ نہ جانے کس لمحے کتب الدین عالم ارواح میں وارد ہو جائے۔

کتب الدین کی سو کے قریب کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہو چکی ہیں۔۔ موصوف فرماتے ہیں کہ زیر طبع کتابوں کی تعداد شائع شدہ کتابوں سے دگنے سے بھی زیادہ ہے دُگنے سے کتنی زیادہ ہے، اس کا اندازہ لگانا دشوار ہی نہیں، بے حد دشوار ہے۔ وہ کس کتاب پر نظر ڈالتے ہیں تو اس میں سے ایک نئی کتاب بر آمد ہو جاتی ہے۔ لوگ ہنستے ہیں۔ مگر یہ ایک فطری امر ہے۔ آخر آدمی کے بطن سے آدمی، جانور کے بطن سے جانور نکلے چلے آرہے ہیں پھر کتاب سے کتاب نکلنے پر حیرت کی کیا بات ہے؟

ہماری باتوں سے آپ مطمئن ہو گئے ہوں گے۔ نہ ہوئے ہوں تو آپ پوچھ سکتے ہیں کہ بھلا موصوف اتنا سارا کیسے لکھ لیتے ہیں۔ آپ نے وہ کہانی ضرور سنی ہو گی۔ ایک مرغا بادشاہ کی بیٹی سے شادی کرنے چلا۔ راستے میں شیر ملا۔ پوچھا مرغ میاں کدھر؟ کہا ''بادشاہ کی بیٹی سے شادی کرنے چلا ہوں'' پوچھا ''میں بھی چلوں؟'' کہا ''بیٹھ میرے کان میں۔ ہاتھی ملا۔ کہا بیٹھ میرے کان میں۔ دریا ملا۔ کہا بیٹھ میرے کان میں۔ سپاہی ملا۔ کہا بیٹھ میرے کان میں۔ بعینہ کتب الدین ہر کسی سے فرماتے ہیں'' بیٹھ میری غزل میں، بیٹھ میرے مضمون میں۔ چنانچہ وہ کسی کی دال روٹی، کسی کی تکا بوٹی۔ کسی کی دراز کسی کی کوتاہ چوٹی سب پر لکھے جاتے ہیں۔ ظاہر ہے جس کا دائرہ کار اتنا وسیع ہو وہ کتنی کتابیں دے گا۔ پس وہ کتابیں دئے جا رہے ہیں۔ وہ کسی فون پر بات کرتے ہوئے مژدہ سناتے ہیں ''ایک گڈ نیوز۔ میری کتاب آ رہی ہے۔'' ہمیں کہنا ہی پڑتا ہے۔'' اچھا ہے۔ آپ فارغ ہولیں۔ مبارکباد!''

ہمارے کتب الدین کسی کے شاگرد نہیں ہیں۔ اس لئے اُن کی تحریروں میں اس بات کے شواہد نہیں ملتے کہ موصوف نے کسی شاعر، کسی ادیب سے استفادہ کیا ہو۔ ایسا بھی نہیں ہے کہ کسی کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ کس کی بات سنیں نہ سنیں۔ ندا فاضلی کی ایک بات گرہ میں باندھ لی ہے کہ

اوروں کے کندھوں پر چڑھ کے اپنے کندھے جھٹکو،

اِدھر اُدھر مت بھٹکو۔

چنانچہ وہ باغ اُردو میں کبھی 'ل' کے کندھوں پر چڑھ کر کندھے جھٹکتے ہیں، کبھی 'م' کے کندھوں پر اچکتے ہیں۔ کبھی 'ن' کی دستار پر بیٹھ کر مٹکتے ہیں۔

ہم نے اپنے ادیب دوستوں کی بے دماغی دیکھی ہے۔ ان کا حال محمد علوی نے یوں لکھا ہے۔۔ ۔ ع سنا ہے سیّد سے خاں ہوئے ہیں۔

مگر ہمارے کتب الدین جی ہاں جی ہاں ہوئے ہیں۔ اس لئے ارباب اقتدار کے کندھوں پر پائے جاتے ہیں۔ اور ہم ایسے بے دماغوں سے پوچھتے ہیں۔ میں کہاں ہوں؟

ہم بس یہ کہتے ہیں ''جی! آپ 'م' کے کندھے سے اچھل کر 'ن' کے کندھے پر جا بیٹھے ہیں۔ آپ کی اچھل کود یوں ہی جاری رہی تو ابجد ختم ہو جائے گی۔ تب آپ غریب غالبؔ کا یہ مصرع پڑھیں گے۔

ہے کہاں تمنا کا دوسرا قدم یارب!
ہم زندہ ہیں تو یہ دیکھنے کے لئے کہ۔ ۔۔
دکھاتا ہے رنگ آسماں کیسے کیسے
ہوتی آئی ہے کہ دنیا اچھوں سے خوش نہیں ہوتی چنانچہ ایک ایسے ہی ناخوش آدمی کا تبصرہ یہ ہے کہ برق رفتار سفر کے باوجود کتب الدین وہیں کھڑے ہیں۔ جہاں روز اوّل پائے جاتے تھے۔ ہم نے کہا ’’یہ کیسے ممکن ہے؟‘‘ فرمایا ایک شخص کی کار سر شام بگڑ کر ایک جگہ کھڑی ہو گئی۔ اُس شخص نے گاڑی جیک پر چڑھائی۔ کار درست کی۔ پھر کار دوڑانی شروع کی۔ رات بھر کار فر اٹے بھرتی رہی۔ صبح ہوئی تو معلوم ہوا کہ موصوف رات بھر سفر کرنے کے بعد بھی وہیں ہیں جہاں سر شام پائے جاتے تھے۔ در اصل کار جیک پر چڑھی ہوئی تھی۔
یہی حال کتب الدین کا ہے۔
ہماری دعا ہے کہ کتب الدین اندھیرے کے فریب سے نکل آئیں۔ روشنی میں سفر کریں اور واقعی نئی نئی منزلیں طے کرتے ہوئے آگے بڑھیں۔ آمین
(آئینۂ خنداں۔ ۲۰۱۹)

شکیل اعجاز

شکیل اعجاز ۲ جولائی ۱۹۵۴ کو اکولہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد غنی اعجاز کہنہ مشق شاعر تھے۔ شکیل اعجاز طنز و مزاح نگار اور مصور کے طور پر مشہور ہوئے۔ ’’در اصل‘‘(۱۹۸۳) اور ’’چھٹی حس‘‘ (۱۹۹۴) ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ اسی رنگ میں ایک ناول ’’تیری قربت کے لمحے‘‘ بھی شائع ہو چکا ہے۔ ان کی کتابیں ’’اوراق مصور‘‘ اور ’’سورج کی تلاش میں‘‘ علاقائی فنکاروں کے تعارف پر مبنی ہیں۔ بارسی ٹاکلی میں تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد سبک دوش ہوئے۔ ان کی تحریریں معیاری ظرافت کا نمونہ ہیں۔ ان کا بے تکلف اسلوب اور واقعاتی مزاح قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔
ماہنامہ شگوفہ حیدر آباد نے ان کے متعلق ایک خصوصی گوشہ شائع کیا تھا۔ شکیل اعجاز کا ایک مزاحیہ مضمون ’’لیٹر پیڈ‘‘ مہاراشٹر کی بارہویں جماعت کی درسی کتاب میں شامل ہے۔

لیٹر پیڈ

شکیل اعجاز

آپ جس جگہ تشریف رکھتے ہیں وہاں سے سامنے کی برتھ پر سیدھی طرف دیکھیے، وہ جو، کھڑکی کے پاس نوجوان بیٹھا ہے۔ کیسا معصوم صورت دکھائی دیتا ہے لیکن اس کے دل میں بھی یہ خواہش ہو سکتی ہے کہ سامنے بیٹھے ہوئے گنجے کے سر پر چپت رسید کرے اور واپس اسی بے نیازی سے بیٹھا رہے لیکن وہ گنجے کے صحت مند جسم کے آس پاس بیٹھے پہلوانوں سے ڈرتا ہے۔ جہاں دونوں نہیں ہوں گے وہ اپنی خواہش پوری کرے گا۔ شیطانی خواہشیں ہم میں موجود ہوتی ہیں۔ ہم انہیں رسیوں سے باندھ کر اندھیری کوٹھری میں ڈال دیتے ہیں تاہم جب کبھی موقع ملتا ہے رسیاں تڑانے کی کوشش شروع ہو جاتی ہے۔ کئی نامور ادیب و شعراء کے بارے میں پڑھا ہے کہ وہ مختلف شیطانی خواہشات دلوں میں پالتے تھے۔ چوری کرنے کے شوقین کوئی صاحب اگر جبراً تعلیم یافتہ بنا دیے گئے ہو تو کتابیں چرا کر تسکین پا لیتے ہیں کہ کسی نے پکڑ بھی لیا تو سزا دینے کی بجائے اور مزید کتابیں ہی دے دے گا۔ ذوق مطالعہ سے متاثر ہو کر ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ شریف النفس نظر آنے والوں میں بیشتر کے دلوں میں مجرمانہ خیالات کبھی نہ نکلنے والے کرایہ داروں کی طرح مقیم ہوتے ہیں۔
اگر آپ کے دماغ میں بھی یہ خیال سانپ کی طرح سرسرانے لگا ہو کہ کسی کے ساتھ دغا فریب کریں اور قانون سے بچے بھی رہیں تو اس کا آسان طریقہ یہ ہے کہ لیٹر پیڈ چھپوا لیجیے۔ فی الحال اس سے زیادہ دھوکہ باز چیز کوئی اور نہیں، یقین نہ ہو تو

ایک خوبصورت لیٹر پیڈ والا خط نکالیے۔ اور صاحب لیٹر پیڈ سے ملنے جائیے۔ واپس لوٹیں گے تو جھنجھلاہٹ کے چلو بھر پانی میں ڈوب مرنے کی کوشش کر رہے ہوں گے۔ آپ کے تصورات کا شیش محل حقیقت کے ایک ہی پتھر سے پاش پاش ہو چکا ہو گا۔ اس لئے کہ لیٹر پیڈ جتنا چکنا تھا وہ اتنے ہی کھردرے نکلے۔ یہ جتنا نفیس، وہ اتنے ہیں گندے، یہ جتنا کشادہ، وہ اتنے ہی کوتاہ دل، پھر آپ نے ہمت کر کے سوال کا ایک چابک ان کے کانوں پر رسید بھی کر دیا کہ۔۔ ۔۔ ۔۔

آپ اسی طرح رہتے بستے ہیں تو ایسا دھو کے باز لیٹر پیڈ کیوں چھپوایا؟

دو ٹوک جواب کے مضبوط ہاتھ آپ کو پوری طاقت سے شرمندگی کے کیچڑ میں اوندھے منہ گرا دیں گے۔

ہم میں جو نفاست اور دلکشی تھی اس پر صرف کر دی۔ آپ ہی بد ذوق اور نا سمجھ ہیں کہ لیٹر پیڈ دیکھ کر ملاقات کرنے چلے آئے۔ کل آپ یہ بھی کریں گے کہ اسٹیج پر کسی کو اکبر اعظم کا رول کرتے دیکھ کر فوراً جاگیر مانگنے چلے جائیں گے۔

آپ بے بس ہیں نہ پولیس میں رپورٹ لکھوا سکتے ہیں نہ ان کو پکڑ کر پیٹ سکتے ہیں۔ کہاں لکھا ہے اچھا لیٹر پیڈ چھپوانا جرم ہے۔

حالات زمانے کا شکار ہوتے رہتے ہیں۔ کبھی یہ دستور تھا کہ گھوڑا رکھنا شان سمجھا جاتا تھا۔ گھر میں چوری کرنے جیسا کچھ نہ ہو تب بھی دربان بِٹھانا وضع داری میں داخل تھا۔ اور لیٹر پیڈ چھپوانا باعث افتخار سمجھا جانے لگا ہے۔

دل کی سرزمین غلط فہمیوں کے درختوں کے لیے بڑی زرخیز ہوتی ہے اب یہ غلط فہمی بھی اپنی جڑیں مضبوط کر چکی ہے کہ لباس اور مکان کی طرح لیٹر پیڈ سے بھی شخصیت ابھرتی ہے۔ بعض لوگ اس مردم شناسی میں طاق ہوتے ہیں۔ لیٹر پیڈ سے شخصیت کے اظہار والی بات مشہور ہونے سے یہ نقصان ہوا کہ لوگ شخصیت کی بجائے صرف لیٹر پیڈ سنوارنے پر صلاحیتیں صرف کرنے لگے۔ ایک سے ایک خوش رنگ، خوش بو اور خوش قیمت لیٹر پیڈ چھپنے لگے اس سے سب کا تاثر ختم ہو گیا۔

بالکل اسی طرح جیسے الفاظ کے مسلسل استعمال سے ہوتا ہے۔ سب واقف کہ السلام علیکم! کا مفہوم تم پر سلامتی ہوتا ہے تاہم دل میں صد فیصد نفرت رکھ کر سلام کرنے والوں کی کمی نہیں۔ خود آپ نے کئی دفعہ کسی ناپسندیدہ شخص سے ہاتھ ملاتے ہوئے بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر کہا ہو گا اور مقابل نے بھی یقین کر لیا ہو گا کہ آپ کو قطعی خوشی نہیں ہوئی۔

گیارہویں جماعت میں ٹیچر نے ایک دن کہا کہ کل سے گیدرنگ شروع ہو رہی ہے یونیفارم کے بجائے عام لباس میں آ سکتے ہیں۔ دوسرے دن سے ہم میں قیمتی کپڑوں کے مقابلے شروع ہو گئے۔ ہر ایک کی یہی خواہش کہ سب سے منفرد دکھائی دے۔ ہمارے ایک دوست نے سوتی کپڑے کا پاجامہ کرتا اور مرزا غالبؔ ٹائپ ٹوپی سلوائی، شوز کے زمانے میں کہیں سے کھڑاوں لے آئے اور نہ صرف کلاس میں بلکہ پورے اسکول میں سب سے منفرد ٹھیرے۔ ایک سیدھے سادھے لباس نے قیمتی لباسوں کی چمک دمک ماند کر دی تھی۔ لیٹر پیڈ کا بھی یہی معاملہ ہوا۔ جب ساری شان و شوکت پیڈ پر سمٹ آنے لگی تو کسی نے سادے کاغذ پر مختصر سا نام پتہ لکھوا لیا اور ہزاروں کی بھیڑ سے الگ نظر آیا۔ آج کل پیڈ پہیلیوں کی شکل میں بھی آنے لگے ہیں۔ کسی پر صرف ایک چڑیا بنی ہے۔ آپ پہچانیے کہ یہ فلاں شاعر کا ہے۔ کسی پر چھری ہے آپ سوچیے کہ یہ تنقید نگار کا ہے۔ بعض پیشوں سے مناسبت رکھتے ہیں، چنانچہ کسی پر قینچی اور استرا بنا ہوتا ہے۔ بہت سے لوگ لیٹر پیڈ چھپوا کر مشکل میں پڑ جاتے ہیں اور بادل ناخواستہ خطوط لکھتے رہتے ہیں۔ عموماً اس قسم کے لوگ اخبارات میں مراسلے اور ریڈیو فرمائشیں بھیجتے ہیں۔ ایک روپیہ بچانے کے لئے دس روپے خرچ کرنے والی بات آپ نے سنی ہو گی۔ اس کا عملی تجربہ کرنا ہو تو کسی کو لیٹر پیڈ چھپا کر دے دیجئے وہ اپنا سارا پیسہ بہت احتیاط سے ڈاک ٹکٹوں پر خرچ کرے گا۔ خطوط کے لیے موضوع کی تلاش کریں گے۔ کہیں بھیڑ دکھائی دی اور یہ اس امید پر وہاں لپکے کہ کسی کا قتل ہو گیا ہو گا پھر یہ دیکھ کر اداس ہو گئے کہ یہ تو ناقابل تحریر معمولی خراش والا معاملہ ہے۔ تھک ہار کر پڑوسیوں کو آپس میں لڑوا دیا اور فریقین کے رشتے داروں کو لیٹر پیڈ سے مطلع کر کے اطمینان کی سانس لی۔ یہ ساری بھاگ دوڑ صرف اس لئے کہ لیٹر پیڈ پڑے پڑے خراب نہ ہو جائے۔ یہ بھی کنجوسی کی ایک قسم ہے۔ ہم نے اپنے ایک کنجوس دوست کو سر درد کی دس ٹکیاں یہ کہہ کر دے دیں کہ ایک ماہ بعد بے کار ہو جائیں گی۔ دوسرے دن وہ دکانوں پر پوچھتے پھر رہے تھے کہ صاحب سر میں درد اٹھنے کی گولیاں ہوں تو دیجیے۔ مہینہ بھر تک سر میں درد اٹھنے کی دعا صدق دل سے کرتے رہے۔ کنجوس لوگ یوں بھی دلچسپ ہوتے ہیں۔ ایک صاحب ٹیلی گراف ڈپارٹمنٹ سے ریٹائرڈ ہوئے تو اور معاملوں کے علاوہ بات کرنے میں بھی کنجوس ہو گئے تھے۔ دس سوالوں کا ایک جواب دیتے، جیسے زیادہ بولیں گے تو چارج بڑھ جائے گا۔ بکواس کرنے والوں کو فضول خرچ کہا کرتے تھے۔

کوئی شخص رشتے داروں کی کوششوں سے میٹرک پاس ہو جائے تو سرٹیفکیٹ فریم کروا کر دیوار پر لگایا جاتا ہے۔ کسی کی ایک آدھ تصویر فوٹو گرافر کی لغزش سے اچھی نکل آئے تو اسے ڈرائنگ روم میں بارہ سینگھوں کے سینگ یا شیر کی کھال کی طرح سجاتا ہے۔ ایک کہنہ مشق لیکن بے تکے شاعر کے گھر میں ایک فریم اہتمام سے لگی دیکھ کر پوچھا تو پتہ چلا کہ کسی ایسے نقاد نے، جو اچھے اچھوں کو شاعر نہیں مانتا، ان پر ترس کھا کر دو تین تعریفی جملے لکھ دیے تھے۔ اسی طرح جو لوگ کافی تگ و دو اور منت سماجت سے دو ایک انجمنوں کی صدارت۔۔ ۔ یا سکریٹریٹ سے جھولی بھرنے میں کامیاب ہو جاتے

ہیں وہ لیٹر پیڈ میں اس کا ذکر ضرور کرتے ہیں۔ بلکہ ذکر کے لئے ہی پیڈ چھپاتے ہیں۔ برسوں بعد ایک دوست کا خط ملا تو ہم بہت حیران ہوئے۔ پیڈ پر ان کے نام کے نیچے جلی حروف میں یہ لکھا تھا۔

صدر اور سکریٹری انجمن نصیب ماراں اسکول لائف میں وہ بڑے مظلوم سے تھے۔ اچانک اتنے سرگرم کیسے ہو گئے کہ صدر اور سکریٹری بننے لگے۔ چھان بین پر پتہ چلا کہ یہ جس انجمن کے صدر ہیں اس میں دو ہی ممبر ہیں۔ ایک تو یہ خود ہیں اور دوسرے بھی یہی خود ہیں۔ ہمیں یقین ہے کہ لیٹر پیڈ پر جن کمیٹیوں اور انجمنوں کا ذکر ہوتا ہے ان میں سے بیشتر ایسی ہی ہوتی ہیں۔ ایسے پیڈ عہدوں سے بھرے ہوتے ہیں۔ خط لکھنے کے لیے ذرا سی جگہ بچ رہتی ہے۔ اور اگر عدم خود اعتمادی یا احساس کمتری کا آتش فشاں پھٹ نہ پڑا تو سابق عہدوں کا بھی تذکرہ ہوتا ہے جیسے

سابق اسکول کیپٹن پرائمری اسکول نمبر 3

ان میں سابق بہت چھوٹے قلم سے لکھا ہوتا ہے

ممکن ہے مستقبل میں ایسے پیڈ بھی چھپیں جن میں آئندہ عہدوں کا تذکرہ ہو۔

گورنر آف دی اسٹیٹ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ (مستقبل)

نوبل پرائز یافتہ۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ (مستقبل)

دنیا کا سب سے اچھا اور عقلمند آدمی۔ ۔۔ ۔۔ ۔ (مستقبل)

تیسرے درجے کا عشق پیڈ کے بغیر ادھورا ہے۔ یہ نامہ بر کی ترقی یافتہ شکل ہے۔

عشق جتنا سطحی ہو گا پیڈ اتنا قیمتی ہو گا۔ بیروزگار عاشق دکانوں پر پیڈ تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ کامیاب تاجر وہی ہو گا جو گاہک کی دکھتی رگ پکڑ سکتا ہو۔ چنانچہ کمپنیاں خصوصی پیڈ تیار کرتی ہیں۔ جن میں عمر خیام، بیل باٹم پہنے، ایک ہاتھ میں سگریٹ اور دوسرے ہاتھ میں خالی گلاس لئے (جو عمر خیام نے بے خودی میں الٹا پکڑ رکھا ہے۔) لڑکی کی طرف غصیلی نظروں سے دیکھ رہے ہیں۔ ہاتھ میں ایک صراحی ہے جس کے ٹوٹی اور پیندا نہیں ہے۔ وہ فرط مسرت سے ایسی دیوانی ہو چکی ہے کہ الٹے گلاس کی بجائے سگریٹ میں انڈیل رہی ہے۔ سچا عشق وہی جو بس بھروسہ کر لیتا ہے۔ دلائل نہیں مانگتا۔ اس لئے عاشق و معشوق پر لازم ہے کہ وہ اس طرف توجہ نہ دے کہ عدم پیندگی کے باوجود صراحی سے گڑ کی چائے کیوں نکل رہی ہے۔ محبت سچی ہو تو صراحی کو پیندے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ جنگل کے سارے پھول اڑ اڑ کر دونوں کے پاس آ گئے ہیں۔ پس منظر میں سورج کی روشنی پھیلی ہوتی ہے اور بادلوں سے چاند نکل رہا ہے۔ بارش زوروں سے ہو رہی ہے۔ کمپنیوں کے مالک بھلے ہی جاہل ہوں مگر اس راز سے واقف ہیں کہ اشعار میں جادو ہوتا ہے۔ وہ پڑھے لکھے کو بلا کر کسی بڑے شاعر کے شعر کی نمائش کرتے ہیں۔ پڑھا لکھا غور سے دیکھتا ہے کہ عمر خیام زمین پر بے چینی کے عالم میں بیٹھے ہوئے ہیں۔ لڑکی کے گلے میں زنجیر لٹک رہی ہے۔ اور یہ شعر لکھ دیتا ہے

اسپ تازی شدہ مجروح بہ زیر پالان

طوق زریں ہمہ در گردن خر می بینم

دونوں شعر پڑھتے اور سر دھنتے ہیں۔ (شعر سمجھ میں نہ آئے تو سر دھننے میں زیادہ لطف آتا ہے۔)

کوئی صاحب غلط فہمی کے مسحورکن بازوؤں میں سمٹے نہ رہیں کہ لیٹر پیڈ ترقی یافتہ دور کی دین ہے۔ یہ تو اسی وقت وجود میں آ گیا تھا جب انسان نے لکھنا شروع کیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ آج کا لیٹر پیڈ کاغذ سے بنتا ہے، پرانے وقتوں میں چٹانوں اور پہاڑوں سے بنتا تھا۔ وہ زیادہ پائیدار ہوتا تھا۔ نہ پھٹنے جلنے کا خدشہ، نہ تحریریں مٹ جانے کا ڈر، ہزاروں سال پرانے یہ لیٹر پیڈ چٹانوں اور پہاڑوں کی صورت میں آج بھی محفوظ ہیں اور قیامت تک رہیں گے۔

تاریخ نویسوں نے قدیم شہنشاہوں کے بارے میں یہ افواہ پھیلا رکھی ہے کہ انہیں عمارتیں بنوانے کا شوق تھا۔ در اصل انہیں لیٹرپیڈ بنوانے کا شوق تھا۔ یقین نہ آئے تو لال قلعہ، اشوک کی لاٹ، تاج محل، قطب مینار اور دوسری عمارتیں دیکھ آئیے۔ وہاں جا بجا آپ کو تحریریں دکھائی دیں گی۔ تاج محل کو بھلے آپ مقبرہ کہیں ہم تو لیٹر پیڈ کہیں گے۔ دیکھیے کیسا خوبصورت خوب رنگت اور خوب قیمت لیٹر پیڈ ہے۔

(چھٹی حس۔ ۱۹۹۴)

شیخ رحمٰن اکولوی

شیخ رحمان اکولوی، یکم جولائی ۱۹۵۱ کو اکولہ میں پیدا ہوئے۔ طنز و مزاح نگار کے طور پر مشہور ہیں۔ انھوں نے افسانے

اور بچوں کے لئے کہانیاں بھی لکھی ہیں۔ ’’بلا عنوان، الف سے قطب مینار، ناٹ آؤٹ، سر خاب کے پر، تبسم زیرِ لب‘‘ ان کی ظریفانہ نگارشات کے مجموعے ہیں۔ ان کے فنی و شخصی کوائف پر مشتمل کتاب شیخ رحمٰن اکولوی، ایک مطالعہ، مرتبہ یعقوب الرحمٰن منظرِ عام پر آ چکی ہے۔

شیخ رحمٰن ودربھ کے پیش رو مزاح نگاروں میں شامل ہیں۔

شیخ رحمٰن اکولوی نے عصری زندگی کی ناہمواریوں کو اپنی تحریروں میں طنز یہ انداز میں پیش کیا ہے۔ ان کے ہاں مشاہدے کی گہرائی، اپنا مذاق اڑانے کا ظرف اور مزاحیہ صورتِ حال کو مبالغے کے ساتھ پیش کرنے کا ہنر موجود ہے۔

’’عکسِ شعور‘‘ اور ’’سنو بچو‘‘ اور ’’پیاری پیاری کہانیاں‘‘ ان کی دیگر کتابیں ہیں۔

اٹھنا بیٹھنا

شیخ رحمان اکولوی

پیدائش کے وقت انسان کا زیادہ تر وقت لیٹنے میں گزرتا ہے اور جب وہ دنیا سے اٹھتا ہے تو ہمیشہ کے لیے لیٹ جاتا ہے۔ سب سے پہلے وہ بیٹھنا اور پھر اٹھنا سیکھتا ہے اور اس کی زندگی متحرک ہوتی ہے۔ گویا بیٹھنا اٹھنا انتہائی اہم افعال ہیں ان کے بغیر زندگی کا تصور بھی محال ہے۔ بچے کے اٹھنے بیٹھنے ہی سے بزرگ اس کے مزاج کا، اس کے رجحان کا اندازہ کر لیتے ہیں۔

ایک بچہ نچلا نہ بیٹھتا تھا۔ سارے گھر میں اِدھر اُدھر دوڑا پھرتا اور تباہی پھیلاتا۔ کبھی پانی کی مٹکی پھوڑ دی کبھی صابن پانی میں ڈال دی۔ کبھی آئینہ توڑ دیا تو کبھی دودھ زمین پر گرا دیا۔ ایک بزرگ نے اس کی یہ حرکتیں دیکھی تو پیشن گوئی کر دی کہ یہ بچہ لیڈر بن کر ملک و قوم کا ستیا ناس کرے گا۔ یہ پیشن گوئی مستقبل میں صحیح ثابت ہوئی۔

لیڈر اور سماج سیوک اپنی بات منوانے کے لیے اور پبلسٹی حاصل کرنے کے لیے آخری حربے کے طور پر ’اَن شَن‘ پر بیٹھتے ہیں۔ اکثر و بیشتر اپنے مقاصد کے حصول میں کامیاب بھی ہو جاتے ہیں لیکن بعض اوقات پانسہ الٹا پڑ جاتا ہے اور لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں اور جان بچانے کے لیے ساڑھی لپیٹ کر مجمع سے بھاگنا پڑتا ہے یا پھر بوکھلاہٹ میں الٹے سیدھے بیانات دینے پڑتے ہیں۔ مثلاً رشوت خور کو طمانچہ مارنا بری بات نہیں یا ’’کیا ایک ہی طمانچہ مارا۔‘‘ وغیرہ وغیرہ۔

الیکشن میں کھڑے ہونے سے زیادہ بیٹھنے میں فائدہ ہے۔ بعض لیڈروں کا تو یہ باقاعدہ شریفانہ بزنس ہے۔ وہ کسی حلقہ انتخاب سے پرچہ نامزدگی بھر کر الیکشن میں کھڑے ہو جاتے ہیں اور جن دو افراد میں کڑا مقابلہ ہوتا ہے ان دونوں ہی حضرات سے اچھی خاصی رقم اینٹھ کر بیٹھ جاتے ہیں۔ ان لوگوں کو پیسہ مل جاتا ہے (اور پبلسٹی تو مل ہی جاتی ہے۔) اس کے علاوہ الیکشن میں ہار کر ذلت نہیں اٹھانی پڑتی ہے جیتنے والے لیڈر کی قربت حاصل ہوتی ہے۔ جسے مختلف کام کروا کر کیش (Cash)کیا جا سکتا ہے۔ (اسے کہتے ہیں پانچوں انگلیاں گھی میں اور سر کڑھائی میں۔)ایک صاحب نے الیکشن میں کھڑے ہونے اور بیٹھنے سے متعلق عجیب و غریب رویہ اپنایا۔ آپ نے بھی سنا ہو گا کہ ایک سردار جی (غالباً دہلی کے تھے۔) ہر الیکشن میں کھڑے ہو جاتے تھے اور خود اپنے ہی خلاف پرچار کرتے تھے کہ لوگ انہیں ووٹ نہ دیں۔ مزے کی بات یہ ہے کہ الیکشن جیتنے اور ہارنے والوں کے نام تو ذہنوں سے اتر گئے لیکن یہ سردار جی ہر خاص و عام کی یادداشت میں محفوظ ہو گئے۔ (اسے کہتے ہیں ہینگ لگے نہ پھٹکری اور رنگ بھی آئے چوکھا۔)

بیٹھنے کی ضرورت اور اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ گھر میں کھانے کا کمرہ، مطالعہ کا کمرہ اور سونے کا کمرہ الگ سے ہو یا نہ ہو ایک عدد بیٹھک ضرور ہوتی ہے۔ یہ کمرہ داخلی دروازے سے لگا ہوتا ہے۔ اس کے کئی فائدے ہیں۔ آنے والا بیٹھک میں ہی رُک جاتا ہے۔ گھر کے اندرونی حصے تک اس کی رسائی نہیں ہوتی۔ گھر کے اندر کا ماحول ڈسٹرب نہیں ہوتا۔ جو سامان کی اَبتری، میلے کپڑوں کا بکھراؤ، بچوں کی دھینگا مستی اور بدتمیزی، عورتوں کا ایک دوسرے پر طعنہ زنی کرنا یا جلی کٹی باتیں کرنا ان سب سے مہمان نا آشنا ہوتا ہے۔ فیملی کی امیج خراب نہیں ہوتی، رسوائی نہیں ہوتی۔ کچھ لوگ سخت نشین ہوتے ہیں بیٹھتے ہیں تو اٹھنے کا نام ہی نہیں لیتے۔ ایک دن ہم دفتر سے لوٹے تو دیکھا کہ بیگم پریشان دکھائی دے رہی ہیں۔ ہم نے وجہ پوچھی تو بولیں۔ ’’خالہ دو گھنٹوں سے آئی ہوئی ہیں اور لگاتار باتیں کیے جا رہی ہیں۔ اٹھنے کا نام نہیں لے رہی ہیں۔ ان

کی باتوں سے میرے سر میں درد ہونے لگا ہے۔ ’’پھر ہاتھ نچا کر بولیں۔ ’’آپ خود کو بہت اسمارٹ سمجھتے ہیں نا، ذرا ان خالہ سے نمٹ لو تو جانوں۔‘‘ ہم نے کہا۔ ’’بیگم یہ تو ہمارے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔‘‘ ہم نے خالہ کو سلام کیا اور حیرت بھرے لہجے میں ان سے کہا۔ ’’خالہ آپ یہاں بیٹھی ہیں اور وہاں نگر پالیکا والوں نے پچھلے دو گھنٹوں سے پانی چھوڑ رکھا ہے۔‘‘ خالہ نے جیسے ہی پانی کا سنا جھٹ سے روانہ ہو گئیں یہ بڑبڑاتے ہوئے۔ ’’تمہاری بیوی کی باتوں میں مجھے کچھ نہیں سوجھتا۔‘‘

بعض لوگ ایسے ہیں کہ جلدی بیٹھتے ہی نہیں۔ ہماری کتاب کا تھوڑا سا کام باقی تھا۔ ہم نے بائنڈر سے پوچھا۔ ’’کب تک ہو جائے گا یہ کام۔ اس نے کہا۔ ’’ساب! کرنے بیٹھوں گا تو یہ بس ایک گھنٹے کا کام ہے۔‘‘ اور واقعی اس نے وہ کام ایک گھنٹے میں نمٹا دیا، چھ مہینوں بعد۔

بعض لوگوں کو ٹھیک سے بیٹھنا بھی نہیں آتا۔ دولہے کی امّاں کا اور دولہن کے ابا کا، جو کہ پہلوان تھے، دلی ارمان تھا کہ دولہا گھوڑی پر سوار ہو کر عقد کے لیے آئے لہٰذا گھوڑی ہائر کی گئی دولہے راجا گھوڑی پر سوار، بینڈ باجا اور بارات کے ساتھ مقامِ عقد کی سمت بڑھے چلے جا رہے تھے۔ چورا ہے پر پٹاخے چھوٹنے لگے۔ پٹاخوں کی آواز سے گھوڑی بدک گئی اس نے دولہے میاں کو اچھال دیا۔ وہ زمین پر گر پڑے۔ بڑی مشکل سے گھوڑی کو قابو میں کیا گیا۔ پہلوان کو تاؤ آ گیا انھوں نے یہ کہہ کر رشتے کے خاتمے کا اعلان کر دیا جو نوجوان گھوڑی پر ٹھیک سے بیٹھ نہیں سکتا وہ پہلوان کی بیٹی کو کیسے ہینڈل کرے گا۔ کبھی کبھی صورتِ حال ایسی بھی ہو جاتی ہے۔ سکندر علی وجدؔ نے مشاعرہ میں غزل سنائی۔ جب وہ مقطع پر پہنچے:

دو سو برس میں وجدؔ و سراجؔ و ولیؔ کے بعد\
اٹھے ہیں جھومتے ہوئے خاکِ دکن سے ہم

تو ایک منچلے نے فقرہ کسا۔ ’’جھومتے ہوئے اٹھنے میں دو سو برس لگ گئے سیدھے سیدھے اٹھتے تو شاید جلدی اٹھ جاتے۔‘‘

یہ تو ہمیں معلوم تھا کہ اسکول میں بچوں کی دی جانے والی سزاؤں کی ابتدا اُٹھک بیٹھک کرانے سے ہوتی ہے لیکن عشق میں عاشق کو اُٹھک بیٹھک کرنا پڑتا ہے یہ معلوم نہ تھا۔ دلؔ شاہ جہاں پوری کا یہ شعر دیکھئے:

نہ وہ آرامِ جاں آیا نہ موت آئی شبِ وعدہ\
اسی دھُن میں ہم اٹھ اٹھ کر ہزاروں بار بیٹھے ہیں

’’بیکار بیٹھنا‘‘ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ بیکار بیٹھنے والے شخص کو کوئی اچھی نظر سے نہیں دیکھتا۔ عاشق اور معشوق نے مصروف رہنے کے لیے کیا مشغلہ اپنایا ہے ملاحظہ فرمائیں:

وہ مشغولِ ستم ہیں اور ہم مصروفِ ضبط اے دل\
نہ وہ بیکار بیٹھے ہیں نہ ہم بیکار بیٹھے ہیں (دلؔ شاہ جہاں پوری)

بیٹھنا اور اٹھنا، لازم و ملزوم ہیں جیسے بیوی کا شوہر کو ہر وقت شک کی نظر سے دیکھنا اور شوہر کا ہر وقت موقع کی تاک میں رہنا۔ ذرا سوچیے: اگر مرغی انڈوں پر نہ بیٹھے تو؟ خاص آدمی ’’چکن‘‘ سے اور عام آدمی انڈے سے محروم ہو جائے گا اور ہماری حکومت جو آئے دن کہتی رہتی ہے کہ سنڈے ہو یا منڈے روز کھاؤ انڈے۔ وہ کیا کہے گی؟(کیا کرے گی) یہ قابلِ غور بات ہے کہ ہماری حکومت بس یہی ایک چیز عوام کو کھانے کے لیے کہتی ہے۔ شاید اس لیے کہ اسے بغیر روٹی کے بھی اُبال کر یا تل کر کھایا جا سکتا ہے۔ عوام ’’روٹی‘‘ کا مطالبہ نہیں کر سکتے۔ جانوروں کے ہاں بھی اٹھنے بیٹھنے کی بڑی اہمیت ہے۔ عربی النسل گھوڑے کو دوسرے عام گھوڑوں پر اس لیے بھی فضیلت حاصل ہے کہ وہ کبھی بیٹھتا نہیں۔ ہمارا قلم بیٹھنا چاہتا ہے اس لیے رکھتے ہیں۔

محمد اسد اللہ

محمد اسد اللہ، وروڈ ضلع امراؤتی، میں ۱۶، جون ۱۹۵۸ کو پیدا ہوئے۔ ایم اے کے علاوہ اردو انشائیوں کا تاریخی و تنقیدی جائزہ کے موضوع پر تحقیق کر کے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ناگپور کے ایک جونیر کالج میں تدریسی خدمات انجام دے کر سبک دوش ہوئے۔

محمد اسد اللہ بنیادی طور پر انشائیہ نگار ہیں لیکن انھوں نے ظریفانہ مضامین بھی لکھے ہیں۔ ’’پر پرزے‘‘ اور ’’ہوائیاں‘‘ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ انشائیوں کی تنقید اور تحقیق سے متعلق ان کی کتابیں، انشائیہ کی روایت، مشرق و مغرب کے تناظر میں‘‘ ، انشائیہ شناسی اور یہ ہے انشائیہ شائع ہو چکی ہیں۔ ان کی چند نگارشات درسی کتابوں میں شامل ہیں۔

مہمانوں کا سیلاب
محمد اسد اللہ

مہمان نوازی کی روایت بہت پرانی ہے۔ صدیوں کے اس سفر میں مہمان بننے اور بگڑ نے کے کئی مراحل سے گزر چکا ہے۔ اس دوران اس نے میزبان کو سبق سکھایا ہو نہ ہو اس سے نمٹنے کا گر ضرور سیکھ لیا ہے۔ اب مہمان یہ اچھی طرح جانتا ہے کہ کب کس میزبان کو فون پر اطلاع دے کر اسے اس کے گھر میں پا بہ زنجیر کرنا ضروری ہے اور کہاں اچانک بارش کی طرح جا دھمکنا چاہئے کہ میز بان کو نہ بھاگنے کی مہلت ملے نہ رستہ۔
بعض لوگ گھر میں قدم رکھتے ہی یہ جان لیتے ہیں کہ گھر میں کس قسم کا نظامِ حکومت رائج ہے۔ شوہر کے جہانِ دل پر بیگم کی حکومت ہو تو چائے اور کھانوں کی لگا تار تعریف میزبان کے دل اور گھر دونوں میں جگہ بنانے کے لئے کافی ہے۔ گھر میں میاں کا سکہ چلتا ہو تو اس کے بچوں یا کتوں (جو بھی زیادہ عزیز ہو) کو سراہنا گھر میں ٹکے رہنے کے لئے ضروری ہے۔ مہمان بارش کے قطرہ کی طرح تنہا نہیں آتا۔ بھلا بارش اپنے قطروں کو کسی اور مقام پر چھوڑ کر کیسے آسکتی ہے۔ مہمان جب آتا ہے تو میزبان مرزا غالبؔ کی زبان میں کاتبِ تقدیر سے ایک چھوٹا سا سوال پوچھتا رہ جاتا ہے۔
کس کے گھر جائے گا سیلابِ بلا میرے بعد؟
گرمیوں کی تعطیلات میں پانی کی قلت اور شادیوں کی کثرت عام ہے۔ ہمارے علاقے میں شادی کے دعوت ناموں پر یہ شعر بھی لکھا جاتا ہے۔
اے بادِ صبا کچھ تو نے سنا مہمان جو آنے والے ہیں
کلیاں نہ بچھانا راہوں میں ہم پلکیں بچھانے والے ہیں
بس اس شعر کو پڑھ کو مہمانوں کا سیلاب امڈ پڑتا ہے۔ عزیز و اقارب کو شادی میں مدعو کرنا میزبان کی مجبوری ہے کہ اسی رسمِ دنیا کو عزت سپلائی کرنے کا ٹھیکا سماج کی جانب سے ودیعت ہوا ہے۔ وہ غریب دل ہی دل میں ڈرتا ہے کہ تمام مہمانوں کو دعوت دی گئی اور سب شریک ہو گئے تو مہمانوں کا یہ سیلاب دیکھ کر اس آنکھیں مارے حیرت کے کتنی ہی کیوں نہ پھیل جائیں، پلکیں اس قدر ہر گز وسیع نہیں ہو سکتیں کہ ان پر تمام لوگ سما سکیں۔ بعض میز بان اس صورتِ حال کو ٹالنے کے لئے دعوت نامے اس خوبصورتی سے پوسٹ کرتے ہیں کہ نکاح ۳۱ مارچ کو ہے تو دعوت نامہ ایک اپریل کو مہمان کے ہاتھ لگے تاکہ مہمان بن کر میزبان کے سینے پر مونگ دلنے کی خواہش کے باوجود مہمان اس قابل نہیں رہ پاتا کہ وہاں پہنچ سکے۔ اس صورت میں رقعے پر درج شعر کا مقصد مہمانوں کو مدعو کرنا نہیں بلکہ بادِ صبا کو اطلاع دینا ہے کہ اے بادِ صبا! ہم نے مہمانوں کا معقول بندوبست کر دیا ہے تم خواہ مخواہ راہوں میں کلیاں بچھا نے کی زحمت کیوں کرو؟
مہمان سیلاب کی طرح آتے ہیں یا نہیں اس میں دو رائیں ہو سکتی ہیں لیکن اس سے کون انکار کرے گا کہ سیلاب مہمان کی طرح آتا ہے اور شرعی مہمان یا معمولی بخار کی طرح تین دنوں میں اتر بھی جاتا ہے البتہ وثوق سے نہیں کہا جا سکتا کہ مہمانوں کی طرح آنے والا سیلاب زیادہ تباہی پھیلاتا ہے یا سیلاب کی طرح آنے والے مہمان۔
ہم اپنی روح کی گہرائیوں میں جھانک کر دیکھیں تو محسوس کریں گے کہ مہمانوں کی خاطر مدارات سے ہمیں ہزار دقتوں کے باوجود ایک عجیب سی روحانی خوشی ضرور ہوتی ہے۔ مہمانوں کے قدر داں نکاح کے رقعوں پر مذکورہ شعر لکھوائے بغیر بھی مہمانوں کی راہ میں پلکیں بچھائے رہتے ہیں۔ مہمان شکم سیر ہو جائے تو میز بان کی روح سیراب ہو جاتی ہے۔ البتہ ان دنوں یہ ہونے لگا ہے کہ مہمان کے رخصت ہوتے وقت میزبان کے ہونٹوں پر سہما سہما سا ایک جملہ لڑکھڑاتا ہے۔ ’شام کا کھانا کھا کر جاتے تو اچھا تھا۔ ‘اندر ہی اندر دل لرزتا رہتا ہے کہ اس کی یہ رسمی پیش کش شرفِ قبولیت سے نواز دی گئی تو یہ بلا ایک دن اور قہر برپا کرے گی۔ اسی لئے وہ مہمان کے انکار کرتے ہی اسے گلے لگا کر خدا حافظ کہتا ہے اور سکھ کا سانس لیتا ہے یا پھولتی ہوئی سانس درست کرتا ہے۔
سوال یہ ہے کہ اب ہمیں مہمانوں کی آمد سے مسرت کیوں نہیں ہو تی۔ اس کا سیدھا سا جواب یہ ہے کہ اس مادّہ پر ستی کے زمانے میں روحانی مسرتوں کا کیا کام؟ کیا مادی ترقی کے اس عہدِ زرین میں بھی روح کا وجود باقی ہے۔ جی ہاں! روحانیت اب بھی زندہ ہے اور ثبوت اس کا یہ ہے کہ اپنے گھر کی دہلیز پر مہمانوں کا امڈتا ہوا سیلاب دیکھ کر جو چیز ہمارے اندر فنا ہونے لگتی ہے وہ ہماری روح ہی ہے۔
سنا ہے مادّہ فنا ہو جاتا ہے اور روح باقی رہ جاتی ہے، سو یہ بھی سچ ہے۔ روح کے بقا اور جہد للبقا کے مناظر ہمیں مہمانوں کی آمد کے بعد نظر آتے ہیں۔ ایثار، قربانی (جو کبھی جھٹکے کی شکل بھی اختیار کر لیتی ہے)اور صبر و تحمل وغیرہ اخلاقی قدروں کو مہمانوں کی آمد کے بعد ہی فروغ حاصل ہوتا ہے۔ مثلاً کسی دن آپ کے مہمان کا لائق فرزند جب دبئی سے آپ کے کسی عزیز کے بھجوائے ہوئے ٹی سیٹ کو لے کر، جیک اینڈ جِل، وینٹ اپ د ہل، کہہ کر سیڑھیوں پر چڑھتا جاتا ہے تو آپ کا

دل دہل جاتا ہے اور آپ جل تو جلال تو کا ورد کرنے لگتے ہیں، پھر اچانک اس ٹی سیٹ کو کمرے کی فرش پر پوری قوت سے دے مارتا ہے، تب اسے خبر ہی نہیں ہوتی کہ وہ ٹی سیٹ نہیں آپ کا پیمانہ صبر ہے جو چھلکنے سے پہلے ہی چور چور ہو گیا۔
آپ اپنے چہرہ سے تلخی کو رفع دفع کرنے کی ناکام سی کوشش کر کے اس پر کھسیانی ہنسی کا ملمع چڑھاتے ہیں اور یہ کہہ کر رہ جاتے ہیں، ' کوئی بات نہیں بچہ ہی تو ہے۔ 'اور بچے کے والدین آپ کی زبان سے نکلی ہوئی اس ابدی سچائی کو صدقِ دل سے قبول کر لیتے ہیں۔
سیلاب کے آنے کا دن اور تاریخ بھلے ہی مقرر نہ ہو، موسم تو متعین ہے۔ مہمان اس قید سے آزاد ہے۔ جس مخلوق کے آنے کا وقت مقرر نہ ہو اس کے جانے کا دن کون طے کر سکتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اب میز بان اپنے مہمانوں کا استقبال پھول جیسے ان دو سوالوں سے کرتے ہیں۔ (ان دونوں سوالوں کے درمیان سانس لینے کا وقفہ تو قطعی نہیں ہوتا)
سوال نمبر ایک: آئیے آئیے! کب تشریف لائے آپ؟
میزبان اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوتا ہے کہ وہ غریب ابھی ابھی ٹیکسی سے اتر کر اپنے حواس درست کر رہا ہے۔ (یہ سوال شاید اس لئے کیا جاتا ہے کہ میز بان کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آتا کہ اتنی بڑی مصیبت اس کے گھر وارد ہو چکی ہے)
دوسرا سوال: کب تک قیام رہے گا؟
پہلے سوال کا جواب تو اس کے روبرو ہوتا ہے لیکن جس طرح طلسمی کہانیوں والے جادوگر کی روح طوطے کے جسم میں چھپی ہوتی ہے، میزبان اس سوال میں پھنسا رہتا ہے۔ یہ سوال لازمی ہوتا ہے تاہم مہمان کچھ اس قسم کا گول مول قسم کا جواب دے کر اپنا راستہ اور میزبان کی طبیعت صاف کرتا ہے:
’جنابِ عالی! جب تک ہمارا دانہ پانی اس گھر میں ہے، ہم یہیں رہیں گے بلکہ آپ بھگانا بھی چاہیں تب بھی نہ جائیں گے۔ سمجھے؟‘
ایسا شاندار جواب پا کر میز بان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ جاتے ہیں۔ یہ اس لحاظ سے اچھا ہے کہ اس سے کفِ افسوس ملنے میں آسانی ہوتی ہے۔ رہی بات دانے پانی کی تو اب ہمارے زمانے میں دانے اور پانی میں وغیرہ وغیرہ کی خاصی لمبی دم لگی ہوئی ہے۔ عام آدمی اس دم کو جتنا سیدھا کرنا چاہتا ہے یہ اتنی ہی ٹیڑھی ہوتی جاتی ہے۔ بن بلایا مہمان بے چارہ اس بات سے بے خبر ہوتا ہے کہ وہ کب اپنے دانے پانی کی سر حد پھلانگ کر صاحب خانہ کی مملکت میں بلا پاسپورٹ داخل ہو گیا ہے۔
اس دنیا میں انسان بذاتِ خود ایک بن بلایا مہمان ہے اور وہ بھی اس بات پر اڑا ہوا ہے کہ جب تک اس کا دانہ پانی اس دنیا میں موجود ہے وہ یہاں سے ٹلنے والا نہیں، خواہ اسے دھکے مار کر ہی کیوں نہ نکالا جائے۔ چنانچہ اب آدمی تلاش روزگار میں لوکل ٹرین اور سٹی بس کے دھکے کھاتا ہے اور بے تکان جیتا ہے۔ آج کل دانے دانے ہی پر نہیں بس اور ٹرین کے دھکوں پر بھی ہمارا نام لکھا ہوا ہے۔
(پر پرزے۔ ۱۹۹۲)

بابو آر کے

بابو رحمت اللہ خاں، اردو ادب میں بابو آر کے کے نام سے مشہور ہیں، ان کے مزاحیہ مضامین اور بچوں کے لئے لکھی گئی کہانیاں کتابی شکل میں منظر عام پر آ چکی ہیں۔ ”خطا معاف“ اور ”ہو بہو“ ان کے مزاحیہ مضامین کے مجموعے ہیں۔ تدریسی پیشے سے وابستہ نہ ہونے کے باوجود اردو زبان و ادب کا ذوق اور تخلیقی شوق قابلِ داد ہے۔
بابو آر کے کی تحریریں مزاح کی فراوانی اور علاقائی زبان کے پر لطف استعمال کے لیے مشہور ہیں۔ یکم جولائی ۱۹۴۸ کو اچلپور میں پیدا ہوئے۔ ایک عارضی ملازمت کے بعد تجارت کو اپنا لیا تھا۔ ان کی تحریریں ماہنامہ شگوفہ اور بچوں کے رسائل میں شائع ہوتی ہیں۔

شکنتلا

بابو آر کے

آئیے، ہم آپ کو اپنی شکنتلا کے چہرے بشرے اور حلیے سراپے کا کچا چٹّھا بتا دیں۔ دبلی پتلی، نازک نازک چھوئی موئی سی بوٹا قد، چال خراماں، اٹھلاتی بل کھاتی، بے وقت آتی، بے وقت جاتی..... اس لیے اگر ہم یہ کہیں کہ اردو شعراء کے روایتی محبوب کے تمام ناز و انداز ہماری شکنتلا میں پائے جاتے ہیں تو غلط نہ ہو گا۔ تو آئیے اس راز سے پردہ ہٹاتے ہیں آپ کو بتاتے ہیں کہ آخر یہ شکنتلا ہے کون؟ تو عزیزانِ جانِ من.....شکنتلا..... یہ کوئی نازنین ہے نہ مہ جبین..... اور نہ ہی یہ کالیداس کی شکنتلا ہے یہ تو ہمارے تاریخی شہر اچل پور کی تاریخی ٹرین کا نام ہے۔ لیکن یہ بات بھی صحیح ہے کہ ہمارے علاقے میں کالیداس کی شکنتلا نے کم اور اس شکنتلا نے زیادہ شہرت پائی ہے۔ سینہ بہ سینہ چلی آ رہی روایتوں اور حکایتوں کے مطابق یہ خبر ہم تک پہنچی ہے کہ اس کی پیدائش انیسویں صدی کی آخری ساعتوں میں ہوئی تھی۔ یہ واقعہ ہے کہ اس دن سے آج تک قسم لے لو...... جو اس کا کوئی پرزہ یا ایک آدھ اسکرو بھی بدلا گیا ہو۔ مرگی کے مریض کی طرح بے سدھ پڑی ننھی منی پٹریوں پر سن رسیدہ بزرگ کی طرح تھکا تھکا سا انجن.....جب.....عرق النساء کے مریض کی طرح درد سے کراہتے ہوئے ڈبوں کو لے کر نکلتا ہے ..... تو ریلوے اسٹیشن پہ ہر طرف سے خدا حافظ، الامان الحفیظ کی صدائیں بلند ہونے لگتی ہیں۔ شکنتلا..... جب اپنے اسٹیشن سے ڈگ ڈگ کرتی نکلتی ہے تو یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ٹی بی کا کوئی مریض ایک طویل علاج معالجہ کے بعد اسپتال سے ڈسچارج لے کر نکلا ہو اور قدم جما جما کر چلنے کی کوشش کر رہا ہو۔ انجن کی چھک چھک پٹریوں کی کھٹ پٹ اور ڈبوں سے نکلتی چرچوں کی آوازوں کے بیچ...... انجن کی سیٹی کو الگ کرنا، مسافروں کی سماعت کے لیے کڑا امتحان ہوتا ہے۔ ہماری شکنتلا کا مائیکہ اچل پور اور سسرال مرتضیٰ پور ہے اسے میکے سے سسرال اور سسرال سے میکے کے دن بھر میں دو چکر لگانے ہوتے ہیں۔ شکنتلا کے معدے کو الیکٹرک اور ڈیزل کی بجائے کوئلہ مرغوب ہے۔ برسات کے دنوں میں جب کوئلہ بھیگ جاتا ہے تب شکنتلا بھیگی بلی بن کر ٹانگیں پسارے دو چار دن اسٹیشن پر اَن فٹ(Unfit) پڑی رہتی ہے اس طرح یہ کہا جا سکتا ہے کہ اردو شعراء ادباء کی طرح اس کا مزاج بھی بلغمی واقع ہوا ہے۔ چونکہ یہ خود کوئلہ خور ہے اس لیے یہ اپنے مسافروں کو بھی کوئلہ کھلاتی ہے۔ اپنے مسافروں کے ساتھ اس کا برتاؤ یکساں رہتا ہے۔ سب کو ایک ہی رنگ میں رنگتی ہے۔ خود بھی دھوئیں سے سانولی سلونی رہتی ہے اپنے مسافروں کو بھی کاجل بناتی ہے۔ اسی لیے شکنتلا کے مسافروں کے سفر کا اندازہ بجائے ٹکٹ کے مسافروں کے جسم اور کپڑوں پہ پتی کا لک سے با آسانی لگا لیا جاتا ہے۔

مسافر کا حلیہ دیکھ کر ہی ٹکٹ چیکر صاحب تاڑ لیتے ہے کہ کس نے کتنا سفر کیا ہے؟ جس طرح شکنتلا کو تیز رفتاری سے چڑ ہے اسی طرح اس کے مسافروں کو ٹکٹ نہ لینے کی ضد ہے۔ ملک کی دیگر ریلوں میں بلا ٹکٹ مسافر، ٹکٹ چیکر صاحب سے بھلے ہی چھپتے پھر یں لیکن یہ واقعہ ہے کہ ہماری شکنتلا کے چیکر صاحب، بلا ٹکٹ مسافروں سے بذات خود نظریں چراتے ہیں۔ ہم آپ کو یہ بھی بتا دیں کہ شکنتلا میں عرس اور میلے اور شادی بیاہ کے بھیڑ بھرے دنوں میں ٹکٹوں کی جگہ چھٹیاں بھی چلنے لگتی ہیں اور کبھی کبھی تو سر گنتی بھی رواج پاتی ہے۔ بھیڑ بھاڑ والے دنوں میں جب اس کی چھت بالکونی بن جایا کرتی ہے تو اس کی کھڑکیوں کو دروازے اور دروازوں کو جھولوں میں بدلتے دیر نہیں لگتی۔ کبھی کبھی تو شکنتلا کے مسافر انجن کیبن میں گھس کر فائر مین کو Assist کرتے ہیں اور کچھ تو ڈرائیونگ میں بھی ہاتھ بٹاتے ہیں۔ شکنتلا کا سارا عملہ اپنی سروس اس انداز میں کرتا ہے گویا بیمار کی تیمار داری کی جا رہی ہو۔ اس میں کوئی مبالغہ نہیں کہ اگر شکنتلا کے ڈرائیور اور ٹکٹ چیکر صاحب کو بڑے روٹ کی ٹرین میں با عزت مسافر کے طور پر سوار کرا دیا جائے تو یہ بات ہم دعویٰ کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ یہ دونوں حضرات بالترتیب کوئلہ چرانے اور بلا ٹکٹ سفر کرنے کے جرم میں دھر لیے جائیں۔

ایک مرتبہ ہماری شامت آئی جو......حیدرؔ بیابانی اور ہم اچل پور سے مرتضیٰ پور تک شکنتلا سے سفر کرنے کا ارادہ کر بیٹھے۔ ہم لوگ ریلوے اسٹیشن پہنچے۔ اسٹیشن پر محترمہ شکنتلا بیگم محوِ استراحت تھیں۔ ڈرائیور میکنک، فائر مین، سگنل مین..... سب کے سب اس کی نوک پلک درست کرنے میں دیوانہ وار جٹے ہوئے تھے۔ ہر کوئی اس کے اندر باہر دائیں بائیں اوپر نیچے اوزار ہتھوڑے ہاتھ میں لیے گھوم رہا تھا۔ ہم شکنتلا کی روانگی کے متعلق جاننے کے لیے اسٹیشن ماسٹر کے پاس گئے وہ ٹیبل پر بکھری ریز گاری گننے میں مصروف تھے ہمیں دیکھ کر وہ کچھ بڑبڑائے کہ... کہاں ہم شکنتلا کے تعلق سے انکوائری کرتے ہیں؟ وہ ہمیں نظر انداز کر کے چلائے ....ارے او لچھو کے بچے یونہی بیٹھے بیٹھے بیڑیاں پھونکتا رہے گا یا ڈیوٹی بھی کرے گا؟ شام ہونے کو آئی جا مٹی کا تیل لا۔ قندیلوں کے گلاس صاف کر۔ ان میں تیل بھر....... کیا آج بھی اندھیرے میں مسافروں کو ٹھوکریں اور مجھے گالیاں کھلوائے گا۔ پھر تھوڑی دیر بعد لچھو مٹی کے تیل کا ڈبہ ہاتھ میں تھامے کھڑا تھا۔ لچھو کو چلر پیسے دیتے ہوئے اسٹیشن ماسٹر بولے ......جا جلدی اور اندھیرا ہونے سے پہلے لوٹ آ۔ کل بھی اندھیرے میں کیا کیا نہیں ہوا؟ اندھیرے میں آفس سمجھ کر میں شوچالیہ چلا گیا اور وہ اپنا ٹیبل ٹٹولتا رہا ادھر مسافر شوچالیہ سمجھ کر میری آفس میں گھس آئے اور فراغت بھی پائے۔ اندھیرے میں بیچارے مسافروں کی جیبیں بھی کٹیں کتنا ڈھول دھپہ ہوا چیکر صاحب کی دھلائی ہوئی بیچارے نے لاکھ قسمیں کھائیں تب کہیں جا کر مسافروں نے چھوڑا۔ آج اندھیرے میں کیا میری بوٹیاں نچوائے گا؟ لچھو بیڑی کا دم مار کر بولا.......جاؤ استاد جاؤ کسی اور کو بنانا......لچھو کو سب پتہ ہے قندیلیں کون بجھاتا ہے۔ جیبیں کون کاٹتا ہے دھلائی

کس کی ہوتی ہے اور اکاؤنٹ کس کا بڑھتا ہے؟ اسٹیشن ماسٹر اپنا اکاؤنٹ سمیٹ کر دیدے نکالتے ہوئے دوڑے ہی تھے کہ بیچارہ لچھو وہاں سے نکل بھاگا۔ اگر آپ اسٹیشن ماسٹر سے دریافت کریں کہ شکنتلا، مرتضیٰ پور میں بمبئی جانے والی ہاوڑا، گیتانجلی یا سپر ایکسپریس کو Connect کرے گی........ تو وہ بیچارے بغلیں جھانکنے لگیں گے اور مسافر کی حالت پر رحم کھا کر خاموش رہیں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ شکنتلا اپنے مسافروں کو بڑی ٹرین سے Connect کرنے کی بجائے Disconnect کرتی ہے اور سب سے اہم بات تو یہ کہ شکنتلا، مرتضیٰ پور پہنچنے کی پابندی بھی نہیں ہے۔ وہ تو کبھی بھی اور کہیں بھی طبیعت خراب کر کے Sick میں جا سکتی ہے۔ اسی لیے شکنتلا کے مسافر......چلنے کی تمنا تھی پہنچنے کی نہیں تھی..... اس مصرعہ کو ذہن میں رکھ کر سفر کرتے ہیں اس کی رفتار میں غضب کا رکھ رکھاؤ بلکہ ٹھہراؤ ہوتا ہے۔ اسی لیے کبھی کبھی اچل پور سے مرتضیٰ پور گھنٹوں کا سفر دنوں میں بدل جاتا ہے۔ دوسرے مقام پر اس کے ذریعے بھیجے گئے انگور، کشمش میں اور آم کی کیری، امچور میں بدل جاتی ہے۔ منگنی میں جانے والے مسافر کو شادی ہاتھ لگتی ہے اور سیریس مریض کو دیکھنے جائیں تو میت ٹھکانے لگا کر لوگ گھر لوٹتے ہوئے ملتے ہیں۔ یہ اپنی دھیمی رفتار سے مسافروں کو فائدے اور ریلوے لائن کے بسنے والوں کو نقصان پہنچاتی ہے۔ چلتی ہوئی شکنتلا سے اتر کر فصل بھی کاٹی جا سکتی ہے اور گوالے کی بھینس کا دودھ نکال کر آسانی سے شکنتلا میں سوار بھی ہوا جا سکتا ہے شکنتلا کے روڈ کراسنگ(Road Crossing) پر آہنی پھاٹک لگے ہوئے ہیں۔ تو وہ سڑک پر چلنے والے راہ گیروں کو اس سے بچانے کے لیے نہیں ہیں بلکہ راہ گیروں کے شر سے شکنتلا کو بچانے کے لیے ہیں۔ کیونکہ شکنتلا کے دھان پان سے وجود کو معمولی ٹھیس بھی کئی دنوں تک بستر علالت پر ڈال سکتی ہے۔ ٹرینوں کی آمدورفت میں سگنل کا اہم رول رہتا ہے۔ لیکن ہماری شکنتلا کے سگنل کا رویہ عجیب ہی نوعیت کا ہے اسے اٹھائیں تو گرتا ہے اور گرائیں تو اٹھتا ہے۔ بارہا ایسا بھی ہوا ہے کہ اسے گرانے کے لیے سگنل مین کو سگنل پول پر چڑھنا ہوتا ہے جس سے سگنل کم اور سگنل مین زیادہ گرتا ہے۔ اسی لیے شکنتلا کا شاطر ڈرائیور سگنل کی بجائے سگنل مین کو دیکھتا ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ دوسری تمام ٹرینوں میں سگنل مین بھلے ہی سگنل کا استعمال کرتا ہو لیکن ہماری شکنتلا دنیا کی وہ واحد ٹرین ہے جس کا سگنل خود اپنے سگنل مین کا استعمال کرتا ہے۔ اور ٹرینوں کی طرح زنجیر (Chain)کی لگام تو اس کے منہ میں بھی ہے لیکن جس ٹرین کو چلانے کے لیے منتیں مرادیں مانگی جائے تو پھر اس ٹرین کو زنجیر کھینچ کر روکنے کا سوال کہاں پیدا ہوتا ہے؟ ریلوں کی تاریخ میں شاید شکنتلا ہی وہ واحد ریل ہو گی جس میں شاید ہی کبھی زنجیر کا استعمال ہوا ہو۔ اسی خوبی کے باعث بک آف ورلڈ ریکارڈس میں شکنتلا کا نام شامل کیا جا سکتا ہے۔

(ہو بہو۔ ۱۹۹۲)

مرزا رفیق شاکر

مرزا رفیق شاکر کی پیدائش ۱۶ ، جولائی ۱۹۴۳ کو جلگاؤں جامود میں ہوئی۔ آپ نے ایم اے اور بی ایڈ کی ڈگریاں حاصل کی تھیں۔ ۱۹۸۳ میں انھوں نے اسلامک کالج مرکز المعارف دیوبند سے فاضلِ اسلام کی سند بھی حاصل کی تھی۔ وہ محکمۂ تعلیمات سے منسلک رہے اور ایجوکیشن ایکسٹینشن آفیسر کے عہدے سے سبک دوش ہو کر اکولہ میں سکونت اختیار کر لی تھی۔
نعت اور غزلیات کے مجموعوں کے علاوہ مرزا رفیق شاکر کی درج ذیل کتابیں ہیں جن میں ظریفانہ مضامین ہیں۔ سیکنڈ ہینڈ، بنیے کا دھنیا اور جھنجھٹ کی شادی۔ رفیق شاکر کے ظریفانہ مضامین ان کی شگفتگی اور زندہ دلی کی عمدہ مثالیں ہیں۔ ان کا انداز اپنے ہم عصر مزاح نگاروں سے جدا گانہ ہے اور زندگی کے خوشگوار لمحات کو ظرافت کی چاشنی میں پیش کر کے وہ تفریحِ طبع کا سامان مہیا کرتے ہیں۔ حج بیت اللہ کی سعادت حاصل ہوئی اس کے چند برسوں بعد ان کا انتقال ہو گیا۔

علاّمہ غمگین

مرزا رفیق شاکر

گھنٹوں اس نام کی وجہ تسمیہ پر غور کرتے رہے۔ گھٹنوں کو ہلا ہلا کر، سر کو جھٹکے دے دے کر، ٹیبل پر انگلیاں نچا نچا کر

سمجھنے کی کوشش کی لیکن جیسے جیسے علّامہ غمگین کے بارے میں سوچتے گئے ہم خود مجسم غم بنتے رہے اور ہمیں یہ گمان غالب ہونے لگا کہ عنقریب ہم اپنے محلے کے تمام افراد سے فرداً فرداً گلے مل کر ساون بھادوں کی جھڑیاں شروع کرنے والے ہیں۔

آپ پوچھیں گے کہ یہ خیال ہمیں کیوں آیا؟ تو حضرات اس کا جواب کچھ وضاحت طلب ہے۔ ہوا یوں کہ جب ہم نے علّامہ موصوف کا نام زبان زد عام سنا اور کلو حجام سے چھجّو خاں بھشتی تک ہر کس و ناکس کو علّامہ غمگین کا ورد کرتے دیکھا تو ہمارے سر میں بھی علّامہ سے شرف ملاقات کا اشتیاق کلبلانے لگا اور دستور بھی ہے کہ بٹیر باز کو بٹیر، پتنگ باز کو پتنگ اور ملاقات باز کو ملاقات کی دیوانگی ہوتی ہے۔ ہمیں بھی کلبلاتے ہوئے شوق نے ایسا مجبور کر دیا کہ ہم علّامہ غمگین سے ملاقات کے لیے چل کھڑے ہوئے۔

اب جو علّامہ پر نظر پڑی تو دن میں تارے نظر آنے لگے۔ علّامہ کا سر فارغ البال اور ایسا شفاف و چٹیل میدان کہ اس سے سورج کی تمام کرنیں منعکس ہو کر آنکھوں کو چکا چوندھ کر رہی ہیں۔ ضرورت سے زیادہ لمبی داڑھی، پیشانی پر یتیمی کے آثار، غمگینی کے فوٹو گراف، آنکھوں میں حسرت و یاس کا سیلاب۔ یا اللہ! یہ انسان ہے یا غم کا ٹریڈ مارک، انھیں دیکھتے ہی ہمارا یہ حال کہ؂

اُن کو دیکھیں یا اُن پر غور کریں۔

اِدھر تو علّامہ اور ان کی حالات زیرِ غور تھی اور اُدھر علّامہ کی حزیں آنکھیں ہمارے ہر ہر عضو میں اِس طرح پیوست ہو رہی تھیں گویا علّامہ ہمیں خریدنا چاہتے ہیں۔

آخر انھوں نے پوچھا، ''کیوں مرزا جی کیا بات ہے''؟

علّامہ کے منھ سے اپنا نام سن کر ہم چونکے اور یقین ہو گیا کہ موصوف نہ صرف ہماری تاریخ و جغرافیہ، بلکہ اِکانامکس Economics اور سوکس Civics سے بھی اچھی طرح واقف ہیں چونکہ ہمارے شوق نے گدگدانا شروع کر دیا تھا اس لیے ہم نے اُن کے ابتدائیہ کو نظر انداز کر کے جھٹ ایک عدد ''سَلَامَالیکُوم''جھاڑ دیا اور اس سے پہلے کہ وہ جواب دیں دوسرے ہی لمحے میں ان کی خیریت بھی دریافت کر لی۔

بس جناب! یہ حرکت ایسی ثابت ہوئی گویا ٹرانسسٹر کا بٹن آن کر دیا گیا ہے۔ اُدھر علّامہ نے آنکھوں میں آنسو لاتے ہوئے اور دستی کو ناک تک لے جاتے ہوئے بڑے درد بھرے لہجے میں جواب دیا۔ اَماں یار! کیا بتائیں کیا حال ہے، بس سمجھ لو کہ قرب قیامت کی نشانی ہے۔ دنیا موت کے دروازے پر کھڑی ہے، کل جمعہ ہے، ہو سکتا ہے کل ہی صُور پھونک دیا جائے اور بس! منٹوں میں دنیا کا پاندان۔!

ہم نے چوکنّا ہوتے ہوئے کہا۔ آں! یہ کیا بات ہوئی؟ اجی حضرت قیامت جمعہ کے دن آئے گی ضرور، مگر وہ جمعہ شوال کا نہیں محرم کا ہو گا۔

بس اتنا سننا تھا کہ انھوں نے رونا شروع کر دیا اور چیں بجیں ہو کر بولے۔ بس، بس مرزا جی بس! خدا کے لیے اپنا منہ بند کرو، مولوی ابن مولوی ہوتے ہوئے ایسے کفریہ کلمے زبان سے نکالتے ہو شرم نہیں آتی، تم تو خدا کی خدائی میں بھی دخل دینے لگے۔ جس خدا نے اتنی بڑی کائنات بنائی ہے۔ کیا اِس میں نعوذ باللہ اتنی بھی قدرت نہیں کہ شوال کو راتوں رات محرم کر دے۔ اس کے کُن کہنے کی دیر ہے میاں! بس کن کہنے کی۔

ہم پر ہنسی کا دورہ پڑ رہا تھا۔ لیکن ہم نے بالجبر ہنسی کو روکا اور کہا۔ علّامہ یہ قیامت کی نشانی کا مطلب، ہم تو کچھ نہیں سمجھے۔

علّامہ غمگین نے تنک کر جواب دیا۔ یار تم بھی نرے چغد ہو، نہ جانے تمھیں کِس نے ماسٹر بنا دیا، اگر ایسے ہی لوگ ماسٹر ہو جائیں جو اَلسّلام علیکم کو سَلَامَالیکوم کہتے ہوں تو تعلیم کیسے ہو گی، قوم کا کیا حال ہو گا، ملک کدھر جائے گا۔

اَما مرزا جی! کچھ نہیں تو کم از کم علّامہ لقمانی کے پڑوسی ہونے کی وجہ سے ہی سُدھر جاتے، یا پروفیسر خواجہ غنی ہی سے دستگیری کرواتے، لیکن تم تو کٹّر وہابڑے معلوم ہوتے ہو۔ تم کیوں کسی خواجہ کے آستانے پر حاضری دو گے؟ مگر ماسٹر تاج محمد سے تو درسِ تخت و تاج لے سکتے تھے۔ سچ پوچھو تو تم پرو ہی مثال صادق آتی ہے کہ ؂

خرِ عیسیٰ ؑ اگر بمکہ رود

مطلب یہ کہ اتنے عرصہ ڈاکٹر سمیع اللہ کی مصاحبت رہی اور قیامت کا مطلب بھی نہیں سمجھے اور اس پر طرّہ یہ کہ طنز و مزاح نگار بنے پھرتے ہو۔

اتنا کہہ کر علّامہ نے زار و قطار رونا شروع کر دیا۔ ہم ان کے آنسوؤں اور آنسوؤں کی دھاراؤں کو دیکھ رہے تھے اور حیران و پریشان تھے کہ؂

یا الٰہی یہ کیوں رو رہا ہے

آخر روتے روتے علّامہ کو طیش آ گیا اور اس طرح ان کے منھ سے جھاگ نکلنے لگا گویا سوڈا واٹر کی بوتل کا کارک کھل گیا ہو اور بڑے زور و شور کی گڑگڑاہٹ کے ساتھ انھوں نے اپنا بیان جاری رکھتے ہوئے کہا کیا بتائیں مرزا صاحب! ملک خطرے میں ہے۔ عرب اسرائیل جنگ شروع ہے۔ مہنگائی بڑھتی جا رہی ہے۔ مِلّت تباہ ہو رہی ہے، اخلاقی زوال عروج پر ہے، مذہب سے بیگانگی بڑھ رہی ہے۔ قوم مردہ ہو چکی ہے، ہر طرف فتنہ و فساد کا بازار گرم ہے، قوم کے مصلحین کنبہ پروری میں لگے ہوئے ہیں، علمائے دین خوابِ خرگوش میں مبتلا ہیں۔ یہی تو آثار ہیں قیامت کے۔

زیادہ دُور کیوں جاتے ہو مرزا! اپنے اطراف ہی دیکھ لو، وہ ماسٹر مصلح الدین صاحب ہیں نا! مدرسہ صبح ۷؍بجے سے شروع ہوتا ہے اور وہ حضرت ۹؍ بجے گھر سے نکلتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ دو میل پیدل جانے میں ۱۰ تو بج جاتے ہوں گے۔ اب قوم کو کیا خاک سدھاریں گے۔

اُدھر دیکھئے وہ علّامہ رنگین چلے آرہے ہیں، نہ دین کی فکر نہ عقبیٰ کا خیال، تمدن ہنود تو انھیں ورثہ میں ملا ہی تھا اب خان بہادر کے اعزاز کے ساتھ ساتھ وضع نصاریٰ بھی مل گئی۔ ان کا ٹلو پتنگ اڑاتا ہے تو اسے پتنگ بازی کے گُر سکھاتے ہیں، لڑکی موٹر سائیکل چلانا سیکھ رہی ہے، بڑے صاحب زادے دن بھر ریڈیو کا ڈبہ گلے میں ڈال بھانڈوں کی طرح اِدھر سے اُدھر اچکتے پھرتے ہیں اور جناب، خود یہ تماشہ دیکھ دیکھ خوش ہوتے ہیں اور اپنی اہلیہ کے ساتھ شطرنج بھی کھیلتے ہیں، اور پورے گھرانے کو بے پردہ لیے سنیما اور پارکوں میں مٹکتے پھرتے ہیں۔

اور یہ ہیں جناب سیّد حفیظ الدین صاحب، ان کے سپوت سڑک پر کھڑے کھڑے حاجت سے فراغت پانے کے بعد، امی ہمیں دھلا دو کا نعرہ بھی بلند کرتے ہیں اور سیّد صاحب کو اپنی اولاد کی بد تہذیبی پر غیرت تک نہیں آتی۔ اب اس سے بڑھ کر دین کی حفاظت اور کیا ہو سکتی ہے۔ اور کیا بتاؤں شاکر صاحب! آپ خود سوچیں، جب ہمارے پیش امام طہارت خانوں کو چھوڑ کر گلی کوچوں میں نجاست دور کرنے کا اشتہار بنے عجیب عجیب کرتب کرتے دکھائی دیں، ذرا ذرا سی بات پر مخالف گروپ کی تذلیل کریں، اور من چاہے فتوے دینے لگیں تو بھلا قیامت نہ آئے تو کیا آئے۔

وہ دیکھو! جناب ہیڈ ماسٹر صاحب نے پان کھا کر سڑک پر اس طرح تھوکا کہ اس کے چھینٹے سڑک سے منعکس ہو کر دیگر ساتھیوں کے منہ پر چپک گئے، یہ حضرت اپنے منھ کو اُگالدان بنائے پھرتے ہیں تو بھلا دوسروں کے منھ کی کیا قدر کریں گے۔ یہ وہی ہیں جو شاگرد کا مونث شاگردنی لکھواتے ہیں۔ بتائیے تو اردو کا مستقبل کیا ہو گا؟

اور یہ ہیں پروفیسر علیم الدین صاحب، ان کا ایک ایک عضو علم میں ڈوبا ہوا ہے۔ انھیں کے طفیل ہماری قوم میں علم و ادب قائم ہے۔ مگر ان کی اہلیہ، اللہ کی پناہ! فحش کلمات کے سلسلے میں ان کا دماغ انسائیکلوپیڈیا کا درجہ رکھتا ہے اور ان کی اس تحقیق پر دنیائے فحاشت بھی شرما جاتی ہے۔ ان کے بچوں کو دیکھئے تو گھر کی سیڑھیوں کے پاس ہی حوائج ضروری سے فراغت پا کر محکمۂ صحت و صفائی کو چیلنج کرتے ہیں۔

اتنا کہہ کر علّامہ نے پھر رونا شروع کر دیا اور ہمارا یہ حال کہ ہنسی بغاوت پر آمادہ۔

بس جناب! ہمارے منھ سے ہنسی کا دبا ہوا فوّارہ چھوٹ ہی گیا اور اس سے پہلے کہ علّامہ کو ہوش آتا ہم کو فرار ہو جانے ہی میں اپنی عافیت معلوم ہوئی۔

لیکن اب اکثر تنہائی میں بیٹھ کر ان کے متعلق سوچتے ہیں تو جیسا کہ ہم نے پہلے عرض کیا ہم پر رنج و غم کے دَورے پڑتے ہیں۔

(سیکنڈ ہینڈ۔)

انصاری اصغر جمیل

انصاری اصغر جمیل ودربھ میں ابھرنے والے ان مزاح نگاروں میں اس لحاظ سے الگ ہیں کہ انگریزی میڈیم سے تعلیم حاصل کرنے کے بعد انھوں نے اپنے آبائی کاروبار کتابوں کی تجارت کو اپنایا یعنی بک ڈپو کی ذمہ داری سنبھالی اور اپنے اطراف موجود کاغذات کے انبار سے وہ قلم تک آئے۔ انھوں نے ناگپور سے ایک مزاحیہ رسالہ ''مزاح نامہ'' بھی جاری کیا تھا، اس کے بعد وہ ایک مدت تک ماہنامہ ''اردو میلہ'' شائع کرتے رہے۔ ان کی کتاب لگی ۱۹۹۴ میں شائع ہوئی جس میں مزاحیہ مضامین اور ناگپور کی معروف شخصیات کے خاکے ہیں۔ ''ہوم منسٹر، ہم خادمِ قوم، ٹی وی سسرال کا''، وغیرہ میں ان کے طنز کا ہدف ان کی نصف بہتر ہیں۔

انصاری اصغر جمیل کو مزاح نگاری کا شوق ان کے چچا مشہور مزاحیہ شاعر ناظم انصاری سے وراثت میں ملا ہے، ناظم

انصاری کی تحریروں میں بقول ڈاکٹر مدحت الاختر غصے اور جھنجھلاہٹ کی فراوانی ہے۔ ان کے مشاہدے نے انھیں آج کے سماج کی ترجمانی پر مجبور کر دیا ہے جو مختلف خرابیوں کا گہوارا ہے۔

میں کہاں کہاں نہ بھٹکا

انصاری اصغر جمیل

خدا کو کسی کا امتحان لینا مقصود ہوتا ہے تو وہ اسے مکان کی تلاش میں الجھا دیتا ہے۔ فی زمانہ وفا شعار بیوی تلاش کر لینا آسان ہے مگر کشادہ اور سستا مکان تلاش کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں۔ حال ہی میں ہمیں اس کا تجربہ ہوا۔ ہم اپنے والدین سے دور شہر میں مقامی کالج میں زیر تعلیم ہیں اور ایک دوست کے ساتھ مشترک کمرے پر قبضہ جمائے ہوئے ہیں۔ والد صاحب کا حکم نازل ہوا کہ ہمارے گھر کے لوگ گاؤں کی زندگی سے اکتا کر شہر آنا چاہتے ہیں۔ اس لیے فوراً ایک عدد مکان تلاش کیا جائے۔ ہمیں والد صاحب سے اس حکم کی قطعی امید نہ تھی۔ کیونکہ ہماری عمر خوبصورت لڑکی تلاش کرنے کی ہے مکان تلاش کرنے کی نہیں۔ انھیں یہ حکم دینا چاہئے تھا کہ، بیٹا! تم اپنے لیے شہر میں ایک عدد شریک حیات تلاش کر لو، باقی کام ہم سنبھال لیں گے۔ لیکن جو کام ہمیں انجام دینا تھا وہ انھوں نے سنبھال لیا اور اپنا کام ہمیں سونپ دیا۔
آپ سوچ رہے ہوں گے مکان ڈھونڈنا کون سی بڑی بات ہے؟ اخباروں میں ''ضرورت ہے'' کا اشتہار دے دیجئے مکان خود بخود آپ کے قدموں میں آ جائے گا۔ اس قسم کے اشتہاروں سے شادی کے لیے مناسب جوڑے تو مل سکتے ہیں مگر ایسا مکان نہیں مل سکتا جو شہر کے قلب میں واقع ہو، آس پاس کا ماحول شریفانہ ہو اور ہر ضرورت کی چیز بھی قریب ہو۔ ہم نے طے کر لیا کہ اب روزانہ کالج سے لوٹنے کے بعد مکان کی تلاش میں خاک چھانتے پھریں گے۔ اٹھتے بیٹھتے ہر کسی سے اس کا تذکرہ کریں گے۔
مکان کا پتہ بتانے میں ہماری چند منہ بولی بہنوں نے کافی تعاون دیا جس کے لیے ہم ان کے شکر گزار ہیں۔ ہم روزانہ اپنی تفریحات کو تلاشِ مکان کی بھینٹ چڑھا کر گلی گلی مارے مارے پھر نے لگے۔ ہماری نظریں ہر مکان پر ''مکان بیچنا ہے'' کی تختیاں تلاش کرتیں۔ ہم ہر عمارت کو رشک بھری نظروں سے دیکھتے۔ بعض جگہ ان کی بالکونیوں پر موجود حسیناؤں سے نظریں ملتیں جو ہمیں دیکھتے ہی نفرت سے منہ پھیر لیتیں۔ کوئی ہمیں دیکھتا تو چور اچکا یا در یتیم سمجھتا۔ الجھے ہوئے بال، بڑھا ہوا شیو، کپڑے دھول میں اٹے ہوئے۔ یعنی ہماری حالت ایک نا مراد عاشق سے زیادہ خستہ ہو چکی تھی۔ اس دوران بہت سے واقعات رونما ہوئے۔ چند آپ کو بھی گوش گزار کروا دیں تاکہ اگر آپ نے مکان خرید نے یا کرائے پر لینے کا قصد کیا ہو تو فوراً ترک کر دیں۔
ایک رات ڈیڑھ بجے جب ہم خوابِ خر گوش کے مزے لوٹ رہے تھے اچانک ہمارے کمرے پر دھاوا بول دیا گیا۔ ہمارے دوست کرائے کے مکان کا پتہ لائے تھے۔ علیٰ الصبح ان کے ہمراہ ہم مکان دیکھنے گئے جو ایک گنجان آبادی میں تھا۔ مکان دو مختصر کمروں، ایک دیوان خانہ اور چھوٹے سے دالان پر مشتمل تھا۔ مکان کے باب الداخلے کا چوکھٹا نہایت چھوٹا تھا۔ وہ اس لئے تاکہ کوئی بھی کرایہ دار مالکِ مکان کے سامنے سر اٹھا کر نہ چلے۔ کمروں کی چھتیں انگریزی حرف ''وی'' کی شکل اختیار کر گئی تھیں۔ دونوں کمرے اس قدر مختصر کہ ان میں سجدۂ شکر بہ مشکل بجا لایا جس سکتا تھا اور نہ کرایہ دار پیر پسار کر غفلت کی نیند سو سکتا تھا۔ ہاں بارش کے موسم میں ضرور کسی پیڑ کے نیچے کھڑے ہونے کا مزا لیا جا سکتا تھا۔
سوچا اسی کو کرائے سے لے لیں، کرایہ دریافت کیا تو جواب ملا ''تین سو روپئے'' حالانکہ مکان کے لحاظ سے زیادہ تھا پھر بھی ہم راضی ہو گئے لیکن جب مالکِ مکان نے پچیس ہزار روپئے پگڑی مانگی تو ہم نے گھر لوٹنے ہی میں عافیت سمجھی۔
ہماری ایک ہم جماعت نے خبر دی کہ اس کی سہیلی جس عمارت میں رہتی ہے اس میں اوپر کی منزل کرائے کے لیے خالی ہے۔ ہماری ہم جماعت کی وہ سہیلی اس قدر نک چڑھی ہے کہ ہم اس سے بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے مگر ضرورت کیا نہیں کرواتی۔ ہم نے مکان دیکھنے کے لیے حامی بھر لی۔ وہاں پہنچے، گھنٹی بجائی۔ ایک محترمہ نے دروازہ کھولا۔ ہمیں بیٹھنے کے لیے کہا گیا۔ ہم اس حسین ڈرائینگ روم کو اس طرح دیکھنے لگے جیسے بلی چوہے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھتی ہے۔ تھوڑی دیر بعد ایک صاحب دروازے سے نمودار ہوئے جو صورت سے پیشہ ور غنڈے نظر آرہے تھے۔ انھیں دیکھتے ہی ہمارے اوسان خطا ہو گئے۔ انھوں نے ہمیں اشارے سے اوپر کی منزل کے معائنے کا حکم دیا۔ اوپر کی منزل پوری طرح خالی

تھی۔ مکان ہمیں پسند ہی نہیں، بے حد پسند آیا۔ نیچے اتر نے کے بعد جب ان سے تعارف ہوا تو پتہ چلا جنہیں ہم پیشہ ور غنڈہ سمجھ رہے تھے وہ اسی نک چڑھی کے والدِ ماجد تھے۔ چند لمحوں تک وہ ہمیں تنقیدی نظروں سے دیکھتے رہے پھر کڑک دار آواز میں مخاطب ہوئے۔ ’’میری بیٹی سے تمہارا کیا تعلق ہے؟‘‘

ہم نے جواب دیا، ’’کچھ بھی نہیں، ہم ایک ہی کالج میں زیرِ تعلیم ہیں۔‘‘

’’کیا تم دونوں ایک ہی جماعت میں ہو؟‘‘

ہم نے بڑے ادب سے کہا ’’جی نہیں، آپ کی بیٹی ہم سے ایک سال جونیئر ہے۔‘‘

’’تم سے جونیئر ہے تو تم دونوں کی ملاقات کیونکر ہوتی ہے؟ کالج میں اور بھی تو لڑکیاں ہیں، تم اس سے ہی کیوں ملے؟‘‘

ہم خاموش رہے۔ (اب انھیں کون سمجھاتا کہ ہمیں لڑکی کی نہیں مکان کی ضرورت ہے) ہماری خاموشی سے انھیں اور شہ ملی۔ ہمیں حقارت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے فرمایا، ’’مجھے تو تمہاری نیت پر شک ہے، صورت سے بھی تم فراڈ لگتے ہو، اس لیے میں مکان نہیں دے سکتا۔ آئندہ میری بیٹی کی طرف نظر اٹھا کر بھی دیکھا تو خبر دار!‘‘

ہم نے لاکھ صفائی پیش کی مگر انھوں نے ایک نہ سنی، رہی سہی عزت بھی گئی۔

چند دنوں بعد خبر ملی کہ شہر کے کنارے ایک مکان کرائے کے لیے خالی ہے اور ہمارا انتظار کر رہا ہے۔ مالک مکان صورت سے شریف انسان نظر آرہے تھے۔ ان کے با رعب چہرے پر تقریباً دو فٹ لمبی گھنی ڈاڑھی ان کی شخصیت کو پر کشش بنا رہی تھی۔ انھوں نے ہمارے چہرے کا بغور معائنہ فرمایا، ہم نے جھٹ سے سلام ٹھونک دیا اور اپنا مدعا بیان کیا۔ انھوں نے گھوم پھر کر ہمیں دیکھا، کسی قصاب کی طرح ٹٹولا پھر نحیف آواز میں دریافت کیا۔ ’’کیا آپ گوشت کھاتے ہیں؟‘‘

ہم نے اثبات میں سر ہلا دیا اور گوشت کے فوائد پر اچھا خاصا لکچر دے ڈالا کہ شاید ہمارے خیالات سے متاثر ہو کر وہ مکان کی کنجی ہمارے حوالے کر دیں مگر انھوں نے دوسرا سوال داغ دیا۔ ’’کیا آپ روزانہ اشنان کرتے ہیں؟‘‘

ہم نے سوچا شاید پانی کی قلت کی وجہ سے یہ سوال کیا گیا ہے۔ نہایت احترام سے جواب دیا۔ ’’حضرت! مسلمانوں کے بارے میں مشہور ہے کہ ہفتہ میں ایک بار جمعہ ہی کو نہاتے ہیں۔ اگر آپ کو اس پر اعتراض ہو تو ہم رمضان اور بقر عید پر ہی اکتفا کریں گے۔‘‘

اتنا سننا تھا کہ موصوف میں نہ جانے کہاں سے توانائی آ گئی۔ ان کی نحیف آواز گرجدار ہو گئی اور ہمارے خاندان کو بہترین گالیوں سے نوازنے لگے۔ پتہ چلا کہ جنھیں ہم مسلمان سمجھ رہے تھے وہ خالص برہمن تھے۔ ہم وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگے۔

اس سلسلے میں ہم تقریباً مایوس ہو چکے تھے کہ ایک دن خبر ملی ایک تین کمروں والا مکان خالی ہے۔ غسل کئے بغیر ہی ہم نے علی الصبح ہی ان کے دولت کدے پر حاضری دے دی۔ تھوڑی دیر بعد مالکِ مکان تشریف لائے۔ یقین جانئے اس وقت اِس فقیر کی حالت واقعی کسی فقیر سے کم نہ تھی۔ انھوں نے ہماری طرف اچٹتی ہوئی نظر ڈالی اور اپنے خادم کے ذریعے شام میں آنے کا حکم دیا۔ ہم شام کو پھر وہاں پہنچ گئے۔ ان کے خادم نے ہماری آمد کی اطلاع دی۔ ہم دروازے پر کھڑے ہی تھے۔ تھوڑی دیر بعد انھوں نے اس کے ذریعے پانچ روپئے یہ کہہ کر بھجوا دئے کہ ابھی اتنے میں ہی کام چلا لیں آئندہ اضافہ کر دیں گے۔ ہم کبھی اس خادم کی صورت دیکھتے اور کبھی پانچ روپئے کا کرارا نوٹ۔ ہماری آنکھوں سے آنسو رواں دیکھ کر وہ غریب بھی ہمارے غم میں برابر کا شریک ہو گیا اور مشورہ دینے لگا۔ ’’جوان ہو، ہٹے کٹے ہو، کہیں کوئی نوکری کیوں نہیں کر لیتے؟‘‘ ہم کسی نا مراد عاشق کی طرح وہاں سے لوٹ آئے۔

گزشتہ ہفتے ایک مکان کے سلسلے میں ایک ویران محلے میں پہنچے صاحبِ خانہ کے ماتھے پر کالا نشان اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ موصوف صوم و صلٰوۃ کے پابند ہیں ہم نے ان کے روبرو اپنا مدعا بیان کیا۔ حضرت نے ہماری بیگم کے متعلق دریافت کیا، ہم نے حیرت سے کہا، حضرت ابھی تو ہمارے دودھ کے دانت بھی نہیں ٹوٹے، شادی کہاں سے ہو گی۔ حضرت یکلخت بھڑک اٹھے اور کہنے لگے۔ ’’پھر تو آپ کو مکان نہیں مل سکتا۔ یہ شریفوں کا محلہ ہے۔ اگر آپ شادی شدہ ہیں تو ٹھیک ورنہ۔۔ ۔‘‘

ہم نے جواب دیا۔ ’’یہ مکان ہمارے والدین کو چاہئے وہ خیر سے شادی شدہ ہیں۔‘‘ کہنے لگے۔ ’’والدین کے ساتھ آپ بھی رہیں گے۔ آپ کنوارے ہیں۔ اس مکان میں میری اہلیہ کے علاوہ میری جوان بیٹی بھی رہتی ہے۔ خدانخواستہ۔۔ ۔ ۔، اس لئے معاف کرنا میں مکان آپ کو نہیں دے سکتا۔‘‘

ایک محترمہ نے ہمیں مکان دینے سے صرف اس لیے انکار کر دیا کہ ہم ایک ایسے کالج میں زیرِ تعلیم ہیں جس میں لڑکیوں کی تعداد لڑکوں سے زیادہ ہے۔ بقول ان کے ’’ہم میں شرم و حیا باقی نہیں رہی۔‘‘

اس تلاش مکان نے ہمیں اس قدر اذیتیں دی ہیں، اتنی بے عزتی کی ہے کہ جی چاہتا ہے زندگی سے فرار حاصل کر لیں۔ پھر سوچتے ہیں ہم نہ رہے تو اس ملک کا کیا بنے گا۔ ہمیں اس وقت تک زندہ رہنا چاہئے جب تک مکان دستیاب نہیں ہو جاتا۔ ہم نے

والد صاحب کو لکھ بھیجا کہ ہم اس ذمہ داری کو نہیں نبھا سکے یعنی مکان تلاش نہیں کر سکے۔ ہما ری اس نالائقی کی وجہ سے وہ ہم سے سخت ناراض ہیں۔ بقول ان کے ہم ایک عدد مکان تلاش نہیں کر سکے تو بڑھاپے میں ان کی خدمت کیا کریں گے۔
(لگی۔ ۱۹۹۴)

غلام صوفی حیدری

غلام صوفی حیدری ۱۹۱۴ میں بالا پور میں پیدا ہوئے۔ زندگی کا بڑا حصہ ملازمت کے سلسلے میں ممبئی میں گز را تھا۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ "بکواس" ۱۹۸۳ میں منظرِ عام پر آیا تھا۔ ان کی ظریفانہ تحریروں میں زبان کا چٹخارہ اور روزمرہ زندگی کے واقعات کو دلچسپ انداز میں پیش کیا گیا ہے۔
اس کتاب کے مضامین کی زبان اور طرزِ تحریر کو کتاب میں شامل پیش لفظ میں مشہور ادیبہ عصمت چغتائی نے سراہا ہے۔
۱۹۹۳ میں ممبئی میں ان کا انتقال ہو گیا۔

کلام برائے کلام

غلام صوفی حیدری

ہمارا خاندانی شجرہ ساتویں پشت میں میر تقی میر سے ملتا ہے اور مزید یہ کہ ہم رہنے والے ہیں اسی اجڑے دیار کے۔ اس لیے ہمیں اہلِ زبان ہونے کا آبائی اعزاز حاصل ہے اور مدنی شرف بھی۔ اسی اعزاز اور شرف کی بنیاد پر اگر ہم زبان کی غلطیوں کے مرتکب بھی ہوں تب بھی ہمارے اہلِ زبان ہونے کے جملہ حقوق محفوظ ہونے میں کوئی فرق نہیں پڑتا، نہ خاندانی آبرو پر حرف آ سکتا ہے۔ ہمارے ایک دوست ہیں جو شاعر بھی ہیں۔ خیر شاعر ہونا اتنی خاص بات نہیں، ہم بھی شاعر ہیں۔ ہمارے والد بزرگوار بھی شاعر تھے ہمارے صاحبزادے بلند اقبال بھی شاعر ہیں۔ ہمارے برادر بزرگ بھی شاعر ہیں۔ سچ پوچھئے تو ملک کی جملہ آبادی کا ہر دوسرا آدمی شاعر ہے۔ اگر مردم شماری کے وقت شاعر شماری کی گئی تو یقین مانئے شعراء کی ٹوٹل آبادی ملک کی بادی کے گرانڈ ٹوٹل کے تقریباً نصف سے کچھ ہی کم ہو گی۔ پتہ نہیں سیاست والوں کو شعراء کرام سے بیر ہے یا ان کی ذہانت سے خوف، کہ شعراء کی اتنی کثیر تعداد کے باوجود بھی نہ تو انھیں اسمبلی میں نمائندگی دی جاتی ہے نہ پارلیمنٹ میں۔ جبکہ شعراء کی تعداد گریجویٹس کی تعداد سے کئی گناہ زیادہ ہے۔
معاف کیجئے! مسجد کا تذکرہ کرتے کرتے بات میکدہ تک پہنچ گئی، اور ہم شترِ بے مہار اور اشہب بے لگام کی طرح ایک ہی جست میں کوئے یار سے کوئے رقیب میں منتقل ہو گئے۔ آمدم بر سر مطلب، ہمارا ایک جگری دوست شاعر ہے وہ نہ صرف جگر مراد آبادی پر واری واری جاتا ہے بلکہ ایک زمانے سے شعر و شاعری کا اتنا دیوانہ ہے کہ صاحبِ دیوان ہو گیا ہے۔ لیکن اس کا قصور صرف اتنا ہے کہ وہ میرؔ کے اُجڑے دیار (دلّی) کا باشندہ نہیں بلکہ عروس البلاد(بمبئی) کا باسی ہے۔ اس کی دوستی سر آنکھوں پر، لیکن ہم نے ایک نہیں دس مرتبہ بہ یک جنبشِ کام و دہن غیر مبہم الفاظ میں اسے اہلِ زبان تسلیم کرنے سے صاف انکار کر دیا۔ ایک دو مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ اس نے اپنی پوری طاقت سے اپنا دہنِ مبارک وا کر کے ہمیں اپنی گز بھر کی زبان بھی بتائی۔ تب بھی ہم اسے اہلِ زبان خانے میں جگہ نہ دے سکے۔ دلّی کی بلّی بھی اہل زبان کہلائی جا سکتی ہے۔ لکھنؤ کی مرغی بھی اہلِ زبان تسلیم کی جا سکتی ہے لیکن بمبئی کی بلبل کو بھی اس شرف سے مشرف نہیں کیا جا سکتا۔
تم کو مسجد ہے ہم کو بت خانہ
شیخ جی اپنی اپنی قسمت ہے
اور بھئی اللہ واسطے کی بات تو یہ ہے کہ "کھائیلا ہے" "پئیلا ہے" اور "سوئیلا ہے" بولنے والوں کو اہل زبان کہنا نہ صرف منھ کا مزہ خراب کرنا ہے بلکہ ان افراد کی آبروریزی کرنا ہے جن کا پیشۂ آبا سو پشت سے سپہ گری اور جو شاعری ہی کو ذریعہ عزت نہیں سمجھتے بلکہ اپنے اہل زبان ہونے پر بھی ناز کرتے ہیں۔
مجھے اچھے طریقے سے یاد ہے کہ زندگی میں ہمارا بمبئی کا یہ طواف پہلا تھا۔ ہم دل کی شہ پا کر نظاروں میں گم ہونے اور حسنِ سر رہگزر پر ششدر ہونے کے لیے تفریحاً نکلے تھے۔ راستے میں ہمیں ایک اجنبی ملا۔ پوچھنے لگا آپ کا "مولوک"کون

سا؟ ہم نے کہا ہمارا ملک بھارت ہے۔ پہلے ہم شرنارتھی ہیں، پھر بھارتی ہیں، پھر ودّیا بھارتی۔ کہنے لگا بھارتی تو ہم بھی ہیں۔ آپ کا ''مولوک''؟رہنے کامٹی؟ ہم نے کہا دلّی۔ مختصر یہ کہ اس ملاقات کا ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے اس سے دادر کا پتہ پوچھا۔ کمبخت نے کہہ دیا ''اگل جا'' ہمارا رخ بوری بندر کی سمت تھا۔ ہم بجائے دادر کے بوری بندر کی سمت جانے لگے۔ اس نے اتنی بھی تکلیف گوارا نہ کی کہ کہہ دیتا آپ غلط سمت جا رہے ہیں۔ صرف بندر کی طرح ہماری طرف دیکھتا رہا۔

اخلاق کا جلتا ہوا گھر دیکھ رہا ہوں
دیکھا نہیں جاتا ہے مگر دیکھ رہا ہوں (ماہر القادری)

ایسا لگتا ہے کہ بمبئی کے لوگ اینٹی خضر(Anti Khizar) ہیں اور تنوع پسند بھی۔ انھیں صحیح طریقے سے رہنمائی کرنے میں کوئی نئی بات نظر نہیں آتی۔ آپ کسی بھی بمبئی والے سے پتہ پوچھئے۔ خواہ آپ کا مقامِ مقصود شمال میں ہو اور آپ جنوب کی سمت جا رہے ہیں۔ ارشاد ہو گا ''اگل جا''(آگے تشریف لے جائیے) پھر اسے اس بات سے غرض نہیں کہ آپ جنّت میں جا رہے ہیں یا جہنّم میں۔

ہم پیسے کے بارے میں کنگال سہی لیکن عقل و شعور کے تعلق سے سرمایہ دار ہیں۔ عقل کا سر پلس اسٹاک بھی رکھتے ہیں۔

اچھا یاد ہے اپریل کی پہلی تاریخ تھی ہم پریل سے دھوبی تالاب جا رہے تھے۔ جیب کا وزن ذرا کم محسوس ہو رہا تھا اس لیے ہم اپنے قدوم میمنت لزوم ہی سے راستہ ناپ رہے تھے۔ اس میں ہمارا دوہرا فائدہ تھا۔ ایک تو یہ کہ راستے میں ہم در و بام کے جلوؤں سے بقدرِ تابِ نظر فیض یاب ہو سکتے تھے اور دوسرے کشمکشِ دست و جیب سے محفوظ۔

اگر آپ کا نوٹسنگ پاور بہتر ہے تو آپ اس بات سے متفق ہو سکتے ہیں کہ راہرو شوقِ منزل میں ہر چیز سے رہنمائی حاصل کرتا ہے۔ ازمنۂ وسطی میں صحرا میں مسافر ستاروں سے سمت دریافت کرتے تھے۔ شرط صرف اتنی ہے کہ آدمی میں کام پرُتی عقل(Work Ability)چاہیے۔

نگاہِ عقل میں ناچیز بھی ایک چیز ہوتا ہے
ہے خضر منزل مقصود گردِ کارواں میری (صوفیؔ)

حاصل مطلب یہ کہ اگر اللہ میاں نے آپ کو تھوڑی بہت عقل دی ہے تو آپ قافلے کی گرد سے قافلے کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ ڈیڑھ اکل (عقل) کی ضرورت نہیں صرف ایک عقل سے ہی کام چلا سکتے ہیں۔ چنانچہ ہم نے دوکانوں کے نام کے تختوں (Name Boards)سے رہنمائی حاصل کرنی چاہی۔ ہر دوکان کے بورڈ کو آنکھیں بتائیں لیکن شدید جھنجھلاہٹ ہوئی کہ کسی دوکان پر دوکان کے نام کے ساتھ مقام یا محلہ کا(Locality) نام نہ تھا تاکہ آسانی سے پتہ چل سکے کہ مابدولت کس مقام پر قدم رنجہ فرما رہے ہیں اور کہاں سے گزر رہے ہیں۔

معاف کیجیے قطع تسلسل ہوتا ہے۔ ہمیں ایک فلم ایکٹریس سے اس کی زندگی ہی میں شرف ملاقات حاصل ہوا تھا۔ اتفاق سے چمبور کے گورِ رئیساں کے پاس سے گزر رہے تھے کہ خواہش ہوئی کہ اس کی قبر پر بھی فاتحہ پڑھ دیں چنانچہ کتبوں کی مدد سے ہم نے مینا کماری کی مزار کا پتہ لگا لیا۔ کیا ہم پوچھ سکتے ہیں کہ دوکانوں کے نیم بورڈ قبروں کے کتبوں سے بھی گئے گزرے ہو گئے کہ ان سے مقام کا پتہ بھی نہیں چلتا۔ رہے کارپوریشن کے بورڈس اور مقامات کی تختیاں تو وہ ایسی احتیاط سے لگائی گئی ہیں کہ اجنبیوں کی نظر بد سے محفوظ رہیں۔ بہرحال ہیئر کٹنگ سیلون کے مالکانِ ذی وقار سے لے کر ان تاجرانِ نامدار تک جو دوائے دل بیچتے تھے اور کفن فروشوں تک ہر تاجر سے بلا تفریق ملت دست بستہ بلکہ کمر بستہ درخواست کرتے ہیں کہ وہ اپنے نیم بورڈس پر اپنے نام کے ساتھ مقام اور روڈ کا نام بھی شریک تحریر کریں تاکہ نواردان بساط بمبئی کو آٹومیٹک(خودکار)رہنمائی حاصل ہو سکے۔

وہ دیا بہتر ہے ان جھاڑوں سے اور اس لیمپ سے
روشنی محلوں ہی کے اندر رہے جن کی سدا (اسمٰعیل میرٹھی)

آخرکار ہمیں احتیاط سے ''اگل جا'' والوں کی رہنمائی کی مدد لینی پڑی اور خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ ہم چلتے چلتے، پھرتے پھرتے، گھومتے گھامتے، پوچھتے پاچھتے منزل پر پہنچ ہی گئے۔

ارادہ شرط ہے تقدیر پہنچا دے گی منزل پر

اور جب ہم نے دریافت کیا کہ کون سا مقام ہے تو ایک راہ رونے بتایا کہ یہ ''دھوبی تلاؤ'' ہے۔ اپنی وسیع جنرل معلومات کے بوتے پر ہم یہ تو جانتے تھے کے بعض کرم فرما تالاب کو تلاؤ یا تلیّا بھی کہتے ہیں اس لیے ہم سمجھ گئے کہ وہ دھوبی تالاب کہہ رہا ہے۔ لیکن ہماری جنرل نالج کا دوسرا پارٹ معیار پر پورا نہیں اتر رہا تھا۔ اس لیے کہ تالاب میں پانی تھا نہ وانی۔ دھو بی تھانہ دھوبی کا کتا۔ اور گھاٹ تھانہ پاٹھ بلکہ خوبصورت فیشن ایبل دوکانوں کا سلسلہ اجنتا کی کیو (Cave)کی طرح دور تک چلا گیا تھا، اور دوکانوں کی سیلس گرلس(Sales Girls) اجنتا کی پتھر کی جاندار موتیوں کی طرح نظر آ رہی تھیں۔ دھوبی تالاب میں پانی نہ ہونے کی وجہ سے غرقابی کا خطرہ نہ تھا پھر بھی ایک خطرہ لاحق تھا۔ اور وہ تھا خوبصورت دوکانوں کی

حسین سیلس گرلس کی آنکھوں میں پھسل کر ڈوب جانے کا خطرہ، اور ایسا لگتا تھا جیسے: -
"اور پھسلا تو پھسلتا ہی چلا جاؤں گا"
یکایک ہماری چھٹی حِس ورکنگ آرڈر(جاگ اٹھی) میں آ گئی اور....ہمیں خیال آیا کہ آج فرسٹ اپریل ہے اور کہیں یہ لوگ اس مقام کو دھوبی تالاب کہہ کر ہمیں "اپریل فول" تو نہیں بنا رہے ہیں؟ لیکن پولیس کانسٹیبل نے تصدیق کر دی کے ہم دھوبی تالاب پر ہیں ورنہ گھر کے رہتے نہ گھاٹ کے۔ ۔!
جیسا کہ ہم پہلے ہی یہ راز منکشف کر چکے ہیں کہ بمبئی کی مقدس و مونٹ سر زمین کی پابوسی کا ہمارا یہ پہلا ہی موقع تھا اور پھر ہم برائے تفریح نکلے تھے، ابھی سیر سے ہی طبیعت سیر ہوئی تھی نہ تفریح سے چھٹانک بھر فرحت ملی تھی، اس لیے ہم نے پھر چہل قدمی شروع کر دی۔ لیکن جب ہم بھینڈی بازار پہنچے تو معلوم ہوا کہ ہم چہل قدمی کی بجائے اَلِف قدمی کر چکے ہیں۔ بھینڈی بازار میں اللہ کا دیا سب کچھ تھا صرف بھینڈیوں کو چھوڑ کر۔ ہم اس بات کی تحقیق کرنا چاہتے تھے کہ اس بازار کا نام بھینڈی بازار کیوں پڑا۔ تلاش بسیار کے بعد کسی دوکان پر بھینڈیاں نظر نہ آئیں لیکن کیلے کی بڑی بڑی دکانیں نظر آئیں اور ہمیں ایسا محسوس ہوا کہ بھینڈی بازار کا نام کیلا بازار رکھتے تو اچھا تھا۔
گھومتے گھامتے جب ہم آگے بڑھے تو ہمیں معلوم ہوا کہ ہم بہ نفس نفیس چور بازار میں ہیں۔ بازار کے نام پر ہم پر اتنا نفسیاتی اثر ہوا کہ فرسٹ ہینڈ تفتیش ہی میں بازار کا ٹوٹل اسٹاک سیکنڈ ہینڈ معلوم ہوا۔ خصوصاً دکانوں میں استعمال کئے ہوئے پرانے جوتے اور مستعمل شدہ پرانے کوٹوں اور پتلونوں کے انبار نے ہمیں یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگنے دی کہ جملہ مال چوری کا ہو سکتا ہے۔ تھوڑی دیر کے لیے ہم سوچتے رہ گئے کہ یہ مال کیسے اور کہاں سے چرایا گیا ہو گا اور دن دہاڑے کیسے فروخت ہوتا ہے؟ ہمارے سوچنے کا اتنا ہی فلسفیانہ انداز تھا جتنا کہ اس فلسفی کا، جس نے ایک بلند دیوار پر بھینس کا گوبر چسپاں دیکھ کر اس بات کی پوچھ پاچھ شروع کر دی کہ بھینس اس دیوار پر کیسے اور کہاں سے چڑھی ہو گی؟ مزید تحقیق سے معلوم ہوا کہ بازار تو ایک ہے لیکن اس کے اسمائے شریف "آنولے جاؤنلے" ہیں۔ ایک چور بازار دوسرا نل بازار۔
زندہ دلان بمبئی کو نہ جانے ایسے بے تکے نام کیوں پسند ہیں۔ ایسی طبیعت چاہتی ہے کہ محلوں کے سڑک چھاپ نام اور سڑکوں کے محلہ چھاپ نام تبدیل کرانے کی مہم چلائیں اور بمبئی میں ملازمت کی تلاش میں "مولوک" سے آئے ہوئے دو چار بے کار نوجوانوں کو بھینڈی بازار اور چور بازار کی گلیوں میں انقلاب زندہ باد کے نعرے لگاتے ہوئے گھمائیں اور راتوں رات(Over night) لیڈر بن جائیں۔
کون جائے ذوقؔ پر دلّی کی گلیاں چھوڑ کر
اوّل تو اس جد و جہد کے لیے ہمیں بمبئی میں کچھ "بھوک پیاس" کے دن گزارنا پڑیں گے اور اس سلسلے میں ہمیں کانگریس کی چڑوڑ کا تجربہ ہے نہ مسلم لیگ کی تحریک کا۔ ہم تو تیغوں کے سائے کی بجائے انگریزوں کے سایہ میں ہی پل کر جوان ہوئے ہیں۔ ہمیں جی حضوری کر کے پیٹ پالنا تو آتا ہے لیکن بھوکا رہنا ہمارے بس کی چیز نہیں۔
پھر یہ بھی خیال آیا کہ بمبئی میں آئے دن جو راستوں کے نام تبدیل کیے جا رہے ہیں اس سے بجائے راستہ پانے کے مسافر راستہ بھول جاتے ہیں اور ہم جیسے "نوواردانِ بساط بمبئی" کو اس بات کا شدید احساس ہے اور تلخ تجربہ بھی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ اپنے منے کا نام پانچ سال کی عمر تک قاسم رہنے دیں۔ پانچ سال کے بعد کاظم کر دیں۔ پھر دس سال بعد ہاشم۔ مزید پانچ سال کے بعد صاحب زادہ بلند اقبال کا اسم گرامی ناظم کر دیں۔ شاید ایسے موقع کے لیے ہی غالبؔ نے کہا ہے: -
پوچھتے ہیں وہ کہ غالبؔ کون ہے
تم ہی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا
اور کیا صاحب زادہ موصوف کی مضحکہ خیز پوزیشن نہیں ہو جائے گی جب ہر نام ٹمپریری (عارضی) ٹھہرا۔ وہ خود کو قاسم سمجھے کہ کاظم۔ ہاشم سمجھے کہ ناظم۔ ۔!
بے تکے ناموں کے سلسلے میں ہم صرف بمبئی والوں کی پگڑی نہیں اچھال سکتے جب پورا ملک اس میں ملوث ہے۔ مثال کے طور پر ضلع بلڈانہ(ودربھ) کے دیہاتوں کے نام لیجئے۔ چانگے پھل، مانگے پھل، جانے پھل ہم نے اپنی عمرِ عزیز کا حصۂ ثلاثہ اسی بات کی تحقیق میں صرف کر دیا کہ یہ فروٹ اب نہیں تو پراچین کال میں ضرور ہوں گے، اور شاید سیتا پھل، رام پھل، کاشی پھل کی نسل سے ہوں گے لیکن ہماری تحقیق پھل آور نہ ہو سکی۔ خان بھائیوں کا دیس خاندیش بھی اس سلسلہ میں ودربھ سے پیچھے نہیں۔ ملاحظہ کیجئے بھساول، بیاول، چناول وغیرہ وغیرہ۔ ہر شہر اپنی جگہ ول ول کرتا معلوم ہوتا ہے۔ خاندیش میں ایک گاؤں ایسا بھی ہے کہ گاؤں ہے ایک اور نام ہے چالیس گاؤں!
خوب انصاف تری انجمن ناز میں ہے
بھساول کے بڑے بوڑھوں کا کہنا ہے کہ علی بابا نے بھساول میں چالیس چوروں کے ٹھہرنے کے لیے چالیس دن میں "فورٹی بلاکس" تعمیر کیے تھے یہ فورٹی بلاکس آج بھی موجود ہیں اور ریلوے کے ملازم ان میں رہتے ہیں۔ واضح ہو کہ بھساول ملک

کا ایک بہت بڑا ریلوے جنکشن ہے اور آج بھی اس کی لوکلیٹی(Locality)فورٹی بلاکس کے نام ہی سے پکارا جاتا ہے۔ اس سے اس بات کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ علی بابا کے زمانے میں انگریزی ثانوی زبان کا درجہ حاصل کر چکی تھی۔ خیر چھوڑیئے اس بحث کو۔ بھساول کے عمر رسیدہ لوگوں کا کہنا ہے کہ اس زمانے میں آج کل کی طرح جھونپڑپٹی نہیں تھی پھر بھی ان فورٹی بلاکس میں چالیس چوروں کو رہائش توہین آمیز معلوم ہوئی تو علی بابا نے بھساول سے بہت دور مغرب میں چالیس چوروں کے لیے ایک دوسرے سے متصل چالیس گاؤں بسا دیئے۔ اور ان سب کو ملا کر ایک نام چالیس گاؤں رکھا اور خود نے کوکن جا کر علی پور بسا لیا۔ چنانچہ علی پور آج بھی کوکن میں آباد ہے۔ مزید تحقیق سے پتہ چلا کہ علی بابا چالیس چور اور چندر گپت کا ایک زمانہ تھا۔ یہ بات آج کل کے چوروں کو بھی معلوم ہے کہ چندر گپت کے زمانے میں چوری نہیں ہوتی تھی۔ لوگ گھروں کو قفل نہیں لگاتے تھے۔ بعض چوروں کو تو ہم نے اپنے کانوں سے یہ کہتے سنا ہے کہ اے کاش وہ چندر گپت کے زمانے میں پیدا ہوتے تو بغیر کسی تکلیف کے چوری کر سکتے۔ آج کل کی طرح نہیں کہ علی گڑھ اور گودریج کے قفل توڑنے کی سر توڑ کوشش کرنی پڑتی ہے اور پسینہ پھوڑ محنت۔!

تعجب ہوتا ہے کہ ایسے زمانے میں بھی علی بابا نے چالیس چور کہاں سے ریکروٹ کیے ہوں گے۔ لیکن بھائی صاحب ہر زمانے میں اچھے برے لوگوں نے اس دھرتی پر طبع آزمائی فرمائی ہے۔

ہم بمبئی کی باتیں کرتے کرتے خوامخواہ تحقیق و تبصرہ پر اتر آئے لیکن سچ پوچھئے تو تحقیق اتنا دلچسپ مشغلہ ہے کہ جس ایم۔ اے کو دیکھئے پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لیے اتاؤلا ہو رہا ہے۔ وہ تو خیریت ہوئی کہ صرف ایم۔ اے کے بعد ہی پی۔ ایچ۔ ڈی کر سکتے ہیں ورنہ ہم جیسے ترقی پسند مصنف میٹرک کے بعد ہی پی۔ ایچ۔ ڈی کر لیتے اور جس طرح آج بھی خاندیش میں میٹرک کے بعد ایل۔ ایل۔ بی کئے ہوئے وکیل اپنے گھر کے سامنے نام کی تختی پر صرف ایل۔ ایل۔ بی لکھتے ہیں اس طرح ہم بھی اپنے نام کی تختی پر صرف پی۔ ایچ۔ ڈی لکھتے۔

ہم جان توڑ کر اور سر جوڑ کر یہ بات اس لیے کر رہے ہیں کہ راقم الحروف نے بھی تاج محل پر تھیسس لکھی ہے۔ اس میں ہم نے اس بات کا انکشاف کیا ہے کہ تاج محل کسی زمانے میں قطب مینار تھا۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہوا کہ قطب الدین ایبک نے دو قطب مینار بنوائے تھے۔ ایک دلّی میں دوسرا آگرہ میں۔ قطب الدین بادشاہ کے برسوں بعد جب شہنشاہ شاہجہاں آگرے میں مقیم تھا اس وقت اس نے آگرہ کے قطب مینار میں مزید تین مینار ایڈ کر کے اور درمیان میں گنبد اٹھا کر اس کو تاج محل کی موجودہ شکل دے دی تھی۔ ممتاز محل کی غیر متوقع موت کی وجہ سے شاہ جہاں کے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ کوئی بلڈنگ تعمیر کروا سکتا۔

تاریخی تحقیق کی طرح ادبی تحقیق بھی کچھ کم دلچسپ نہیں ہندوستان کے ایک مشہور شاعر نے اس سلسلے میں بہت دور کی کوڑی لائی ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ شاہجہاں نے اپنی بے انتہا دولت کا سہارا لے کر ہیر رانجھا، لیلیٰ مجنوں سسی پنوں وغیرہ کا بڑی بے ہودگی سے مذاق اڑایا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

فکر ہر کس بقدر ہمت او ست

حیدر بیابانی

حیدر بیابانی، یکم جولائی۱۹۴۸ کو کرج گاؤں (ضلع امراؤتی)میں پیدا ہوئے۔ بچوں کے شاعر کی حیثیت سے اپنی شناخت مستحکم کروا چکے ہیں۔ ان کی ۳۳ کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان کی کئی منظومات مختلف درسی کتابوں میں شامل ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی تخلیقات میں روانی اور شگفتگی پائی جاتی ہے۔ انھوں نے سماجی موضوعات پر بھی ظریفانہ نظمیں لکھی ہیں۔ ’حیدر بیابانی کی طفلی نظموں میں بھی ظرافت کی آمیزش موجود ہے۔ انھوں نے عصری زندگی کے مسائل کی عکاسی کرنے والی طنزیہ منظومات بھی قلم بند کی ہیں۔

’’چشم دید‘‘ (۱۹۹۰)ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ہے جس میں شامل چند نگارشات کے عنوانات سے ان کے موضوعات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ با کمال شوہر، بد زبان بیوی، نمک کی چمک اور ہم صاحبِ کتاب ہوئے۔

داستان بیوی

حیدر بیا بانی

یہ داستان جادو بیان نہ تو داستان الف لیلیٰ ہے نہ ہی داستان طوطا مینا ہے یہ وہ زبان زد خاص و عام داستان ہے جو گھر گھر صبح و شام کہی سنی جاتی ہے اور اپنے رنگا رنگی سے کہیں گدگداتی ہے اور کہیں خون کے آنسو رلاتی ہے۔ آدم و حوّا سے لے کر ہم اور ہماری بیویوں تک شیطان کی آنت جیسی اس داستان میں توتو میں میں، گالی گلوچ، دھول دھپّا، سبھی کچھ بدرجۂ اتم موجود ہے۔ لیکن اس داستان کو با قاعدہ ضبط تحریر میں لانے کا بیڑہ آج تک کوئی سر فروش شوہر نہیں اُٹھا سکا مگر آج ہم نے اوکھلی میں سر دینے کا فیصلہ کر لیا ہے گویا خود اپنا سامان قتل مہر ادا کر لیا ہے۔

داستان بیوی کی داستان گو کوئی ہر ان زن مرید کسی ذاکرہ بیگم کا میاں ذاکر خان ہونا چاہیے تھا۔ ہم ٹھہرے شوہر نئے نویلے بھی اور تھوڑے بہت رنگیلے اور کٹیلے بھی، اس کا گریبان زیادہ رقت آمیز نہ ہو کر تلخ ہو جائے تو ہم روئے زمین کی تمام مرد مار بیویوں اور سارے ستم رسیدہ بیوی گزیدہ شوہروں سے معافی کے خواستگار ہیں اور ان کی ہمدردیوں کے طلبگار رہیں۔ ذکر بیوی کے ساتھ شوہر کا ذکر بھی لازم و ملزوم ہے اس لیے اس بے چارے ستم کے مارے کا عبرت ناک احوال جا بجا آئے گا اور ہر کسی کو آٹھ آٹھ آنسو رلائے گا۔ دنیا کے سروے پر نکلا جائے تو لاکھوں مردوں میں ایک آدھ مرد تیس مار خاں نکلے گا۔ لیکن ہر عورت ضرور ایک مرد مار عورت کہلائے جانے کی مستحق ہے۔ بیوی کے معاملے میں مرد سرد مزاج واقع ہوا ہے اس کے بر خلاف بیگم اپنے شوہر کے لیے انتہائی گرم مزاج ہوتی ہے۔ دنیا کی آدھی عورتیں اگر مرد مار (یعنی شادی شدہ ہو چکی ہیں تو) آدھی ضرور ہونے والی ہیں یعنی شوہر شکار ہوتا ہے اور بیگم (ضیغم نما) شکاری۔ ویسے بھی مرد ابتداء سے مردہ گردانا جاتا ہے۔ لیکن زن کو ہر دور میں زندوں میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ غالبؔ کی زبان میں دھول دھپّا اس سراپا ناز کا (یعنی بیوی کا) شیوہ نہیں ہوتا ہے۔ شامت اعمال ہی کسی نہ کسی صورت نہ پیش دستی کروا لیتی ہے۔ بیوی زبان چلانے کے ساتھ ساتھ بیلن چلا نے کا فن سیکھ کر بیلن اٹھائے شوہر کے پیچھے دوڑتی ہے اور شوہر بھاگ کر پلنگ کے نیچے پناہ لیتا ہے۔ وہ للکارتی ہے۔ اب نکلو باہر۔ شوہر وہیں دبکے دبکے دھاڑتا ہے۔ نہیں نکلوں گا میرا اپنا گھر ہے۔ جہاں چاہوں رہوں۔ کبھی کبھی وہ غصّہ میں باورچی خانے کے برتن اُٹھا اُٹھا کر کھینچ مارتی ہے۔ اور میاں بیوی دونوں خوش ہوتے۔ نشانہ ٹھیک لگا تو بیوی خوش ہو جاتی ہے اور خطا ہو گیا تو شوہر بغلیں بجاتا ہے اس طرح ہنسی خوشی دو پہیوں والی گرہستی کی یہ گاڑی چلتی رہتی ہے۔

دوستوں کی محفل میں ہر شوہر بیوی کو باندی اور خود کو شہنشاہ پوز کرتا ہے۔ دوسری طرف سہیلیوں کی انجمن میں بیوی اپنے آپ کو پاشا اور شوہر کو شاگرد پیشہ سے متعلق گردانتی ہے۔ دونوں باتوں میں ایک ہی بات پچ سکتی ہے اور سارے ووٹ بیوی کے حق میں جاتے ہیں۔ بیوی اپنے شوہر کا نصف بہتر کہلاتی ہے اور بچا ہوا نصف بدتر شوہر رہ جاتا ہے۔

عورتیں فطرتاً باتونی ہوتی ہیں اسی لیے کہا گیا ہے کہ دنیا کا سب سے تعجب خیز واقعہ وہ ہو گا جب کچھ عورتیں کہیں مل بیٹھی ہوں اور وہاں مکمل خاموشی چھائی رہے کسی شخص نے اپنے ساتھی سے سوال کیا کہ عورت زیادہ بول سکتی ہے یا گیدڑ؟ تو اس جہاں دیدہ کا جواب تھا۔ عورت اگر موضوع بولنے کا مقابلہ ہو!

شادی سے پہلے اگر کسی لڑکی کی کم سخنی کے چرچے ہوں تو سمجھ لیجیے کہ وہ یہ کسر کسی نہ کسی کی بیوی ہونے کے بعد نکال لے گی۔ مسلسل بولنے والی بیوی کی ایسی ہی فطرت سے عاجز آئے ایک شوہر کو ڈاکٹر نے خبردار کیا اگر آپ نے شراب نوشی جاری رکھی تو آپ بالکل بہرے ہو سکتے ہیں۔ شوہر نے جواب دیا۔ دیکھیے ڈاکٹر! جو کچھ میں پیتا ہوں وہ اس سے یقیناً بہتر ہے جو میں سنتا ہوں۔

بیوی کو رام کرنے کا آسان طریقہ اس کی کوئی فرمائش پوری کر دینا یا پوری کر دینے کا محض وعدہ کر لینا ہے۔ نئی ساڑیاں اور زیورات بیوی کی کمزوری ہیں۔ اپنی آرائشی چیزوں کے سامنے اُسے کسی بات کی فکر نہیں ہوتی ہے حتیٰ کہ اپنے شوہر کی بھی نہیں۔ ایک عورت سے گھبرائی ہوئی ملازمہ نے بتلایا۔ صاحب دروازے کے پاس بے ہوش پڑے ہیں۔ اُن کے نزدیک ایک بڑا سا پیکیٹ بھی پڑا ہے۔ عورت چہک کر بولی خوب! میری نئی ساڑیاں آ گئی ہیں۔ ایک دوسری عورت نے قیمتی جَڑاؤ ہار خریدتے وقت جوہری سے کہا اگر خدا نہ خواستہ یہ ہار میرے شوہر کو پسند نہ آیا تو وعدہ کیجیے آپ اسے واپس لینے سے انکار کر دیں گے۔

دوسری طرف وہ اپنے شوہر کے لیے بے حد کنجوس ہو جاتی ہے پوری تنخواہ ہاتھ لیتی ہے اور پائی پائی کا حساب لے کر غریب شوہر کو پسینہ پسینہ کر دیتی ہے۔ ایک عورت روزانہ اپنے شوہر کو بس کی ٹکٹ کے لیے ایک روپیہ دیتی تھی۔ ایک دن دفتر سے واپسی پر شوہر خوشی سے پاگل بنا گھر میں داخل ہوا اور بیوی کو پکار کے کہنے لگا۔ بیگم سنو تو سہی بہت بڑی خوشخبری ہے، میں نے لاٹری میں ایک لاکھ کا انعام حاصل کیا ہے۔ بیوی نے سرد لہجے میں دریافت کیا، ' پہلے یہ بتاؤ لاٹری کا ٹکٹ خریدنے کے لیے تمھارے پاس روپے آئے کہاں سے؟'

بیوی انسان کی اہم ترین ضرورتوں میں سے ایک ہے۔ روٹی، کپڑا اور مکان کے بعد اسی کا نمبر آتا ہے۔ لیکن بیویوں کی ایسی مردم آزاریاں دیکھ کر آج کل بیوی بیزاری کی لہر زوروں پر ہے۔ ایک شخص نے بات چیت کے دوران اپنے دوست سے کہا یار سگریٹ کی عادت تو چھوٹ گئی لیکن شراب نہیں چھوٹ پا رہی ہے۔ دوست نے پوچھا۔ ایسی کون سی بات ہے؟ جواب ملا۔
سگریٹ کے لیے تو بیوی نے بچّے کی قسم دی تھی لیکن شراب کے لیے اپنی۔ ایک اور بیوی بیزار شوہر سے ڈاکٹر نے کہا آپ کی بیوی کی حالت بہت نازک ہے۔ بمشکل وہ دس پندرہ دن ہی جی پائیں گی۔ شوہر نے ٹھنڈی سانس بھر کر کہا کوئی بات نہیں جہاں پچیس سال کاٹ لیے وہاں دس پندرہ دن اور سہی۔ لیکن کہیں کہیں شوہر بڑے خطر ناک قدم اُٹھا لیتے ہیں۔ ایک صاحب نے اپنی بیوی کی سال گرہ پر اُسے دفتر سے چپراسی کے ہاتھوں ایک تحفہ بھجوایا خوش قسمتی سے بیوی اس وقت گھر میں موجود نہ تھی جب پیکٹ دھماکے کے ساتھ پھٹ پڑا۔
بہت ساری بیویاں ایسی ہوتی ہے جن سے شیطان نما شوہر بھی پناہ مانگتے نظر آتے ہیں۔ خدا اس کام کا جی بیوی سے بچائے جو سوئے ہوئے شوہر کو نیند کی گولی کھلانے کے لیے گہری نیند سے جگاتی ہے اور اُس جاہل بیوی سے ہر خاص و عام محفوظ رہے جس نے اپنے لیڈر شوہر کی زبانی جب کسی بھاشن میں سن لیا تھا کہ ہمیں امیر اور غریب بیچ کی کھائی کو بھرنا ہے تو وہ میکہ نواز بضد ہو گئی کہ کھائی بھرنے کا ٹھیکہ اس کے بھائی کو ہی ملنا چاہیے۔
بیوی اور پڑوسن کا رشتہ (ساس بہو کے رشتہ کے بعد)بڑا خطر ناک ہوتا ہے اگر خدا کا کرنا دونوں دوست بن جائیں تو ہر گھڑی آؤ پڑوسن باتیں کرتیں بیٹھنے سے بیگار بھلی والا کلائمیکس اسکرین پر لہراتا رہتا ہے۔ اور اگر خدا نخواستہ دونوں دشمن بن جائیں تو پھر آؤ پڑوسن جھگڑا کریں، بیٹھنے سے بیکار بھلی والی سچویشن بنی رہتی ہے اور دونوں ہی حالتوں میں غریب شوہر کا دم ناک میں آتا جاتا رہتا ہے۔
پرانے وقتوں میں بیوی پیر کی جوتی اور خاوند خداوند ہوتا تھا لیکن آج کل خاوند کی قیمت دو کوڑی کی رہ گئی ہے اور بیوی کے نزدیک گھر کی مرغی دال برابر ہو گئی ہے۔ مرد بے چارہ بیوی کے حسن جہاں سوز کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملاتا ہے۔ چہرے کو چاند، زلفوں کو گھٹا اور جسم کو تاج محل تک کہہ اٹھتا ہے لیکن بیوی چلو ہٹو جھوٹے کہیں کے کہہ کر تمام کیے کرائے پر پانی پھیر دیتی ہے ایک شوہر نا مراد نئی نویلی بیوی کی زلفوں کی تعریف کرتے کرتے کہہ اُٹھے: ’’تم نے مجھے اپنی زلفوں میں گرفتار کر لیا ہے۔‘‘ یہ سن کر بیوی نے جھٹ اپنی وگ اتار کر یہ کہتے ہوئے شوہر کے ہاتھ پر رکھ دی۔ ’’جاؤ تمھیں آزاد کیا۔‘‘
زمانے کے ساتھ ساتھ بیوی کے رہنے، پہننے، اوڑھنے حتیٰ کہ سوچنے سمجھنے کے انداز میں بھی تبدیلی واقع ہوتی ہے پچھلے دنوں اگر شوہر پر دیس گیا ہوتا تو بے چاری بیوی ہر نئے دن رین برہ کی آگ میں جلتی رہتی تھی لیکن آج کی بیوی ایسی کچھ نہیں ہے۔ شوہر دورے پر گئے ہیں۔ بیوی سوچتی ہیں ادھر بنارسی ساڑیاں سستی اور اچھی ملتی ہیں دیکھیں انھیں لانا یاد بھی ہے یا نہیں۔ یا پھر پہلی تاریخ ہے تنخواہ کا دن بیوی راہ میں آنکھیں بچھائے راہ نہارتے نہارتے گھبرا اٹھتی ہے، ہائے اللہ شام ہو گئی نہ جانے کب آئیں گے۔ کب بازار جائیں گے اور کب سودا سلف آئے گا کہیں پیسہ ادھر اُدھر نہ کر دیں۔ مہینہ بھر تنگی رہے گی۔ موجودہ دور ملاوٹ کا دور ہے۔ بیوی بھی خالص نہیں ملتی۔ اب نہ شیام کی جو گنیں ہیں، نہ پر دیس کی برہنیں۔ نہ ہجر کا لطف ہے نہ وصل کی لذتیں۔ زمانے کی الٹ پھیر نے سب کچھ الٹ پلٹ کر رکھ دیا ہے۔ (چشم دید ۱۹۹۰)

محمد طارق

محمد طارق ۱۷، مارچ ۱۹۵۳ کو کھولاپور (ضلع امراؤتی) میں پیدا ہوئے۔ پیشۂ تدریس سے وابستہ رہے اور سبک دوش ہوئے۔ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کی کہانیاں اور افسانچے اردو کے مقتدر رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں اور کتابی شکل میں بھی منظرِ عام پر
آ چکے ہیں۔ انھوں نے طنزیہ مضامین، بچوں کے لیے کہانیاں اور تنقیدی مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ کانٹے دار فصل اور عینی شاہد ان کے افسانوی مجموعے ہیں۔
’’چوزے کی حمایت میں‘‘ ان کی فکاہیہ تحریروں کا مجموعہ ہے جس میں ان کے افسانوں ہی کی طرح سماج کو بے نقاب کرنے کی کوشش نمایاں ہے مگر یہاں انداز ظریفانہ ہے۔ انھوں نے بچوں کے لئے بھی دلچسپ کہانیاں لکھی ہیں۔ رابطہ:
8055503366

مولانا مد ظلہ العالی

محمد طارق

دائرے چھوٹے بڑے قسم کے ہوتے ہیں۔ ایک دائرہ اسلام کا دائرہ کہلاتا ہے۔ پہلے لوگ اس دائرے میں لوگوں کو داخل کیا کرتے تھے۔ لیکن آج کل داخلہ ممنوع ہے صرف خارج کرتے ہیں۔ چل نکل اسلام کے دائرے سے ...
معروف مزاح نگار ابن انشاء کی اس بات پر مولانا مد ظلہ العالی عمل پیرا ہی نہیں بلکہ ثابت قدم بھی ہیں۔ ہر جمعہ کو خطبہ سے پہلے عدالت الٰہی کے جج بن جاتے ہیں۔ اپنے بیان میں مصلیان ہی نہیں بلکہ گاوں کے سارے مسلمانوں کا حساب کتاب کر کے اپنے حمایتیوں کو جنت کی بشارت اور مخالفین کو جہنم کی رسید عنایت کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو کافر فاسق فاجر اور منافق بنا دینا تو ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔
نماز جمعہ کے بعد ایک منچلا ان سے بولا، ''مولی (مولوی)صاحب آپ نے اللہ میاں کا کام کتنا آسان کر دیا! گاؤں کے سارے مسلمانوں کا حساب کتاب پورا کر دیا۔ اب میدان حشر میں اللہ میاں کے ذمہ صرف یہاں کے ہندوؤں کا حساب کتاب باقی ہے۔''
منچلے کی بات سن کر مولانا مد ظلہ العالی اسے گھور کر دیکھنے لگے۔ منچلا مسکین صورت بنا کر مولانا مد ظلہ العالی کو تکنے لگا۔ کچھ دیر ماہر ہپناٹسٹ کی طرح گھورنے کے بعد گرجدار آواز ان کے منہ سے نکلی۔ استغفر اللہ۔ آواز اتنی گرجدار تھی کہ مسجد کی دیوار کی منڈیر پر بیٹھا کالا کوا اڑ گیا۔ شاید کسی جھوٹے کو کاٹنے کے لیے۔ مگر سماج میں جھوٹے اتنے ہو گئے ہیں کہ کالا کوا کاٹے تو کس کس کو کاٹے۔ بیچارہ صرف گانے کے مکھڑے کا بھرم قائم رکھے ہوئے ہے۔ جھوٹ بولے کوا کاٹے کالے کوے سے ڈریو۔ خیر
استغفر اللہ کہنے کے بعد مولانا مد ظلہ العالی نے منچلے کو ڈانٹا۔ ''مذاق اڑاتے ہو ہمارے بیان کا؟ ہم قرآن و حدیث کی روشنی میں بات کرتے ہیں۔ اللہ دل سے ایمان سلب کر لے گا۔ موت کے وقت کلمہ نصیب نہیں ہو گا۔'' مولانا مد ظلہ العالی نے کسی دل جلی عورت کی طرح کوسا، منچلے نے ادھر ادھر دیکھا، مولانا کا کوئی حمایتی آس پاس نہیں تھا۔ اس نے دل ہی دل میں اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کیا اور سر جھکا کر نکل پڑا۔
اس واقعہ کے بعد جب جمعہ آیا تب من چلے کی بات کو موضوع بنا کر مولانا مد ظلہ العالی نے لچھے دار بیان دیا۔ ایک عادت موصوف دامت برکاتہ میں بڑی اچھی ہے کہ وہ بیان میں ڈائرکٹ حملہ نہیں کرتے۔ اِن ڈایرکٹ میں دل کھول کر غبار اڑا دیتے ہیں۔
اس جمعہ کی تقریر میں انھوں نے علماء کی اہمیت بیان کرتے ہوئے یہ فرما دیا تھا کہ، ''علماء کو محبت کی نظر سے دیکھنا بھی ثواب ہے۔'' پھر کیا تھا، گاوں کے کم و بیش سارے مسلمان مولانا مد ظلہ العالی کو محبت کی نظر سے دیکھنے لگے تھے۔ کوئی آنکھیں سکیڑ کر محبت کی نظر سے دیکھ رہا تھا تو کوئی آنکھیں پھاڑ کر۔ جن لوگوں کو بعید النظری یا قریب النظری کی شکایت تھی وہ بے چارے چشمہ لگا لگا کر مولانا مد ظلہ العالی کو محبت کی نظر سے دیکھنے کی کوشش میں اپنی توانائی صرف کرنے لگے تھے۔ ایک معتقد نے تو ارجنٹ میں اپنا موتیا بند کا آپریشن اسی لیے کروایا تھا کہ وہ جلد از جلد مولانا مد ظلہ العالی کو محبت کی نظر سے دیکھ سکے۔ محبت کی نظر سے دیکھنے میں ثواب کی بات جب مسلمانوں کے گھروں میں پہنچی تو ثواب کمانے کے لیے گھروں کی عورتیں، کیا بوڑھی کیا ادھیڑ، کیا جوان کیا کنواریاں، شادی شدہ ساری عورتیں مولانا مد ظلہ العالی کو محبت کی نظر سے دیکھنے کے لیے بیتاب ہو گئیں۔
جب بھی مولانا مد ظلہ العالی راستے سے گذرتے ہیں، گھروں میں خبریں پہنچ جاتی ہیں اور عورتیں اپنا کام دھندا چھوڑ کر کوئی دروازوں کے پٹوں کے پیچھے، کوئی کھڑکیوں میں مولانا مد ظلہ العالی کو محبت کی نظر سے دیکھنے کے لیے کھڑی ہو جاتی۔ گاوں کی کچھ گلیاں ایسی تھیں جہاں مولانا مد ظلہ العالی کا گذر نہیں ہوتا تھا۔ وہاں کے گھروں کی عورتوں کو ثواب سے محرومی کا افسوس ہونے لگا۔ وہ مولانا مد ظلہ العالی کے گھر پہنچ گئیں۔
ان کی بیگم نے پوچھا، ''آپ کیسے تشریف لائیں؟'' عورتیں کہنے لگیں، ''مولانا صاحب کو محبت کی نظر سے دیکھنے کے لیے کیونکہ انھوں نے کہا تھا کہ علماء کو محبت کی نظر سے دیکھنا ثواب ہے۔''
مولانا مد ظلہ العالی کی بیگم صاحبہ کے دل پر آرے چل گئے۔ وہ بھی کوئی معمولی عورت نہیں تھی۔ عالمہ تھیں عالمہ۔ موقع و محل دیکھ کر صبر و ضبط سے کام لیا۔ کہا، ''مولوی صاحب نے جو کہا وہ مردوں کے لیے ہے۔ قرآن کی روشنی میں عورت کے لیے تو یہ ہے کہ وہ اپنے شوہر کو محبت کی نظر سے دیکھے۔''
''اماں کس کے پاس اتنی فرصت ہے؟'' ایک ادھیڑ عمر کی عورت ہاتھ نچا کر کہنے لگی۔ ''ہمارے گھر میں تو اندھیرا ہی اندھیرا

ہے۔ کہاں قرآن و حدیث کی روشنی؟ ایک ٹمٹماتا بلب جلتا رہتا ہے۔ میں دن ڈوبے تک کھیت میں کام کرتی ہوں اور میرا میاں حمالی کرتا ہے۔ شام میں ہم گھر آتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں اور سو جاتے ہیں۔''
مولانا مد ظلہ العالی کی بیگم صاحبہ نے اس عورت سے کچھ نہیں کہا۔ وہ چاہ رہی تھیں کہ کسی طرح جلد از جلد وہ عورتیں ان کے گھر سے نکل جائیں تاکہ مولانا مد ظلہ العالی کی اچھی طرح سے پریڈ لے سکیں۔
عورتیں کچھ دیر کھڑی رہیں پھر مایوس ہو کر چلی گئیں۔ مولانا مد ظلہ العالی کی بیگم صاحبہ نے فوراً دروازے کی کنڈی لگا دی۔ کمرے میں مولانا مد ظلہ العالی کرسی پر دم سادھے، سر جھکائے سہمے سہمے خاموش بیٹھے تھے۔ بیگم صاحبہ کمرے میں داخل ہوئیں۔ ''کیوں جی! بیان میں یہ کہہ دیا آپ نے؟ علما کو محبت کی نظر سے دیکھنا ثواب کا کام بتا دیا۔ بہت ساری عورتیں آپ کا دیدار کرنے کے لیے گھر آ گئی تھیں۔''
''میں نے مردوں کے لیے کہا تھا۔ اپنی حیثیت ٹکائے رکھنے کے لیے ایسا کہنا ہی پڑتا ہے۔''
''مجھے مت سمجھائیے۔ اگلے بیان میں اپنی بات کی وضاحت کیجیے یا بیان واپس لیجیے۔''
''نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میں کوئی نیتا نہیں ہوں کہ اپوزیشن کے دباؤ میں بیان واپس لے لوں۔ مولانا ہوں مولانا۔ قرآن و حدیث کی روشنی میں بات کرتا ہوں۔''
''بہت آئے قرآن و حدیث کی روشنی میں بات کرنے والے۔ گھر میں تو کبھی قرآن کھولتے ہیں نہ حدیث کی کتاب پڑھتے ہیں۔ جب بھی فرصت میں بیٹھتے ہیں اسمارٹ فون کی اسکرین پر انگلیاں چلاتے رہتے ہیں۔''
مولانا مد ظلہ العالی بیگم صاحبہ کی ڈانٹ سر جھکائے خاموشی سے اس لیے سن رہے تھے کہ وہ غلط نہیں کہہ رہی تھیں۔ کالا کوا گھر کی منڈیر پر خاموش بیٹھا تھا۔ بیگم صاحبہ کی ہمت بڑھی وہ شہادت کی انگلی اٹھا کر بولیں، ''دیکھیے اگر آپ نے اپنا بیان واپس نہ لیا یا اس کی وضاحت نہ کی تو میں بھی آپ کے دوست ہارون مولانا صاحب کو محبت کی نظر سے دیکھنے لگوں گی۔''
بیگم صاحبہ کے منہ سے یہ وارننگ سنتے ہی مولانا مد ظلہ العالی طیش کے مارے کرسی سے کھڑے ہو گئے۔ پھر جیسے ان کے اندر فلم، مغل اعظم کے کردار اکبر اعظم کی روح حلول کر گئی۔ وہ بالکل پرتھوی راج کپور کے انداز میں گرجے، ''خاموش ہم تمھیں پردوں کی دیواروں میں قید کر دیں گے۔''
جلال میں یہ کہہ کر مولانا مد ظلہ العالی دامت برکاتہ گھر سے نکل پڑے اور ذہن میں اپنے اس دوست سے قطع تعلق کرنے کی منصوبہ بندی کرنے لگے جس پر محبت کی نظریں پھینکنے کی وارننگ بیگم صاحبہ انہیں دے چکی تھیں۔
(چوزے کی حمایت میں)

ایس ایس علی

ایس ایس علی (سید سکندر علی) ۵ٍ جنوری ۱۹۴۹ کو اکولہ میں پید ہوئے۔ ایم ایس سی، بی ایڈ کرنے کے بعد پیشہ ٔتدریس کو اپنایا۔ ان کے کئی مضامین ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوئے۔ ۲۴ طنزیہ و مزاحیہ مضامین پر مشتمل کتاب کھل جا سم سم (۲۰۱۵)میں منظرِ عام پر آئی۔
ایس ایس علی نے سائنس سے متعلق مضامین اور افسانوں کے علاوہ انگریزی روزنامے ناگپور ٹائمز اور ہتواد میں انگریزی میں مڈل بھی لکھے۔ ان کے طنزیہ مضامین میں عام طور پر سماجی بے راہ روی اور شخصی بے اعتدالیوں پر گہرے طنز کے عمدہ نمونے موجود ہیں۔ مورخہ ۱۹ ٍ مئی۲۰۲۰ کو اکولہ میں انتقال ہوا۔

سبھی اُس شوخ کے مارے ہوئے ہیں

ایس۔ ایس۔ علی

آج کے تیز رفتار دور میں مصنف ہو یا مرتب، جلد از جلد اپنی کتاب کو شائع کر کے قارئین تک پہچانا چاہتا ہے۔ وہ کتاب کو خلوص، محبت، احترام اور نہ جانے کون کون سے جذبوں کے ساتھ قارئین کی خدمت میں پیش کرتا ہے۔ لیکن کیا آپ یقین کریں

گے کہ کوئی مرتب اپنی کتاب کو طبع کرنے کے پورے پندرہ سال بعد شائع کرتا ہے؟ اور کتاب کو خلوص، محبت، احترام کی بجائے معذرت اور شرمندگی کے ساتھ پیش کرتا ہے؟ یقین نہیں آتا نا؟ ہمیں بھی یقین نہ آتا اگر ہم خود اس روایت کے راوی ہوتے! ہوا یوں کہ ایک دن ہم شکیل اعجاز صاحب کے یہاں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ میاں شکیل پسینے میں تر بتر، دھول میں اٹے ہوئے، تھکے ماندے اور پریشان حال دروازے پر کھڑے ہمیں تک رہے ہیں، گویا کہہ رہے ہوں کہیے کیا کام ہے؟ لیکن جب ہم نے اپنے مخصوص انداز میں کھنکارا تو وہ ہوش میں آئے اور یہ دیکھ کر کہ یہ ہم ہیں، انھوں نے ہمیں اندر بلایا۔ کچھ رسمی باتوں کے بعد انھوں نے اپنی پریشان حالی کا سبب یہ بتایا کہ گذشتہ تین چار روز سے وہ اپنی مرتب کردہ کتاب اوراقِ مصور کی جِلد بندی میں لگے ہوئے تھے۔ پھر انھوں نے اوراقِ مصور کی ایک جلد ہمیں دیتے ہوئے کہا۔ یہ کتاب میں آپ کی خدمت میں معذرت کے ساتھ پیش کر رہا ہوں۔ ہم نے حیرت سے ان کی جانب دیکھا اور کتاب کا سرِ ورق اُلٹا تو پہلے ہی صفحے پر اُن کے ہاتھ کی لکھی ہوئی تحریر نظر آئی جو اس طرح تھی۔ سکندر بھائی کے لیے۔ پندرہ سال قبل اس کتاب کے اوراق شائع ہوئے تھے۔ اب اس کو مکمل صورت میں پیش کرتے ہوئے مجھے خوشی نہیں بلکہ شرمندگی ہے۔ صرف یہی درخواست ہے کہ غلطیوں کے اس پلندے کو پیار سے مطالعہ فرمائیں۔ تحریر کے نیچے ان کی دستخط تھی۔

انسان کی فطرت ہے کہ دوسروں کی خوبیوں کی بہ نسبت ان کی خامیوں پر جلد نظر جاتی ہے۔ لہٰذا ہر قاری عام طور پر کوئی تحریر پڑھتے وقت قاری کم اور پروف ریڈر و نقاد زیادہ ہوتا ہے۔ اب جب کہ شکیل میاں نے خود اپنی کتاب کو غلطیوں کا پلندہ قرار دے دیا ہے تو پھر ظاہر ہے کہ ہماری آنکھوں نے ایک لینس نقاد کا اور دوسرا لینس پروف ریڈر کا چڑھا لیا۔ لیکن پھر جلد ہی ہمیں یہ دونوں لینس اُتارنے پڑے کیوں کہ انھوں نے خواہش ظاہر کی تھی کہ کتاب کا مطالعہ پیار سے کیا جائے۔ لہٰذا ہم نے اپنی تمام مصروفیات کو بالائے طاق رکھ کر مطالعہ شروع کر دیا۔

اوراق مصور در اصل ریجنل کالج آف ایجوکیشن بھوپال کے علمی و ادبی جریدے کا خصوصی شمارہ ہے۔ اس کا دیباچہ مذکورہ کالج کے شعبہ اردو کے صدر ڈاکٹر اخلاق اثر صاحب کا لکھا ہوا ہے، شیخ رحمٰن اکولوی، اور ایم۔ آئی ساجد کے افسانے ہیں۔ فداء المصطفی فدوی کی غزل ہے، پھر خود شکیل اعجاز، عبد الرحیم نشتر، محمد خضر حیات اور رشید آثار کے سوانحی مضامین ہیں۔ یہ تمام لوگ مذکورہ کالج کے طلباء رہ چکے ہیں۔ اس کے بعد رفیق شاکر کا مختصر تحقیقی مقالہ برار میں اردو شاعری کا آغاز و ارتقاء ہے اور آخر میں اکولہ ضلع کے شعراء کا تعارف اور نمونہ کلام ہے۔

داد دیجیے ہمارے صبر و تحمل اور ہماری دوست داری کی کہ ہم نے اس عدیم الفرصتی کے دور میں اس کتاب کو Cover to Coverپڑھ ڈالا۔ خلاصہ اس مطالعہ کا یہ ہے کہ یہ کتاب اوراقِ مصوّر در حقیقت ایک طویل سوالنامہ یا امتحانی پرچہ ہے۔ قاری کو ذہنی آزمائش میں مبتلا کرنے کے لیے مروج طریقوں کے علاوہ بعض عجیب و غریب طریقے بھی اپنائے گئے ہیں۔ اس سوال نامہ میں سب سے زیادہ weightage خالی جگہ پُر کرنے والے سوال کو دیا گیا ہے۔ پوری کتاب میں بیسیوں مقامات پر آپ کو خالی جگہیں پُر کرنی ہیں۔ مثلاً یہ چند جملے:

غرض کے بعد زندگی نئے دور میں .....قدم ہے، محمد خلیل الہدیٰ خان نام اور شارق تخلص سنہ .....میں پیدا ہوئے، والد کا نام..... ہے۔ اس سوال کے ذیل میں قاری کو دھوکہ دینے کے لیے کہیں کہیں غیر ضروری طور پر بھی خالی جگہیں چھوڑ دی گئی ہیں۔

اسی طرح مختصر جواب دیجیے کہ ذیل میں جگہ جگہ ایک، دو یا تین تین سطریں چھوڑ دی گئی ہیں۔ طویل جوابوں کے لیے پورا پورا صفحہ چھوڑا گیا ہے۔ اسی طرح رف کام کے لیے بھی کورے صفحات پر لکھا تھا۔ اور جب ہم مضمون کا پورا کا پورا ڈرافٹ انہیں کورے صفحات پر لکھا تھا۔ اور جب ہم مضمون کو Fairکر رہے تھے تو ہمارے درجہ ہفتم کے بچے ریاضی کے کچھ سوالات لے آئے۔ ہم نے انہیں اسی کتاب کے کورے صفحات پر حل کر کے سمجھایا۔ ہو سکتا ہے بیگم صاحبہ بھی دورانِ مطالعہ یاد آنے والے ضروری امور مثلاً کِرانے
کے سامان وغیرہ کی لسٹ بھی ان صفحات پر درج کر لیں کیوں کہ اس میں ابھی کافی گنجائش ہے۔

بعض جگہ ادھورے جملے دیے گئے ہیں۔ ذہین قاری اپنے طور پر انہیں مکمل کر کے کتاب کا لطف لے سکتا ہے۔ مثلاً غلام ربّانی، نعیم بالاپوری کے تعارف میں آخری جملہ اس طرح ہے۔ اسٹیج پر پہلی بار اکولہ میونسپل ٹاؤن ہال میں جشنِ غالب اس کے فوراً بعد غلام ربّانی کی غزل درج ہے۔

قاری کی ڈرائنگ کیسی ہے اس کو بھی آزمایا گیا ہے۔ کئی مقامات پر صرف چوکھٹا بنا ہوا ہے۔ اب دیکھنا ہے کہ قاری غزل کے اشعار کے اعتبار سے اس میں کونسی تصویر بناتا ہے۔ کہیں کہیں قاری کی آسانی کے لیے چوکھٹے میں تصویر کی آؤٹ لائن بھی کھینچ دی گئی ہے۔

املا درست کیجیے کے تحت کچھ بہت خوبصورت سے سوالات ہیں۔ مثلاً اصرار کے لیے اسرار اور ٹکٹکی کے لیے تکتکی لکھا گیا ہے۔ املا کی ان غلطیوں کو درست کرنا ہے۔ کتاب کا مطالعہ کرتے وقت قاری ہوش میں ہے یا نہیں یہ دیکھنا بھی مقصود ہے۔

اس لیے کچھ صفحات دو دو، تین تین بار نظر آئیں گے جبکہ سلسلہ کے کچھ صفحات غائب ہوں گے۔
اس کتاب کی ایک اہم بات یہ ہے کہ اس کے ذریعے بعض گھِسی پٹی کہاوتوں کو باطل قرار دیا گیا ہے۔ مثلاً فارسی کی کہاوت دیر آید درست آید اور انگریزی کی کہاوتBooks are the best Friends.
دوسروں کو غصّہ دلانے اور ان کی صلوٰتیں سننے میں بعض لوگوں کو بڑا مزا آتا ہے۔ شکیل صاحب نے بھی اس بات کا التزام کیا ہے کہ زیادہ سے زیادہ شعراء اغلاط کتابت کے لیے انہیں موردِ الزام ٹھہرائیں۔ ہمیں تو ایسا لگتا ہے کہ انھوں نے شرارتاً کتاب شائع کرنے میں اتنی تاخیر کی کیونکہ جو شعراء آج لکچرار اور پرنسپل بن چکے ہیں وہ کتاب کے لحاظ سے پرائمری یا سیکنڈری ٹیچر ہی ہیں۔ جو صاحب، صاحبِ کتاب بن چکے ہیں وہ کتاب کے لحاظ سے آج بھی نو مشق ہی ہیں۔ ان پندرہ سالوں میں شاعروں کی جو نئی کھیپ میدان میں آئی ہے ان کا نام و نشان بھی اس کتاب میں نہیں۔ خوش فہمی اور مغالطہ کا ایک پہلو یہ بھی پیدا ہو گیا ہے کہ۔ ء اور ۔۔۔ء کے دوران جو شعراء اللہ کو پیارے ہو گئے، تعارفی نوٹ کے مطابق وہ آج بھی بقیدِ حیات ہیں اور دھڑ لے سے طبع آزمائی کر رہے ہیں۔ ایک شاعر ایسے بھی ہیں جو عرصہ ہوا شاعری سے تائب ہو چکے ہیں اور آخرت کی فکر میں لگے ہوئے ہیں لیکن کتاب کے مطابق آج بھی شاعری (گناہِ بے لذّت)کیے جا رہے ہیں۔
کورے صفحات جو اس کتاب میں جا بجا نظر آتے ہیں قاری ان کا استعمال نوٹ لینے یا دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے بھی کر سکتا ہے۔ اپنے پسندیدہ شعراء کے تعارف اور نمونہ کلام کو شکیل صاحب نے دو دو، تین تین بار مختلف تصاویر کے ساتھ شامل کیا ہے تاکہ لوگ تصویروں سے دھوکہ کھا کے ان کے پسندیدہ شاعر کا تعارف اور کلام ازبر کر لیں۔
کتاب کی ورق گردانی کے دوران اگر آپ اپنی پسند کا کوئی مضمون یا غزل پڑھنے کی غرض سے فہرست دیکھیں اور پھر صفحہ الٹیں تو آپ کو فوراً ہی مطلوبہ نگارش دستیاب نہ ہو گی کیونکہ کتاب کی جِلد بندی کے دوران صفحات اوپر اور نیچے سے اتنے زیادہ تراش دیے گئے ہیں کہ ان کے نمبر غائب ہو گئے ہیں۔ لہٰذا آپ کو اپنا مطلوبہ صفحہ بعد از محنت شاقہ دستیاب ہو گا اور ظاہر ہے کہ اسطرح پڑھنے کا مزہ دو بالا ہو جائے گا!
ان سب خوبیوں کے علاوہ آپ پر دھونس جمانے کے لیے کتاب کے صفحہ اوّل پر فارسی کی ایک رباعی درج ہے۔ (رُباعی کس شاعر کی ہے یہ آپ کو بتانا ہے۔)
جن شعراء کا تعارف اور نمونہ کلام اس کتاب میں شامل ہونے سے رہ گیا ہے ان بے چاروں پر شکیل میاں مزید ستم یہ کر رہے ہیں کہ ان کو پورے خلوص اور نیک نیتی کے ساتھ یہ کتاب پیش کر رہے ہیں۔ غرض یہ کتاب یعنی اوراقِ مصور سُلانے والی نہیں بلکہ ایک جگانے والی کتاب ہے۔ ہم امید کرتے ہیں شکیل صاحب آئندہ بھی ایسی ہی جگانے والی بلکہShockدینے والی کتابیں مرتب کریں گے۔ ساتھ ہی ساتھ ہم اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ ہم شاعر نہیں ہیں۔
اور اب آخری بات: ہم نے یہ مضمون شکیل صاحب کو چِڑانے کے لیے لکھا تھا۔ لہٰذا ہم نے اس مضمون کو شکیل صاحب کے حوالے کیا اور دل ہی دل میں ایک ہفتہ تک ان سے نہ ملنے کا ارادہ کر لیا۔ ہمیں یقین تھا کہ شکیل صاحب مضمون پڑھنے کے بعد کم سے کم ایک ہفتہ تک تو ہم سے ملنا پسند نہیں کریں گے۔ اس لیے ہم نے موقع غنیمت جان کر کچھ بہت ضروری کام جو کئی دنوں سے رُکے ہوئے تھے۔ نمٹانے کا پلان بنا لیا۔ لیکن ہوا یہ کہ دوسرے ہی دن وہ ہمارے یہاں آ دھمکے۔ خلافِ توقع ان کے چہرے سے خوشی اور بشاشت جھلک رہی تھی کہنے لگے۔ بڑا سچّا اور دلچسپ مضمون لکھا ہے آپ نے آپ تو جانتے ہیں قارئین کو وہ مضامین بالکل پسند نہیں آتے جن میں کتاب یا صاحبِ کتاب کی تعریفیں کی جاتی ہیں۔ یہ مضمون اسی لیے زیادہ پسند کیا جائے گا۔ اب اسے کہیں اشاعت کے لیے بھیج دیجیے۔
ایک تو ہم کتاب پڑھ کر پریشان تھے۔ اب ہمارے تبصرے پر ناراض نہ ہو کر شکیل اعجاز نے مزید پریشان کر دیا۔ ع
ہم تو سمجھے تھے کہ اے میرؔ یہ آزار گیا!
(کھل جا سم سم۔ ۲۰۱۵)

رام پر کاش سکسینہ

رام پر کاش سکسینہ ۳۰, جنوری ۱۹۴۱ کو قصبہ ککرالہ ضلع بدایوں (اتر پر دیش)میں پیدا ہوئے۔ ایم اے انگریزی، ہندی اور لسانیات کے علاوہ ایل ایل بی، ڈاکٹریٹ اور ڈی لٹ کی اعلیٰ اسناد حاصل کیں۔ ناگپور یونیورسٹی میں ڈین فیکلٹی اور دیگر اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ہندی میں ان کی کئی کتابیں شائع ہوئیں۔
اردو میں ان کے ۲۶ مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ’’جمانے کا زمانہ‘‘ (۲۰۰۲) میں ناگپور سے شائع ہوا۔ اپنی کتاب کے پیش لفظ

میں انھوں نے لکھا ہے میری ابتدائی تعلیم اردو میں ہوئی۔ مجھے اپنے والد سے اردو زبان وراثت میں ملی۔ رام پر کاش سکسینہ کے مزاحیہ مضامین زندگی کے خوشگوار اور ناگوار لمحات کو اپنے مخصوص اسلوب سے ظریفانہ رنگ عطا کرتے ہیں۔

تلاش ایک استاد کی

ڈاکٹر رام پر کاش سکسینہ

بچپن میں مجھے سب سے زیادہ میرے چچا جان اچھے لگتے تھے۔ چچا جان اپنے قصبے کے سب سے بڑے شاعر تھے۔ لوگ بتاتے ہیں کہ ہمارے قصبے کا یہ حال تھا کہ لوگ غالبؔ اور اقبالؔ کو بھی ہمارے چچا کا شاگرد مانتے تھے۔۔ چونکہ چچا زمیندار تھے اس لیے ان کے لیے کوئی کام کرنے کا سوال ہی نہ اٹھتا تھا۔ ان کے دو ہی کام تھے۔ ایک حقہ پینا اور دوسرا شاعری کرنا۔ وہ شام کو اپنے چاہنے والوں میں گھرے رہتے۔
چچا جان کی چلم میں گھر کے چولہے سے آگ ڈالنے کا کام میرا ہی تھا۔ اس لیے چچا جان کا میں بہت پیارا تھا۔ ان کی خواہش تھی کہ میں بڑا ہو کر شاعر بنوں، لیکن ابا حضور کو یہ شوق پسند نہیں تھا۔ وہ ہمیشہ شاعر اور شاعری سے دور رہنے کی صلاح دیتے۔ ان کا کہنا تھا کہ جب شیطان کسی پر حاوی ہو جاتا ہے تو وہ شاعری کرنے لگتا ہے۔
چچا جان کا تخلص درد تھا اور وہ ترنم میں شعر پڑھا کرتے تھے۔ میں ان کو توجہ سے سنتا اور خود بھی تک بندی کر تا۔ چچا جان ہمیشہ حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہتے ''بیٹے، تم خاندان کا نام روشن کرو گے، تم ہندوستان کے بہت بڑے شاعر بنو گے۔''
اچانک دل کا دورہ پڑنے سے چچا جان کا انتقال ہو گیا اور میری شاعری بھی ان کے ساتھ قبر میں دفن ہو گئی۔ میں بڑا ہوا۔ پڑھ لکھ کر نوکری کر لی۔ شادی بھی ہو گئی اور ایک بچہ بھی۔ اب ایک بار پھر شاعری کرنے کا شوق چرایا۔ جب اپنا کلام بیگم کو سنایا تو انھوں نے پہلے تو دھمکی بھرے لہجے میں کہا: ' اگر میرے والد کو پہلے معلوم ہوتا کہ آپ کو شاعری کی بری عادت ہے تو وہ کبھی میری شادی آپ کے ساتھ نہ کرتے۔ خیر اب میں طلاق تو دینے سے رہی۔ ایک شرط ہے کہ آپ گھر میں کسی کو اپنا کلام نہیں سنائیں گے کیونکہ اب اپنا بِلو بھی تو بڑا ہونے لگا ہے۔''
میں نے ان کی شرط مان لی تو انھوں نے ایک اور نیک صلاح دے ڈالی: ''پہلے آپ اصلاح کے لیے ایک استاد تلاش کیجئے۔''
جب میں نے استاد کی تلاش شروع کی تو معلوم ہوا کہ یہ کتنا مشکل کام ہے۔ ہمارے قصبے میں پانچ سو گھر ہیں اور ہر گھر میں کم از کم ایک شاعر ضرور ہے۔ اس طرح اوسطاً پانچ سو شاعر ہوئے۔ پھر شاعروں کے چار گروپ ہیں اور ہر ایک گروپ کا شاعر دوسرے گروپ کے شاعر کو شاعر ہی نہیں مانتا۔ ہمارے قصبے میں دو تین شاعر ایسے بھی ہیں جن کی کوئی نظم یا غزل کبھی کبھی کسی اخبار یا رسالے میں شائع ہو جاتی ہے۔ ان میں ایک ہیں نور صاحب۔ سب سے پہلے میں نور صاحب کے دولت کدے پر پہنچا۔ جب میں نے ان سے اصلاح کے لیے گذارش کی تو فرمانے لگے ''بر خور دار استاد بنانا کوئی ہنسی کھیل تو نہیں ہے۔ استاد کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ میں نے کہا: ''میں تیار ہوں۔''
''کیا تیار ہیں! معلوم ہے میں نے تین سال بغیر کچھ کہے اپنے استاد کا حقہ بھرا تھا، تب انھوں نے ایک دن ترس کھا کر میری ایک نظم سنی اور اس میں کچھ ترمیم کی۔''
میں نے عرض کیا: ''حضور! اگر آپ کی شاگردی اختیار کر لوں تو مجھے کتنے سالوں میں یہ موقع ملے گا۔؟''
اس پر وہ غصہ ہو گئے اور ڈانٹتے ہوئے کہنے لگے: مذاق کرتا ہے، زبان لڑاتا ہے۔''
وہاں سے آنے کے بعد استاد کی تلاش کچھ دنوں کے لیے ملتوی کر دی۔
ایک دن ایک اچھی نظم لکھی تو سیدھے ایک رسالے کے ایڈیٹر کے پاس گیا اور ان سے درخواست کی کہ وہ میری نظم کو شائع کر دیں۔ انھوں نے سوال کیا ' آپ کا استاد کون ہے؟'' جواب نہ پا کر انھوں نے یہ کہہ کر بھگا دیا ' کہیں بنا استاد شاعری آتی ہے۔''
مجبوراً استاد کی تلاش پھر جاری کر دی۔ ایک دوست کے معرفت ایک شاعرہ کے پاس گیا تو انھوں نے خوشی خوشی اپنا شاگرد بنا لیا۔ جیسے ہی صلاح کے لیے میرا ان کے گھر آنا جانا شروع ہوا تو ایک دن انھوں نے کہا۔ ''معاف کرنا۔ آپ برا نہ مانیں۔ آپ کا آنا میرے خاوند کو پسند نہیں ہے۔''
چند ہفتوں کے بعد ایک مشاعرے میں ایک شاعرہ سے ملاقات ہو گئی۔ وہ کنواری تھی۔ انھوں نے بھی مجھے اپنی شاگردی میں لینا منظور کر لیا۔ اصلاح کے لیے میں نے ان کے گھر جانا شروع ہی کیا تھا کہ میری بیگم کو خبر لگ گئی۔ انھوں نے گھر میں

ہائے توبہ مچا دی۔ اور زور زور سے محلے کو سنا کر کہنے لگی: ’’میرے والد ٹھیک ہی کہتے تھے کہ یہ شاعر ہوتے ہی بد چلن ہیں۔ شراب اور شباب ہی انھیں بھاتا ہے۔‘‘
میں نے کہا: ’ میں تو شراب چھوتا بھی نہیں۔‘‘
’’اسی لیے شباب کی طرف زیادہ بھاگ رہے ہیں۔ خیر آپ کو بد چلنی ہی کرنی ہے تو میں میکے چلی جاتی ہوں۔ آپ شاعری بھی کرنا اور اپنے لڑ کے کو بھی پالنا۔‘‘
اس دھمکی کا مجھ پر اثر ہوا اور میں نے محترمہ کے ہاں جانا چھوڑ دیا۔
ایک دن میرے دوست قمر میاں مجھے پروفیسر حسین صاحب کے گھر لے گئے۔ پروفیسر صاحب نے میرا رونا سنا تو موم کی طرح پگھل گئے، بولے: ’ ’کوئی بات نہیں ہے، مجھے بھی ایک شاگرد کی تلاش ہے۔ پچھلے ہفتے میں نے اپنے شاگرد کو اسلامیہ انٹر کالج میں اردو کا مدرس بنوا دیا ہے۔ کچھ دنوں آپ ہماری خدمت کیجئے۔ آپ کو بھی کہیں پروفیسر بنوا دیں گے۔‘‘
میں نے عرض کیا: ’’سر، میں تو اردو میں ایم اے نہیں ہوں۔‘‘
’’تو کیا ہوا۔ ہم آپ کو ایم اے بھی کر وا دیں گے اور پی ایچ ڈی بھی۔‘‘
’’سر یہ تو پانچ سالہ پلان ہے۔‘‘
’’تو کیا ہوا، ہماری سر کار کتنے پانچ سالہ پلان بناتی ہے، تبھی اپنا ملک ترقی کر پا یا ہے۔‘‘
میں نے پوچھا: ’’سر مجھے کرنا کیا ہے؟‘‘
انھوں نے بے تکلفی سے کہا: مجھے ڈاکٹر نے تازہ پالک کھانے کی صلاح دی ہے۔ آپ کا کام یہ ہو گا کہ کھیت سے روز ایک کلو تازہ پالک لا کر دیا کریں۔ باقی آپ اپنا کام کیجیے۔‘‘
پروفیسر صاحب کو تازہ پالک کھلاتے ایک سال ہو گیا ہے۔ ابھی تک اصلاح کے لئے انھیں وقت نہیں ملا۔ روز صبح اٹھ کر خدا سے دعا مانگتا ہوں کہ آج تو ان کی نظر عنایت ہو جائے۔
(جمانے کا زمانہ ۲۰۰۲)

رحمت اللہ خاں مالوی

رحمت اللہ خاں مالوی، یکم جولائی ۱۹۴۴ کو پیپل گاؤں راجہ
(ضلع بلڈانہ) میں پیدا ہوئے۔ اردو انگریزی اور معاشیات میں ایم اے بھی کیا اور اکوکہ کے ایک تعلیمی ادارے میں تدریسی خدمات انجام دیں۔ ان کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ’’کتاب نا شناسی‘‘ شائع ہو چکا ہے۔ ماہنامہ شگوفہ، حیدر آباد میں گاہے بگاہے ان کی تحریریں شائع ہوتی رہتی ہیں۔
رابطہ: 9422619133

نوٹ

رحمت اللہ خاں مالوی

نوٹ نوٹ ہوتا ہے۔ اس کا کوئی بدل نہیں ہو سکتا۔ کہتے ہیں جب انگریز ہندستان سے بھاگا تو اپنے ساتھ کئی ضروری چیزیں لے کر گیا تھا۔ اور جتنی غیر ضروری چیزیں تھیں وہ پیچھے چھوڑ گیا۔ ان پسماندہ باقی ماندہ اور وامانده اشیاء میں بالترتیب کتے، نوٹ اور پتلون زیادہ اہم سمجھے گئے۔ اور ہم ہندوستانیوں نے انھیں مال بیش قیمت سمجھ کر خوشی خوشی سر آنکھوں سے لگا لیا۔ روایتوں میں آتا ہے کہ ان اشیاء کو دیکھ کر بعض کی بانچھیں اتنی کھلیں کہ بتیسیاں باہر نکل آئیں اور بعض نے صرف رال ٹپکانے پر ہی اکتفا کیا۔
دولت مند خواتین نے کتوں کو گلے لگایا کہ شوہر کا بدل ہوتا ہے۔ وفاداری انکساری اور اطاعت گذاری اس میں کوٹ کوٹ کر بھری ہے۔ پیچھے پیچھے دم ہلاتے پھرنے سے لے کر تلوے چاٹنے تک کی تمام خوبیاں بھی اسی جانور میں پائی جاتی ہیں۔

سرکاری اور غیر سرکاری حکام نے پتلون اور نوٹ دونوں پر ہاتھ صاف کیا۔ دونوں بھی جامہ زیبی کے لیے ضروری ہیں۔ ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم بھی۔

تیسرا طبقہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں پر مشتمل تھا۔ جسے عرف عام میں سعادت مند سمجھا جاتا ہے۔ ان کی سعادت مندی کا یہ عالم واحسرتا پتلون یا حسرتا نوٹ کہہ کر رہ گئے۔ پھٹی پرانی نوٹ دیکھ کر تھوڑی دیر خوش ہولیے۔ اور ہلکی پھلکی پتلون پہن کر دل کو سمجھایا کہ یہ پتلونیں یا تو اترن کی تھیں یا پھٹے پرانے نوٹوں سے خریدی ہوئیں۔ تھوڑے ہی دنوں میں اس قسم کی پتلونوں پر دو آنکھیں کمر سے ذرا نیچے رانوں سے ذرا اوپر اُگ آتی ہیں۔ تاکہ سعادت مند عوام ہمیشہ پیچھے ہی دیکھتے رہیں۔ آگے نہ دیکھ سکیں۔ دوسری دو آنکھیں گھٹنے کے پاس ہوتی ہیں۔ اور پہننے والوں کو ہمیشہ یاد دلاتی رہتی ہیں کہ تمھاری عقل کا صحیح مقام یہی ہے۔ اس لیے ایسے لوگ جب کبھی کسی گمبھیر مسئلے پر سوچتے ہیں یا سوچنے کی کوشش کرتے ہیں تو ان کے گھٹنوں میں درد ہونے لگتا ہے۔

وقت کے ساتھ معیار اور میزان بھی بدل جاتے ہیں۔ ایک دور تھا کہ شرفا کی نقل عوام کیا کرتے تھے لیکن مساوات کی نعرہ بازی کے صدقے گنگا الٹی بہہ رہی ہے۔ انداز حسن ضرور بدلا لیکن غرور حسن باقی ہے۔ آنکھوں کی پیوند کاری کے اس عیب کو چار گول ڈیزائنوں کی شکل میں چھپایا گیا۔ دو گول گول تھگّل کمر کے عین نیچے پشت کی طرف سے اور دو تھگلیاں گھٹنوں پر۔ انھیں دیکھ کر عجب سرور حاصل ہوتا ہے۔ دیکھنے والوں کو بھی اور پہننے والوں کو بھی۔ یہ پیوند کاری اب ملوں سے ہونے لگی ہے۔ گویا نیا کپڑا پہننے سے پہلے ہی پیوند کار ہوتا ہے۔ یہ بھی نوٹ ہی کمال ہے۔ ٹاٹ میں مخمل یا مخمل میں ٹاٹ کا پیوند لگوا لے۔ ہم آپ کر ہی کیا سکتے ہیں۔

حکام بالا (سرکاری و غیر سرکاری)نے نوٹ کا اتنا استعمال کیا کہ دفاتر میں ہر جگہ بجز نوٹ کچھ نظر نہیں آتا۔ نوٹ کے بغیر کوئی کام نہیں ہوتا۔ کاغذی گھوڑے بھی نوٹ دیکھ کر ہی دوڑتے ہیں۔ آخر سکۂ رائج الوقت جو ہے۔ اگر محض سکہ رائج الوقت ہوتا تو ایک بات تھی مگر یہاں تو یہ عالم ہے کہ حاکم وقت، ابو الوقت اور ابن الوقت سب کچھ خوبیاں اسی ایک کاغذ کے ٹکڑے میں موجود ہیں۔ ایک طرف قوت خرید بھی رکھتا ہے اور تو دوسری طرف قوت برید بھی۔ بیک وقت پیر بھی ہے اور مرید بھی۔ اس کی مریدی کی بھی عجب شان ہے۔ جسے دیکھو وہ اس کا پیر بننے کا خواہشمند ہے۔

سرکاری دفتروں میں نوٹ کا چلن مختلف صورتوں میں نظر آتا ہے۔ جو نوٹ بطور کرنسی رائج ہے، اس کی اہمیت مسلم ہے۔ نچلے درجہ کے چپراسیوں سے لے کر اعلیٰ کوالٹی کے افسران بالا تک اس قسم کی نوٹ کے پیچھے گشتی مراسلہ Circular کی طرح پھرتے ہیں۔ اور ہر ایک کو اس سے رغبت ہے۔ ہر ایک بڑی محبت سے اسے اپنے پاس ہی رکھنا چاہتا ہے۔ آخر کار بڑی حسرت سے کہنا پڑتا ہے،

تم ہمارے کسی طرح نہ ہوئے

ورنہ دنیا میں کیا نہیں ہوتا

جہاں تک لین دین کا تعلق ہے، نوٹ کا کردار بہت اہم ہوتا ہے۔ جب کسی کو دینے کی بات آتی ہے تو بہرے بھی چونک پڑتے ہیں۔ جب کسی سے لینے کا معاملہ ہوتا ہے اس کے خلاف ہوتا ہے۔ یعنی لین دین کے معاملات میں لینے کے دینے پڑ جاتے ہیں۔ اس لینے دینے سے استاد خاص فائدہ اٹھاتے ہیں۔ کالجوں میں پڑھانے والے استاد زیادہ ہی ناجائز فائدہ اٹھاتے ہیں۔ گویا نوٹس دینے کے بہانے ہرنوں کی پیٹھ پر گھاس لاد دیتے ہیں۔ ہرن اپنی چوکڑی بھول جاتے ہیں تعلیم کی بات چل نکلی تو امتحانات اس سے کیسے دور رہیں امتحانات میں نوٹس کا مرکزی رول ہوتا ہے۔ امتحان کی فیس، سوالنامے اور امتحان کے نتائج تک سب نوٹ کے گرد چکر لگاتے ہیں۔ ہر سوال نامہ میں کچھ نہ کچھ نوٹ تحریر ہوتے ہیں۔ طلبہ انھیں بڑی فکر سے پڑھتے ہیں (بھلے ہی پرچہ نہ حل کر سکیں) بعض بھلے آدمی امتحانات ہونے سے قبل ہی نوٹ پڑھنا شروع کر دیتے ہیں۔ اور کامیاب کہلاتے ہیں۔

کوٹ ووٹ اور نوٹ یہ تینوں رشتہ دار لگتے ہیں، یا تینوں کا ایک دوسرے سے گہرا تعلق ہے۔ لیکن یہاں نوٹ ہی چلتا پرزہ ہے۔ چاہے تو کوٹ پہنا دے چاہے اتر وا دے۔ یہی سلوک ووٹ کے ساتھ بھی ہے۔ جدھر نوٹ ادھر ووٹ۔

عجب متضاد خوبیاں ہیں نوٹ میں۔ چھَپائے بھی جاتے ہیں اور چھُپائے بھی جاتے ہیں۔ جب چھپوائے جاتے ہیں تو وھائٹ کہلاتے ہیں۔ اور چھپانے کی صورت میں بلیک۔ وھائٹ اور بلیک کے علاوہ یہ اصلی اور نقلی بھی ہوتے ہیں۔ اصلیت سے سب آگاہ ہوتے ہیں لیکن نقلی کی پہچان مشکل ہے۔ یوں بھی نقلی اشیاء اصلی میں مل کر کھپ جاتی ہیں۔ یہ تو نوٹ ہیں۔ اول الذکر حالت میں چھاپہ خانہ استعمال ہوتا ہے۔ آخر الذکر حالت میں خانہ نوٹوں سمیت غائب ہو جاتا ہے۔ صرف چھاپہ رہ جاتا ہے۔ جسے پولس اور انکم ٹیکس والے پوری پوری ناکامی کے ساتھ انجام دیتے ہیں۔ اس ناکامی میں بھی قصور نہ تو پولس والوں کا ہے، اور نہ ہی چھپانے والوں کا، در اصل قصور تو نوٹ ہی کا ہے۔ جو رنگ بدلتا رہتا ہے۔ بلیک اینڈ وھائٹ تو اکثر ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن لال پیلے ہرے پیراہن پہن لیتا ہے۔ اس کے علاوہ مصیبت کے وقت ایک نمبر اس کا پسندیدہ ہے۔ خود بھی محفوظ رہتا ہے اپنی حفاظت کرنے والوں کو بھی بچا لیتا ہے۔ وہ ہے، دو کا عدد۔

ہرے رنگ کی نوٹ کو گرانی کے اس دور میں بہت سے تارک الدنیا، قناعت پسند سادھو، سنت پیر فقیر پسند کرتے ہیں۔ دکشنا اور ہدیہ میں اسی رنگ کی نوٹ کو فوقیت دیتے ہیں کہ لالچ بری بلا ہے۔ نہیں شاید اس لیے کہ
ہوتی ہے اس کے فیض سے مزرع زندگی ہری
(کتاب نا شناسی)

سعید احمد خاں

یکم جولائی ۱۹۴۸ کو اکولہ میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم اے اور پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ اکولہ میں لکچرر کی حیثیت سے سبک دوش ہوئے۔ جاسوسی ناول نگار کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ ان کے تین جاسوسی ناول ''نشہ اترتا ہے'' ، ''کھنڈروں کے قیدی'' اور ''وحشستان'' منظر عام پر آ چکے ہیں۔ بید براری کے نام سے بھی ان کی ظریفانہ نگارشات شائع ہو چکی ہیں۔ ''آپ کی یاد میں'' ان ہی مضامین کا مجموعہ ہے۔
رابطہ: 9765164862 ۔

انقلاب، خیر آباد!

سعید احمد خان

میری اہلیہ نے جب وہ بات مجھ سے کہی تو میں جھوٹ موٹ سنجیدہ ہو گیا۔ اپنی آنکھوں میں فکر مندی پیدا کر کے چہرہ ایسے بنا لیا کہ، اب یہ مسئلہ حل کیسے ہو؟ میڈم سے بات کرتے وقت بڑا محتاط رہنا پڑتا ہے۔ باتیں کرتے کرتے کسی ماہرِ نفسیات کی طرح اس کی نظر میری حرکت پر رہتی ہے۔ کون سی بات پر میری آنکھ جھپکتی ہیں، اور کن باتوں پر میرے کان کھڑے ہو جاتے ہیں اور کس بات پر میں خود کھڑا ہو جاتا ہوں، یہ بخوبی جانتی تھی۔
یوں تو یہ معمولی سی بات تھی لیکن وہ عورت ہی کیا جو معمولی بات کو غیر معمولی نہ بنا دے۔ ہم نے اپنی چھوٹی بیٹی کے نام پر دو سو روپے مہینے کا ایک آرڈی اکاؤنٹ کھولا تھا۔ چند مہینوں تک تو یہ سلسلہ ٹھیک چلا لیکن معاملہ پھر ٹھپ پڑ گیا۔ اس مہینہ تو ایجنٹ کو واپس کر دیا گیا کہ اگلے ماہ دو قسطیں ادا کر دیں گے۔ لیکن آنے والے مہینے میں یہ پیسے آئیں گے کہاں سے یہی سوال کر کے وہ میرا چہرہ دیکھ رہی تھی اور میں فکر مند ہونے اور نظر آنے کی کوشش کر رہا تھا۔ میں مقامی کالج میں لکچرر ہوں تنخواہ خوب بلکہ بہت خوب ملتی ہے۔ مہینے کے آخر میں پتہ نہیں کیا ہو جاتا ہے کہ سارا بجٹ گڑ بڑا جاتا ہے۔
ویسے بیوی زیادہ کچھ نہیں کہتی کیوں کہ میں بیوی کا شروع سے ہی (مطلب جب سے شادی ہوئی ہے۔)فرماں بر دار ہوں۔ تنخواہ بھی بڑھتی ہے۔ اکثر GPFاور Arrearsوغیرہ بھی نکلتے رہتے ہیں۔ لیکن پتہ نہیں کن بزرگوں کی بد دعا ہے کہ بجٹ ٹھیک ٹھاک ہوتا ہی نہیں۔
کالج میں اتنی کم محنت کر کے اتنی زیادہ تنخواہ لینے پر میں خود ہی شرمندہ تھا۔ لیکن ساتھیوں نے دلاسہ دیا کہ اور لوگ اتنی بھی محنت نہیں کرتے اس لیے زیادہ شرم محسوس کرنے کی ضرورت نہیں۔ مضامین ایسے پڑھاتا تھا کہ کوئی ٹیوشن کے لیے گھاس نہیں ڈالتا تھا۔ بلکہ مفت بھی پڑھنے کے لیے کوئی تیار نہیں ہوتا۔ میں نے کہا(کیوں کہ کچھ نہ کچھ بولنا ضروری ہو گیا تھا)گوشت کم کر دیں گے! میں نے گویا اپنی طرف سے ایک بڑی قربانی پیش کی۔
نہیں! میڈم کا جواب تھا۔ ہفتہ میں سات دن تو کھاتے ہیں۔
دودھ؟ میری زبان سے نکلا۔
کم از کم ڈیری کا دودھ تو رہنے دو بے چارے بچّوں کے لیے۔
سبزی، گیہوں، جوار، چاول، دالیں وغیرہ؟
نہیں ان میں کچھ بھی کم نہیں ہو سکتا۔
ایک بڑا بھیانک خیال میرے دل میں آیا۔ دوسرے شہروں سے اکثر جو ہر ماہ میرے سسرالی رشتہ دار ٹپک پڑتے ہیں ان پر اگر

قید لگا دی جائے تو!؟ یہ بات کہنے کے لیے میں نے زبان کھولی لیکن میرے منہ سے نکلا صابن بیگم صابن! ہمارے یہاں صابن کا استعمال بہت زیادہ اور بے جا ہوتا ہے۔ کیا ضروری ہے کہ لکس انٹر نیشنل استعمال کیا جائے۔ دوسرا کوئی سا بھی۔
آپ کے صاحبزادے لکس کے علاوہ کسی اور صابن سے نہیں نہاتے۔ دوسرے صابن سے نہانے کے مقابلے میں جھاویں کا استعمال مناسب سمجھتے ہیں۔
اور ہماری پیاری بیٹا جس جس کی وجہ سے اتنا کچھ سوچنا پڑ رہا ہے؟
وہ تو بڑی ہوشیار ہے، صابن کے بچے ہوئے ٹکڑوں کو جمع کر کے انہیں پیستی ہے اور پھر اس کا صابن بناتی ہے۔
اوہ! وہ سموسہ کی شکل کا صابن اسی طرح کا بنایا ہوا تھا؟
اور کیا۔ آپ کیا سمجھتے تھے۔
میں سمجھا لکس والوں نے اب سموسہ لکس نکالا ہے۔ میرا یہ لطیفہ اس کے اوپر سے خالی وار گزر گیا۔
پانی والے بند کر دیں! میں نے رائے دی۔
پھر کون بھرے گا؟
میں بھروں گا اور کون؟ ڈیڑھ سو روپے ماہانہ سیدھے بچ جائیں گے۔
آپ پانی بھریں گے! وہ میرے ململ کے قمیص اور علی گڑھ پاجامے میں ملبوس دھان پان سے سراپا کو دیکھتے ہوئے کھل کھلا کر ہنس پڑی۔ ابھی تک کی گفتگو میں وہ پہلی مرتبہ ہنسی تھی اس لیے اس کے ساتھ میں بھی ہنسنے لگا۔ پھر خیال آیا کہ اس میں تو میری ہی تضحیک کا پہلو نکلتا ہے۔ اپنی مصنوعی ہنسی کو بریک لگائے اور حقیقی غصّہ میں کہا۔
تو پھر تم ہی بتاؤ کوئی ترکیب جس میں تمھاری لاڈلی کا یہ اکاؤنٹ جاری رہے۔
بیگم کے چہرے پر بدلتے تاثرات دیکھ کر میں چونک گیا۔ یہ تاثرات اس کے چہرے پر اس وقت پیدا ہوتے تھے جب قطعی طور پر کسی فیصلہ پر پہنچ جاتی تھی اور اس فیصلہ کو رد کرنا کم از کم میرے لیے نا ممکن ہو جاتا تھا۔
اپنے یہاں انقلاب نہ آئے تو اچھا ہے!
کیسا انقلاب؟ تم تو اس طرح کہہ رہی ہو جیسے اپنے یہاں روزانہ انقلاب آتا ہے!؟
ہمارے یہاں روزانہ ڈیلی انقلاب آتا ہے! وہ ایک ایک لفظ چبا چبا کر بولی۔
''تو پھر؟''، میں نے گھبرا کر پوچھا۔
اسے ہی بند کر دیتے ہیں! وہ اطمینان سے بولی میں تو کچھ اسے ہاتھ میں لیتی نہیں، بچّے میرے انگریزی اسکولوں کے پڑھنے والے، ایک آپ ہی پڑھتے ہیں۔
نہیں! میں اپنا انتہائی غصّہ ضبط کر کے بولا اس سے فرق ہی کیا پڑتا ہے ایک پان کی قیمت میں اتنا عمدہ اخبار ہم کو مل جاتا ہے۔ اس کے ساتھ سنڈے ایڈیشن ہے، پھر فیمیلی انقلاب بھی!
اس کے ساتھ دوسری الّم غُلّم کتابیں بھی ہیں، رسائل بھی ہیں، وہ میرے لہجے کو نقل اتارتی ہوئی بولی سب بند! دو سو روپے آسانی سے بچ جائیں گے۔
بیگم ذرا تو خیال کرو، میں کلاسیز میں بچّوں کو اردو کے اخبارات اور رسائل خریدنے کی تلقین کیا کرتا ہوں۔
اس سے آپ کو کس نے روکا، تلقین کرتے رہیے، لیکن کام کاج، کیجیے اپنے فائدے کا۔
کیوں میری امیج خراب کرنے پر تُلی ہو، دہلی کے ایک اخبار والے سے یہاں کے بک سیلر نے میرا تعارف جانتی ہو کس طرح کرایا تھا؟(وہ استفہامیہ نگاہوں سے میری طرف دیکھنے لگی۔ میں نے کہا۔)
اس نے کہا تھا کہ میں ان بہت کم اردو کی روٹی کھانے والے اساتذہ میں سے ہوں جو اردو کے اخبارات، رسائل اور کتابیں خرید کر پڑھتے ہیں اور تم جانتی ہو اس کے جواب میں، میں نے کیا کہا تھا، بلکہ کون سے تاریخی جملے کہے تھے؟
ایسا کیا کہہ دیا تھا آپ نے؟ وہ اُکتا کر بولی۔
میں نے کہا تھا کہ میں بنیائین خریدتا ہوں تو اپنی ضرورت کے لیے، جوتا، موزہ سب کچھ اپنی ضرورت کے لیے خریدتا ہوں۔ یہ کسی پر احسان نہیں اور نہ ہی کوئی فخر کی بات ہے۔ اس لیے اخبارات اور کتابیں خریدتا ہوں تو اس میں قابل تعریف بات کیا؟
میری بیوی نے فوراً تو کچھ نہیں کہا، پھر کچھ سوچ کر بولی۔
لیکن اس پر خرچ کیے بغیر بھی ہماری یہ ضرورت پوری ہو سکتی ہے، اخبار پڑوسی سے مانگ کر لائیں گے اور کتابیں دوستوں سے، سمجھے!
میں نے اپنے سیدھے ہاتھ کی مٹھّی سختی سے بند کی اور اسے فضا میں لہراتا ہوا بولا۔
جب ہم مانگ کر کھاتے نہیں۔ مانگ کر پہنتے نہیں تو مانگ کر پڑھتے کیوں ہیں؟
یہ سلسلہ ایسا ہی چلتا ہے وہ مجھے کسی بچّے کی طرح پچکارتی ہوئی بولی۔ جن سے آپ مانگ کر لائیں گے وہ بھی کہیں اور

سے مانگ کر لاتے ہیں!
اب میرے پاس سوائے ہتھیار ڈالنے کے اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ انجام کار! انقلاب کے لیے ہمارے گھر کے دروازے بند ہو گئے۔

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹوی

ڈاکٹر جاوید احمد کامٹی میں پیدا ہوئے۔ منگرول پیر ضلع واشم میں تدریسی خدمات انجام دینے کے بعد چندر پور کے اردو اسکول و جونیر کالج میں پرنسپل مقرر ہوئے تھے۔ سائنس ٹیچر ہونے کے باوجود ان کی ادبی دلچسپی نے انھیں صالحہ عابد حسین کے فکر و فن پر تحقیق کی ترغیب دی۔
ڈاکٹر جاوید احمد نے سائنسی مضامین بھی لکھے جو ان کی کتاب ''ماحولیات اور انسان'' میں شامل ہیں۔ ان کی دوسری کتاب ''ادبی شذرات'' (۲۰۱۲)میں دیگر تحریروں کے علاوہ پانچ مزاحیہ بھی ہیں۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی دلچسپ کہانیاں تحریر کی ہیں ان کہانیوں کا مجموعہ ''اصلی پونجی'' کے نام سے شائع ہوا۔ اپریل ۲۰۲۰ میں ان کا انتقال ہو گیا۔

ہم نے بھی کتّا پالا

ڈاکٹر جاوید احمد

زندگی امن و سکون کے گہوارے میں گزر رہی تھی۔ ریٹائرمنٹ زندگی کی دلچسپیاں جاری تھیں۔ ایک مدرس ہونے کے ناطے سابقہ دن رات بچوں، ان کے پرچوں اور ان کے شور سے پڑا تھا لہٰذا پہلی پسند ایک امن و چین والی زندگی کی تلاش تھی نیز ملازمت کے زمانے میں جو حسرتیں پوری نہیں ہوئی تھیں انھیں تکمیل تک پہچانے کا ولولہ تھا۔ شب و روز اطمینان سے ایک فارم ہاؤس میں گزر رہے تھے جو حال ہی میں ہم نے قدرے مہنگی زمین لے کر تعمیر کروایا تھا کیونکہ بقول دلال آج کل اسی کا کریز ہے۔
ہمارا یہ غریب خانہ ''گلفشاں'' آبادی سے تقریباً ۱۲ کلومیٹر فاصلے پر واقع تھا تو صاحبو! راوی قسمت میں چین ہی چین لکھتا تھا۔ ادھر شناسا اور ملاقاتی بہت ہی کم آتے۔ لہٰذا جو قسمت کا مارا آ نکلتا اس کی رہائی دو تین گھنٹوں بعد ضرور ہوا کرتی۔ امن و شانتی کے سمندر میں اس وقت ہلچل سی مچ گئی جب اس دور افتادہ مقام کو ہمارے پرانے دوست کی آمد کے پتھر نے ڈسٹرب کر دیا۔ انھوں نے مکان کی معقول حفاظت اور سیفٹی کے بارے میں تشویش کا پتھر پھینک کر اتھل پتھل سی مچا دی۔ بقول ان کے ان کی ''ناقص رائے'' میں مکان تو خوب عمدہ تعمیر ہوا تھا اور بڑا کشادہ اور دیدہ زیب بھی تھا۔ اس میں لوازمات کا بھی دھیان رکھا گیا ہے مگر اس کی حفاظت کی طرف دھیان نہیں دیا گیا ہے۔
انھوں نے اپنے سابقہ تجربات بیان کیے۔ پولس ڈائری کے اوراق سے کچھ نمو نے ڈکیتی، چوری وغیرہ کے ایسے سنائے کہ چوروں اور نقب زنوں نے لوٹ مار کے بعد گھر کے مکینوں کو اس حالت میں چھوڑا کہ وہ اپنی بپتا سے ہمسایوں کو بھی مطلع کرنے کے قابل نہ رہے۔ یہاں تو قریبی ہمسایہ ۲ کلو میٹر دور تھا۔ ہماری طبیعت لرز گئی۔ تجویز معقول تھی۔ ہم نے تو اس پہلو کی طرف دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ موصوف نے اپنی ''قیمتی رائے'' کے عوض میں بطور فیس ایک تگڑا ناشتہ قبول کیا اور رخصت ہو گئے۔
دسترخوان پر جب گھر کے سبھی افراد اکٹھا ہوتے ہیں یہ موضوع چھیڑ دیا گیا۔ مختلف تجاویز پیش کی گئیں۔ کسی نے ماڈرن الکٹرانک حفاظتی آلات کا ذکر کیا، کسی نے اچھی سی سیکورٹی ایجنسی کی خدمات حاصل کرنے کا مشورہ دیا تاکہ دو با وردی گارڈ باری باری سے دن رات تعینات کر دیے جائیں۔ چونکہ انسان لائق اعتبار نہیں وہ ذرا سی لالچ سے پھسل کر خود ہی گھر کو لوٹنے کی سازش میں شریک ہو سکتا ہے اس لیے سیکورٹی گارڈ کی تجویز رد کر دی گئی۔ الکٹرانک سامان کی کوئی گارنٹی نہیں اور ہم بھی اس کی موافقت میں نہیں تھے کیونکہ ہمیں بھی ان مشینوں پر نہ جانے کیوں اعتماد نہیں تھا۔ امتحان کے زمانے میں لمبے لمبے حساب کیلکولیٹر سے کرنے کے بعد جب تک ہم اپنے طور پر روایتی طریقے سے چیک نہیں کر لیتے ہمیں

اطمینان نہیں ہوتا لہٰذا ماڈرن الکٹرانک آلات کی تجویز بھی نامنظور کر دی گئی۔ اچانک ہمارے منہ سے نکل پڑا کیوں نہ ایک کتّا پال لیا جائے!! کتے کی وفاداری تو ضرب المثل ہے مگر والدہ کی خشمگیں نگاہوں سے اندازہ ہو گیا کہ یہ ناؤ بھی پار لگنے والی نہیں۔ ان کا یہ استدلال بڑا مضبوط تھا کے کتا نجِس جانور ہے۔ اس کی رال سے بھی بچنا چاہیے۔ لے دے کے معاملہ وہیں آ گیا۔ ہم نے اور بچوں نے کتے کے حق میں دلائل دیئے کہ اگر ایسا موقعہ آ جائے تو بصورت مجبوری کتے کو رکھوالی کے لیے پالا جا سکتا ہے۔ اس شرط کے ساتھ کہ یہ کبھی گھر کی دہلیز پار کر کے گھر میں داخل نہیں ہو گا۔ بڑے ردّ و قدح کے بعد والدہ راضی ہوئیں مگر اہلیہ کی اپنی رائے بھی کم وزنی نہیں تھی۔ پہلے ہی گھر کے افراد کی خدمت کرتے کرتے تھک چکی تھیں۔ کسی سے کوئی مدد کی امید نہیں تھی۔ بچیوں کا سارا وقت اسکول/ کالج کے آنے جانے اور اپنی پڑھائی کرنے میں صرف ہو جاتا تھا اب ایک اور کتے کی ذمہ داری قبول کرنے کے لیے وہ تیار نہیں تھیں۔ بہرحال انھیں بڑے دلائل دے کر منانا پڑا۔ اب ایک اچھے سے کتے کی تلاش کا سلسلہ شروع ہوا۔

کتے کے طفیل ان دوستوں سے تجدید ملاقات کی نوبت آئی جو پہلے سے مالکانِ سگ تھے اور کتے پالنے کا اچھا خاصا تجربہ رکھتے تھے۔ کتابوں اور انٹرنیٹ کو چھانا گیا۔ اخبارات میں شائع ہونے والے اشتہارات کا سہارا لیا گیا۔ اپنے رشتے داروں اور دور کے پڑوسیوں سے مشورے کیے گئے۔ انھیں بھی کتا تلاش مہم میں لگا دیا گیا۔ شاید کسی لڑکی والے کو اچھے بر کی تلاش میں اتنا سرگرداں نہیں ہونا پڑا ہو گا جتنی تگ و دو ہمیں کرنی پڑی۔ بلی کو خواب میں چھیچھڑے نظر آتے ہیں ہمیں خواب میں کتے ہی کتے نظر آنے لگے۔ بلکہ بعض اوقات تو پطرس بخاری کی طرح بکری کے ہیولے پر کتے کا گمان ہونے لگتا۔ آخر سلسلہ ایک جرمن شیفرڈ پر جا کر ختم ہوا کہ اس سے بہتر نسل چوکیداری کے لیے نہیں۔ کچھ دوستوں کی رائے تھی کہ اسی نسل کی ایک کتیا خرید لی جائے، ''آم کے آم گٹھلیوں کے دام'' کے مصداق اس سے حاصل ہونے والے پلّوں کی فروخت سے کچھ منافع بھی حاصل کیا جا سکتا ہے مگر اس رائے کو اہلیہ نے یکسر ویٹو کر دیا۔ گھر میں تین تین لڑکیوں کی نگہداشت اور نگرانی سے پہلے ہی زیر بار ہونے کے باعث وہ مزید ایک ''مادہ'' کو گھر میں رکھنے کے حق میں نہیں تھیں۔ باہر کے آوارہ کتوں کی سردردی کون مول لے گا اس لیے کتیا کے بدلے کتا ہی بہتر ہے بہر خیر یہ تجویز منظور کر لی گئی۔

جو کتّا ہماری قسمت میں آیا وہ تین آقاؤں کی صحبت میں رہ چکا تھا۔ موجودہ مالک کا آسام کے دورافتادہ مقام پر ٹرانسفر ہو گیا تھا اس لیے انھیں اس سے جدائی کا صدمہ برداشت کرنا پڑا۔ ایک فوجی کا کتا ہونے سے ہمیں اس سے ڈسپلین کی پوری توقع تھی مگر بعد میں پتہ چلا کہ اسے نئے ماحول اور ضرورت کے اعتبار سے ٹرینڈ کرنا پڑے گا۔ گھر میں کتے کی آمد بڑے کرّ و فر کے ساتھ ہوئی۔ اس کے پرائس ٹیگ(قیمت کی پرچی) کے حساب سے اس کا استقبال کیا گیا۔ گھر میں جشن کا سا سماں تھا۔ ہر کوئی نازاں و فرحاں تھا کہ ایسے نایاب نسل کا کتا ہمارے گھر کا حصہ بننے جا رہا ہے اس کے دیدار شریف کے لیے پڑوس کے لوگ اور بچوں کے دوست آنے لگے۔ ان کے لیے ہلکے پھلکے ناشتے کا انتظام بھی کرنا پڑا۔ اسی روز کتے کی نام رکھائی کی رسم بھی ادا کی گئی اور سب نے ''شیرو'' نام پر آمنا و صدقنا کہا۔ وہ دن تو بخیر و عافیت گزر گیا مگر اگلے ایام بڑے سخت تھے۔

دوسری صبح بڑی الجھن، فکر اور پریشانیاں لے کر نمودار ہوئی۔ ایک تو گھر میں کتے کے داخلے سے والدہ ناراض ہوئیں دوسرے کتے نے رات بھر میں صوفے اور فرش کو گندگی سے ستیاناس کر دیا۔ اہلیہ کی ناراضگی کو ٹالنے کے لیے ہمیں ہی صفائی پر جٹ جانا پڑا کیونکہ یہ الٹی میٹم مل چکا تھا کہ اگر کتے کی گندگی کے صفائی کے بعد وقت ملا تو گھر میں ناشتہ تیار ہو گا۔ کتوں کے بارے میں مزید معلومات کے لیے ہمیں سگ برادر دوستوں کی طرف رجوع ہونا پڑا۔ اس کے رکھ رکھاؤ، صاف صفائی، غذا اور رہائش سے متعلق معلومات مطلوب تھیں۔ ان کے تجربات کی روشنی میں ہم نے ایک ویٹا سٹور کا رخ کیا جہاں کتے کے لوازمات جیسے خوبصورت بیلٹ، ناخن کاٹنے کا آلہ، برش، صابن، بسکٹ، سیل بند غذا اور ہڈیوں کے پیکٹ سبھی دستیاب تھے۔ ان کی قیمتیں دیکھ کر آنکھیں پھٹی رہ گئیں۔

جب میزان کیا گیا تو پتہ چلا کہ یہ تو ہمارے پورے گھر کے بجٹ سے بھی تجاوز کر رہا ہے۔ ایک دوست نے ڈھارس بندھائی کے اچھی نسل کے کتے کے لیے یہ قربانی ضروری ہے اور کون ہر مہینے اتنے سامان خریدنے کی نوبت آئے گی لہٰذا دل پر جبر کر کے ساری چیزیں خرید لی گئیں۔ ساتھ ہی انھوں نے مشورہ دیا کہ اب کتے کی ٹریننگ ضروری ہے۔ ہمیں بھی اس میں بہتری نظر آئی ورنہ دوسرے دن بھی صفائی کی نوبت آئے گی۔ کتے کی تربیت ہو جائے تو کم از کم اس بری عادت سے نجات مل جائے گی۔ اب ٹرینر کی تلاش کا سلسلہ شروع ہوا۔

دوسرا دن بھی صفائی کی نذر ہو گیا ساتھ ہی کتے کو چہل قدمی کے لیے لے جانے کی ذمہ داری ہمارے ہی کاندھوں پر آئی۔ یہ بڑا سخت مرحلہ تھا۔ کبھی تو یہ جناب اکڑ کر راستے میں کھڑے ہو جاتے اور کبھی تو ہم سے آگے نکلنے کی کوشش کرتے۔ دیکھنے والے کو مغالطہ ہوتا کہ کون کس کو ٹہلا رہا ہے۔ اس رسّہ کشی میں خاصی کسرت ہو گئی۔ دیگر چہل قدمی کرنے والے بڑی دلچسپی سے ہماری حالت زار دیکھ رہے تھے۔ بعض محظوظ ہو رہے تھے اور کمینٹ بھی کر رہے تھے۔ مشکل تو اس وقت

آپ پیش آتی جب کوئی دوسرا کتا اپنے مالک کے ساتھ پاس سے گزرتا دونوں (یعنی کتے) ایک دوسرے کو دیکھ کر غرّانے اور بھنبھوڑنے کی کوشش کرتے۔ خدا خدا کر کے کوئی ناخوشگوار واقعے کی نوبت نہیں آئی مگر ایک جھونپڑی کے پاس سے گزرتے ہوئے کتا بے قابو ہو گیا اور اس نے دو مرغیوں پر ہلّہ بول دیا۔ لاکھ روکنے کے باوجود اس نے دونوں کو زخمی کر دیا اور ہمیں اس کی اور اپنی گردن بھاری جرمانہ دے کر چھڑانی پڑی۔ یہ سلسلے قریب پاس کی مرغیوں اور بکریوں کے ساتھ چلتا رہا اور ہمیں تشویش ہونے لگی کہ یہی حال رہا تو ہم جرمانہ دیتے دیتے قلاش ہو جائیں گے اس لیے ضروری سمجھا گیا کہ ٹرینر کا فوری طور پر انتظام کیا جائے۔

آخر ایک کرم فرما نے یہ مشکل بھی آسان کر دی اور یہ مژدہ سنایا کہ مطلوبہ ٹرینر کل صبح آپ کی خدمت میں پہنچ جائے گا۔ انھوں نے مزید بتلایا کہ وہ تو راضی نہیں تھا کیونکہ وہ کافی بزی ہے تاہم دیرینہ تعلقات کی بنا پر ہم پر یہ کرم کیا گیا ہے۔ اس کی کچھ شرطیں بھی تھیں۔ ایک موٹی رقم کے علاوہ اس کی فیس میں ناشتہ چائے وغیرہ بھی شامل تھے۔ گھر میں کوئی تقریب وغیرہ ہونے کی صورت میں اسے وی آئی پی کا درجہ دیا جائے۔ دل پر پتھر رکھ کر ان شرائط کو منظور کرنا ہی پڑا۔

حسب وعدہ دوسری صبح اس کی تشریف آوری ہوئی۔ گیٹ پر ایک اسمارٹ نوجوان کو پایا۔ دیدہ زیب کپڑے، بال فلمی ہیروؤں کے انداز میں بکھرائے ہوئے، کالا ہیٹ، کالا چشمہ، ہاتھ میں قیمتی موبائل فون، پیر میں چرمی موزے اور جوتے۔ اگر پہلے سے اطلاع نہ ہوتی تو شاید ہم گہرے مغالطے کا شکار ہو جاتے۔ اس کا پُر جوش استقبال کیا گیا۔ اس نے بھی گردن کو ٹیڑھی کر کے اسے قبول کر کے ہم پر احسان کیا۔ ناشتے سے فراغت کے بعد اس نے اپنے ”گاہکوں“ کی طویل فہرست پیش کر دی جنھوں نے ماضی میں اپنے کتوں کے لیے اس کی خدمات حاصل کی تھیں۔ فہرست پر نظر ڈالنے سے ہمیں اس بات پر فخر ہوا کہ اطراف و اکناف میں کافی اہم لوگ رہتے ہیں اور ہم بھی اس گراں قدر فہرست کا حصہ بننے جا رہے ہیں۔ اس کی اس ”ہُوز ہُو“ لسٹ نے بلکہ ہمیں احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا۔ ساتھ ہی یہ خوشی تھی کہ اس کی اگلی لسٹ میں ہم جیسے حقیر فقیر کا نام نامی بھی شامل ہو جائے گا۔

خریدے گئے سارے سامان کا گٹھا اس کے سامنے لا کر رکھ دیا گیا۔ سامان کو دیکھنے کے بعد اس نے اضافی سامان کی ایک فہرست اور تھما دی اور دوسرے دن اس کی فراہمی کی ہدایت کر کے یہ چلتے بنا کہ سامان آنے کے بعد ہی تربیت کا مرحلہ شروع ہو گا۔ رواروی میں ہم یہ تو بتانا ہی بھول گئے تربیت کے لیے کم از کم تین ماہ درکار ہوں گے۔ کتے کی سیکھنے کی رفتار کو دیکھتے ہوئے اس میں اضافہ بھی ممکن ہے۔ یہ دونوں باتیں سن کر طبیعت بجھ سی گئی۔ جب اوکھلی میں سر دیا ہے تو اب موسلوں کی مار بھی سہنی پڑے گی یہ سوچ کر دل کو مضبوط کر لیا اور بینک کا رخ کیا تاکہ کچھ رقم نکالی جا سکے اور ٹریننگ کا آغاز ہو۔

آخر وہ مبارک صبح بھی آ گئی جب ٹریننگ شروع ہوئی۔ کتے کو ہدایت انگریزی میں دی جاتی اور وہ اسے بخوبی سمجھ بھی لیتا تھا۔ ہم اپنی جگہ خوش تھے کہ چلو کم از کم بچوں کو تو انگریزی دانی کا فائدہ ہو گا اور انگریزی کے لب و لہجہ کی نقل بھی وہ کر سکیں گے۔ آتے جاتے ہم اس ٹرینر کو انگریزی میں ہدایت دیتے اور گھڑکیاں دیتے سن کر خوش ہوتے کہ ٹریننگ اچھی چل رہی ہے۔ ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ گھر کا کھانا کتے کے لیے مناسب نہیں۔ شہر میں ایک خاص اسٹور پر کتوں کے لیے تیار ڈبے ملتے ہیں لہٰذا اس سٹور میں نام درج کروایا گیا۔ اس ”ٹفن“ کی قیمت روزانہ ڈیڑھ سو روپے ہو جاتی اور اسے پہچانے والے کو۲۵روپے الگ سے دینے پڑتے۔ ہم بچوں کے سامنے خفت محسوس کر رہے تھے کہ ان کے لیے کبھی اتنے اعلیٰ پیمانے پر ہم نے خرچ نہیں کیا۔ بہرحال کتے کے لیے اس خاص ٹفن کا اہتمام کیا گیا۔

جب ہم ایک قریبی عزیز کے یہاں شادی کے دو مہینے بعد گھر لوٹے تو پتہ چلا کہ کتا اپنے سبق میں کورا ہے۔ اس نے اطراف کے فارم ہاؤس والوں کو خاصا نقصان پہنچایا ہے۔ وہ خود سر اور ضدی ہے۔ اس پر کوئی ہدایت یا سختی کا اثر نہیں ہوتا۔ جب ٹرینر کی توجہ اس بات کی طرف دلائی گئی تو اس نے ”نو پرابلم“ کہہ کر ہماری تشفی کر دی اور اطمینان دلایا کہ ابھی تو ٹریننگ کا ایک مہینہ باقی ہے۔ تیسرا مہینہ بھی یوں ہی گزر گیا۔ کتے کی عادت میں کوئی تبدیلی نہ دیکھ کر ہمارا پارہ آسمان کو چھونے لگا اور ہمارا دل اسے بھنبھوڑنے کے لیے ہونے لگا۔ ہم نے بلیغ انگریزی میں خوب صلواتیں سنائیں کہ ٹرینر یہی زبان سمجھتا تھا۔

ہم نے اپنا سارا غصہ اور پچھلے تین مہینوں کے خرچ کا غبار فصیح انگریزی میں نکال دیا۔ بچے اپنی جگہ دُبک سے گئے تھے البتہ ہماری والدہ کے چہرے سے طمانیت کا اظہار ہو رہا تھا۔ ٹرینر کتے کا بیلٹ تھامے کچھ اس انداز میں کھڑا تھا گویا ہمارا روئے سخن کہیں اور ہے۔ ہم نے اسے گھور کر دیکھا۔ اس نے دبے لہجے میں کہا، ”آپ نے کیا کہا صاحب! ہم بالکل نہیں سمجھے۔ آپ انگریزی میں نہ بولیں۔“ اس پر بھنانا فطری تھا۔ ہم نے چیخ کر کہا، ”ہم تم سے ہی انگریزی میں بول رہے تھے کیونکہ تین ماہ سے تم بھی تو کتے کو انگریزی میں ٹریننگ دے رہے تھے۔“ اس نے مسمسی صورت بناتے ہوئے کہا صاحب ہمیں انگریزی نہیں آتی۔ ظاہر ہے اس سے پوچھا گیا کہ آخر وہ کس طرح کتے کو انگریزی میں سکھا اور پڑھا رہا تھا۔ اس نے

ڈرتے ڈرتے کہا، ''صاحب انگریزی تو آتی ہے پر کتوں کے لائق۔'' یہ سن کر بچے کھلکھلا کر ہنسنے لگے۔ ہمارا غصہ ساتویں آسمان کو پار کر گیا اور اسے ہندوستانی میں گیٹ آؤٹ کہہ کر ہم نے کتے کے بیلٹ کو تھام لیا اور یہ تہیہ کر لیا کہ کل ہی اس کتے کو کسی کی نذر کر دیں گے۔ ایسے ٹرینر اور کتے سے تو چور بھلے۔ ویسے بھی اب ہمارے پاس لٹانے کو کچھ بچا نہیں تھا۔
(ادبی شذرات۔ ۲۰۱۲)

یارانِ بے پیالہ

اس باب میں ودربھ کے ان قلم کاروں کے مضامین شامل ہیں جن کے طنزیہ و مزاحیہ مضامین کا کوئی مجموعہ تا حال منظرِ عام پر نہیں آیا لیکن ان کی ظریفانہ تخلیقات رسائل میں شائع ہوتی رہی ہیں۔

ڈاکٹر سمیع بن سعد

ڈاکٹر سمیع اللہ نے سمیع بن سعد کے قلمی نام سے چند مزاحیہ مضامین تحریر کئے تھے جو ماہنامہ شگوفہ اور دیگر اخبارات و رسائل میں شایع ہوئے تھے۔ ان کے والد ڈاکٹر سعد اللہ معروف ادیب اور محقق ہیں۔
ڈاکٹر سمیع اللہ ۱۹۵۳ میں جلگاؤں جامود میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے جعفر زٹلی کی شاعری پر تحقیقی مقالہ لکھ کر ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی تھی۔ گورنمنٹ کالج امراؤتی میں پروفیسر مقرر ہوئے اور امراؤتی یونیورسٹی کے مختلف اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے۔ ان کے مضامین میں ظرافت اور انشا پردازی کا حسین امتزاج پایا جاتا ہے۔ ان کے مضامین اعتراض اور تزکِ چغدی ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہو چکے ہیں۔

تزک چغدی

سمیع بن سعد

بات بہت پرانی ہے آدم علیہ السلام کی تخلیق ہو رہی تھی اِس پر و ٹو ٹائپ کو فرشتے اسی حیرت سے دیکھ رہے تھے جیسے کسی کارخانے میں کسی نئی مشین کا پروٹوٹائپ تیار ہوتا ہے تو کاریگر متعجب ہو کر ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں کہ یہ کیا ہے؟ اس کا مصرف کیا ہے؟ وغیرہ وغیرہ۔ آب و گل کے اس پروٹوٹائپ کے اندر کیا ہے، فرشتوں کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو اپنے رو بوٹ یا کمپیوٹر کی ایک آدھ خصوصیت دکھانی منظور ہوئی تو فرشتوں کے سامنے آٹومیٹک ٹی۔ وی پر کائنات کی تمام اشیاء کو پیش کر کے فرمایا ان کے نام تو بتاؤ۔ فرشتے حیران رہ گئے وہ تو صرف وہی جانتے تھے جس کا علم خدا نے ان کو دیا تھا۔ اس امتحان میں تو وہ صفر لے کر رہ گئے۔ اب آدم کے سامنے انھیں اشیاء کو پیش کیا گیا تو آں جناب نے اِن تمام کے نام و خواص فٹافٹ بتا کر فرشتوں کو اس طرح حیران کر دیا جس طرح شہر کا پڑھا لکھا، دنیا دیکھا، ماڈرن آدمی دور دراز کے دیہاتوں میں رہنے والوں کو اپنی باتوں سے حیران کر دیتا ہے۔ تو معلوم ہوا کہ ان حضرت میں ایک صفت یہ بھی موجود ہے کہ نہ صرف اشیاء کے نام رکھ دیتے ہیں بلکہ ان کی خصوصیات بھی اسی شدومد کے ساتھ ظاہر کر دیتے ہیں جس طرح ایک بازاری دوا فروش جڑی بوٹیوں کو بیچتے وقت بتاتا ہے۔ (صداقت سے ہمیں بحث نہیں)
ہمارے جد امجد کی یہی عادت یا خصوصیت ہماری گھٹی میں پڑ گئی اور نتیجۃً ''نام رکھنا''(اچھا یا برا) ہماری سب سے ''بڑی عادت'' بن گئی، جہاں کسی چیز کو دیکھا نہیں کہ اس کا نام معلوم کرنے کی جستجو ہوئی اور معلوم ہوا تو ٹھیک ورنہ رکھ دیا۔ نہ صرف نام بلکہ تجربہ یا تجربہ کاری کی بناء پر اس کی صفت بھی مقرر کر دی۔

مثالوں کی کثرت موضوع کو کتاب الامثال بنا دے گی۔ ایک دو سطروں کی مثالیں دیتا چلوں۔ کسی ارسطو زماں کا قول ہے کہ اگر دنیا میں محنت کی قدر ہوتی تو گدھے کا پہلا نمبر لگتا۔ عالم الحیوانات کے ماہرین کا کہنا ہے کہ گدھے سے بڑھ کر کوئی مضبوط، جفا کش، صابر شاکر اور عقلمند شاید ہی کوئی جانور ہو۔ مذہبی رہنماؤں کے نزدیک بھی یہ مقدس ہے کیونکہ حضرت عیسی علیہ السلام نے اسے سواری کے لیے پسند فرمایا تھا۔ فلسطین، شام، مصر، ایران کے عام لوگ اس کو زندگی کا جزو لازم سمجھتے ہیں۔ لیکن اس صابر، شاکر، عاقل، بالغ، محنتی جاندار کے ساتھ ہم نے کیا سلوک کیا ذرا دیکھئے تو ہمارا ادب اس کا آئینہ دار ہے۔ ہمارے خیالات، گفتگو، ہمارا برتاؤ سب اس بات کا غماز ہے۔ ہمارے پاس گدھے سے زیادہ احمق، جاہل، نالائق قابل نفرت کوئی جاندار شاید ہی نکلے۔

اب دوسری مثال ملاحظہ فرمائیے: - شہباز شب، چغدِ دوراں، حضرتِ الّو عرف گھگھو وغیرہ۔ وہ بے چارہ، عابدِ شب زندہ دار، صوفیِ وقت شب، قانع زمانہ، تنہائی پسند جاندار ہمارے یہاں مفت مارا گیا ہے۔

اس کا قصور صرف یہی ہے کہ وہ کوّے چڑیوں کی طرح دن بھر ہماری نظروں کے سامنے نہیں رہتا اور نہ ہمارے بچوں کے ہاتھوں سے روٹی بوٹی چھین کر لے جاتا ہے۔ رات کی تنہائی میں جب سارا عالم محو خواب ہوتا ہے یہ عابدِ شب زندہ دار کسی ویرانے میں تنہا مقام پر گپھاؤں میں رشی منیوں کی طرح ہو حق کر لیتا ہے۔ اسے سوائے قوت لایموت کی تسکین کے کبھی بیجا ہوس نہیں ہوتی۔ چند گھونسیں، چند چوہے باقی اللہ خیر صلہ ملے تو ملے نہیں تو ہوائی کیڑوں سے ہی شکم دوزخ کو پُر کر لیا اور ہو حق میں مصروف۔ وہ وقفے وقفے سے آوازیں نکال کر غافلوں کو جگاتا رہتا ہے کہ...... سوتا ہے کیا۔

ایسے پرندے کو ہم نے کس نظر سے دیکھا۔ جہاں کسی نامعقول کو دیکھا، احمق کو دیکھا کہہ دیا۔ ابے اُلّو۔ دنیا بھر کی نحوست بے چارے کے سر لادی گئی، طرح طرح کی روایات گھڑی گئیں۔ بچوں سے لے کر بوڑھے تک اس سے ڈرنے لگے، نفرت کرنے لگے۔ جہاں بھولے سے اس نے کسی چھت پر قیام کر کے آواز لگائی۔ اہلیانِ خانہ ہش ہش کہہ کر اڑانے لگے اور پڑوسیوں کے گھروں پر پتھر برسانے لگے۔ کیونکہ تو ہم یہ ہے کہ اگر الّو پر پتھر مارا جائے تو وہ جھپل کر پنجے میں پکڑ کر اڑ جاتا ہے اور پھر پتھر کو گھولتا رہتا ہے اور پتھر پھینکنے والا گھل گھل کر مر جاتا ہے۔

مشرقیوں نے اس پرندے کو اس قدر منحوس سمجھا لیکن مغربیوں کا معاملہ ذرا الٹا ہے۔ جناب شیکسپیئر نے اس کی تعریف کی ہے اور اس کی ہو حق کو سُر مسرت (A merry note) قرار دیا ہے مغرب کی کئی کمپنیوں کا نشانِ تجارت الّو ہے۔ Henry Holts مشہور کتب فروش ہے ان کا نشان بھی الّو ہی ہے۔

الّو کو برا کہنا ہماری زبانی جمع خرچ ہے۔ ورنہ ہمارے مشرقی ادب میں کہیں کہیں یہ تاریخ ساز ہستی نظر آتی ہے۔ مثلاً اس مشہور الّو کا ذکر ہم صدیوں سے پڑھ رہے ہیں جس نے نوشیروانِ عادل کی تشکیل کی تھی۔ قصہ مشہور ہے کہ ابتداء میں یہ بادشاہ اشوک اعظم کی طرح بڑا جنگجو تھا اور اس کے ظلم و ستم سے ملک تباہ و برباد ہو رہا تھا۔ ایک دن وہ اپنے وزیر بزرجمہر کے ساتھ شکار کے لیے جنگل میں سے گزر رہا تھا کہ ایک درخت پر دو عابدوں کو ایک دوسرے پر آوازیں کستے دیکھ لیا۔ بزرجمہر سے کہا تم تو جانوروں کے بہت اچھے ٹرانسلیٹر اور ماہر لسانیات ہو۔ بتاؤ تو یہ دونوں بزرگ کیا فرما رہے ہیں۔ وزیر نے جو کہ موقع شناس و مردم شناس تھا، گرم لوہے کو دیکھ کر چوٹ کی کہ دونوں حضرات الّو شادی کی نسبت باتیں کر رہے ہیں (مشرقی جو ہیں ورنہ ان کی لڑکی لڑکا خود ہی کو رٹ شپ کے ذریعے ایک دوسرے کو پسند نہ فرما لیتے) ایک صاحب کہ پدر دختر نیک اختر اور دوسرے کہ پدرِ فرزند نیک فال ہیں۔ پدر نوشہ کا کہنا ہے کہ جانِ عزیز اگر میرے بیٹے سے شادی کرنا چاہتے ہو تو دس ویرا نے ڈاوری میں دے دیجئے تاکہ ہمارا پورا خاندان اس جاگیر سے مستفید ہو سکے۔ پدرِ دختر نیک اختر فرما رہے ہیں کہ بھائی فی الحال تو میرے پاس ایک ہی ویرانہ ہے جہاں ہو حق کر لیتا ہوں لیکن ہمارا بادشاہ اپنے کاروبارِ سلطنت کو اسی طرح جاری رکھے تو جلد ہی دس کیا سو ویرانے مہیا ہو جائیں گے اور وہ سب بخوشی سو ویرانے نذر کروں گا حضور کی۔ اور پھر اس کے بعد جو ہوا وہ تاریخ میں لکھا ہوا ہی ہے۔ نوشیروان عادل بن گئے اور تاریخ میں اپنے ساتھ اس عقلمند الّو کا بھی نام ثبت کر گئے۔

آج کا زمانہ ہوتا تو اس کے سونے کے بت جگہ جگہ چوک، چوراہوں پر نصب ہو جاتے تاکہ بنانے والوں، کاریگروں اور اسکیم نکالنے والوں کا بھلا ہو جاتا اور بچوں پر کھیلنے کودنے، ان کے سروں پر پھاندنے، گھوڑا بنانے کا موقع ہاتھ آ جاتا اور اشتہار والوں کو اس پر اشتہار لگانے کی جگہ میسر ہو جاتی۔

الّو ایک قسم کا نہیں ہوتا، انسانوں کی طرح کئی قسم کا ہوتا ہے۔ اس میں بزرگی اور بڑائی جسامت کے لحاظ سے نہیں بلکہ نام کی وجہ سے آتی ہے۔ مثلاً ایک بازار میں جب چڑی مارنے بڑے جسم الّو کے مقابلے میں چھوٹے الّو کی قیمت زیادہ بتائی تو وجہ دریافت کی گئی۔ فرمایا کہ یہ فارن کا مال ہے (حالانکہ اصلی ملکی تھا) اور بڑا تو صرف الو ہے، یہ چھوٹا الو کا پٹّھا ہے۔

کہا جاتا ہے کہ جب قیس کا انتقال ہو گیا تو لیلیٰ اس کی قبر پر آئی اور قیس کا ہی ایک شعر پڑھا کہ لیلیٰ میری قبر پر آ کر آواز دے گی تو میری روح قبر سے نکل کر آواز دے گی۔ اور زور سے آواز دی........ افسوس کے دورِ حاضر کے عاشقانِ نامدار کی

طرح قیس بھی اپنا وعدہ وفا نہ کر سکا۔ اس کی قبر سے ایک الّو جسے صدی کہتے ہیں نکل کر بدحواسی میں جھپٹا۔ لبنیٰ کی اونٹنی کے منہ پر لگا۔ جس سے وہ بدک گئی اور بیچاری لبنیٰ اپنے عاشق سے جا ملی۔
الّو کی کی ادبی خدمات میں سے قابلِ ذکر یہ ہے کہ اس نے اردو کو کئی محاورے دیے ہیں۔ الّو کا پٹھا، الّو کی دم، بے دال کا بودم، الّو بننا، الّو بنانا، الّو کا گوشت کھلانا، الّو سیدھا کرنا، وغیرہ وغیرہ۔
عرصہ ہوا ہماری نظر سے پرانی بوسیدہ چھوٹی سی کتاب "ادویات الّو" گزری تھی۔ ہم حیران ہوئے الّو کب سے حکیم بن گیا۔ لیکن معلوم ہوا کہ یہ نسخہ علم طب کی کم اور ٹونا ٹوٹکا کے نسخوں سے زیادہ مزین ہے۔ افسوس کہ اس وقت ہم نے اس میٹریا میڈیکا آف الّو کی قدر نہ جانی اور پچھتا رہے ہیں۔ اس کے اندر الّو کی ہر شئے سے دواؤں اور ان کے طلسماتی اثرات کا ذکر تھا۔ بطور نمونہ۔ ھو الشافی
۱۔ الّو کے پروں کا کاجل لگا کر پیشِ معشوق جائیں تو چشم زدن میں بیقرار و گرفتار عشق ہو جائے۔ (اس نسخہ میں راز داری برتیں۔ کیونکہ آج کل جب کہ انگشتریاں، کاجل اور سرمے دھڑا دھڑ بِک رہے ہیں اور نوجوان ان کے دیوانے ہو رہے ہیں۔ ورنہ یہ لوگ الّو کا وجود ہی ختم نہ کر دیں)۔
۲۔ الّو کے خون سے رنگا کپڑا جلا کر راکھ حاصل کریں۔ جن دو شخصوں کے سر پر چھڑکیں گے ان میں جنم جنم کی دشمنی پیدا ہو جائے گی۔ (آج کی سیاسی پارٹیوں پر کسی ستم ظریف نے شاید یہی نسخہ آزمایا ہے)۔
۳۔ ایک اہم اور قیمتی نسخہ برائے امتحان دہندگان۔ (ہوشیار کہ ہماری باری آئی)..... الّو کا دماغ سکھا لیا جائے۔ چالیس رات تاروں کی چھاؤں میں چھت پر رکھا جائے۔ روغن زیتون میں ڈال دیا جائے۔ اماوس کی رات اس تیل کو نتھار لیا جائے۔ نسخہ تیار ہے اس کو سر پر لگائیں چودہ طبق روشن۔ اس کا کاجل بنا کر آنکھ میں لگا کر جائیں۔ نقل کریں نقل پکڑی نہ جائے گی۔ آپ بھلے ہی پکڑ لیے جائیں۔
اس کتاب میں یہ نسخے بھی تھے: -
بے موسم پھل کھائیں۔ محبت کے کئی نسخے اور فارمولے، ڈاکو گرفتار کرنے کے نسخے، عقل حاصل کرنے کے نسخے، روزگار کے نسخے، نیند لگانے و اڑانے کے نسخے، دودھ پر سے جانور اڑانے کے نسخے، اپنا بھلا، دوسروں کا نقصان کرنے کے نسخے، وغیرہ وغیرہ۔
اگر آج اس کتاب کو کوئی ہمیں لادے تو ہم نہ جانے اسے کیا کیا دے دیں۔ کیونکہ ہم تو اس کی بدولت ہزار پتی ہو جائیں گے لانے والے کا بھی بھلا ہو گا یہ کتاب ہماری غیر حاضری میں حکیم شیخ غیب نے غائب کر دی۔ وہ عرصے سے ٹونے ٹوٹکے، علاج معالجے وغیرہ میں لگے ہوئے تھے۔ کسی ستم ظریف نے پتہ دے دیا کہ ہمارے پاس دیہاتی معالج، رہنمائے صحت، ہمدرد صحت، مستانہ جو گی وغیرہ کے پرچے ہیں اور افسوس کہ انہیں کا معائنہ کرتے ہوئے وہ کب اس کتاب کو اپنی تھیلی میں رکھ کر رفو چکر ہو گئے پتہ نہ چلا۔ بعد میں ان کا بھی پتہ نہ چل سکا۔ اللہ عالم الغیب ہے۔
اب الّو خوانی آخری مراحل کی طرف قدم زن ہوتی ہے۔ ادب میں اس کے کئی نام ہیں۔ الّو، چغد، بوم، صدی، گھگھو، شہباز شب (یہ نام علامہ اقبال نے دیا ہے)
تعارف و تعریفات الّو کے خاتمہ پر یہی کہہ سکتے ہیں کہ ؎
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے
(ماہنامہ شگوفہ دسمبر ۱۹۸۱)

محمد خورشید نادرؔ

محمد خورشید نادرؔ کا تعلق کامٹی سے تھا۔ انھوں نے ماہنامہ شگوفہ میں کئی مضامین تحریر کئے جن میں مردم گزیدہ۔ معیارِ انتخاب اور والدین قابلِ ذکر ہیں۔ ان کی تحریروں میں حسِ مزاح کے علاوہ ان کے مطالعے، مشاہدے اور غور و فکر کے شواہد ملتے ہیں۔
خورشید نادر نے فنِ ظرافت سے متعلق بھی ایک طویل مضمون تحریر کیا تھا جو ماہنامہ شگوفہ میں بالاقساط شائع ہوا تھا۔ ان کا ایک اور دلچسپ مضمون معیارِ انتخاب شگوفہ میں شائع ہو چکا ہے۔

والدین

محمد خورشید نادرؔ

اللہ تبارک و تعالیٰ کا کرم و احسان ہے کہ اس نے اپنے بندوں کو والدین جیسی نعمت عطا فرمائی۔ یہ نعمت عظمیٰ مفت اور عام ہے۔ زاہد و عابد اور خاطی و عاصی کی کوئی تخصیص نہیں، حتیٰ کہ منکر و ملحد اور زندیق و مرتد کو بھی اس سے محروم نہ رکھا۔ لطف یہ کہ یہ نعمت بلا طلب ملی ہے اور جو غالبؔ نے کہا ہے ؎

بے طلب دیں تو مزہ اس میں سِوا ملتا ہے

تو اس کا اطلاق والدین پر بھی ہوتا ہے کیونکہ بچوں کو والدین بے طلب ہی ملتے ہیں۔ نہ بچوں کا مزاج گدایانہ ہوتا ہے نہ ان میں خوئے سوال ہوتی ہے۔

یہ والدین بچوں کی آنکھوں کی ٹھنڈک، ان کے ایام طفلی کا سہارا، پرورش، نگہداشت اور تعلیم و تربیت کے ذمہ دار اُن کے جملہ اخراجات کے کفیل اور شرارتوں کے معاملے میں ان کے وکیل ہوتے ہیں۔ والدین یہ فرائض اعزازی طور پر انجام دینے کے لیے مامور مِن اللہ ہیں۔ انہیں نہ ستائش کی تمنا ہوتی ہے اور نہ صلہ کی پرواہ۔ وہ اس بات کے لیے مجبور ہیں کہ حتی المقدور اپنے فرائضِ منصبی انجام دے کر عِند اللہ ماجور ہوں۔

بعض والدین عجیب الوضع ہوتے ہیں۔ بعض غریب القطع، بعض شاخِ بے ثمر کی طرح ہوتے، بعض کثیر العیال اور قلیل الغذا۔ کچھ قِران السعدین کے نمونے ہوتے ہیں، کچھ اجتماع ضدّین کے، بعض میں موزونیت پائی جاتی ہے بعض میں شتر گربگی۔ بسا اوقات ماں ٹینی ہوتی ہے باپ کلنگ اور بچے رنگ رنگ۔ بعض عجیب الخلقت مجموعوں کو دیکھ کر ایمان لانا پڑتا ہے کہ ان کی جلد سازی میں یقیناً دستِ قدرت کا دخل ہے۔ لیکن قدرت ایسے ماڈل تفریح طبع کے لیے نہیں، دیدۂ عبرت نگاہ کے معائنہ کے لیے فراہم کرتی ہے، بقیہ معاملات میں خود حضرتِ انسان کی کاوش و انتخاب کا دخل ہوتا ہے۔ بعض مضحکہ خیز جوڑے شرارت یا دانستہ چشم پوشی کے باعث بھی وجود میں آتے ہیں۔ ایک درد مند بیوی نے اپنے شوہر سے کہا،

''آپ کا دوست جس لڑکی سے شادی کرنے والا ہے وہ انتہائی بد سلیقہ، زبان دراز اور مردافگن قسم کی ہے۔ آپ اسے اس شادی سے بعض رکھنے کی کوشش کیوں نہیں کرتے؟'' شوہر نے گردن جھٹک کر کہا، ''میں اسے ہرگز منع نہیں کروں گا، میں جب تم سے شادی کرنے والا تھا تو کیا اس نے مجھے حقائق سے آگاہ کیا تھا؟''

مگر بعض معاملات میں فریقین جملہ معاملات بالا بالا ہی طے کر لیتے ہیں اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوتی۔ ایک صاحب اپنے خانگی حالات سے سخت نالاں، بیزار اور دلبرداشتہ تھے کسی نے سبب دریافت کیا تو کہا،

''اپنی ناعاقبت اندیشی اور جلد بازی کا خمیازہ بھگت رہا ہوں۔ شادی اپنی پسند سے کی تھی۔ ہوا یہ کہ جب اس سے پہلی دفعہ ملاقات ہوئی تو میں بولتا رہا اور وہ سر جھکائے خاموشی سے سنتی رہی۔ بعد میں ملاقات ہوئی تو وہ مسلسل بولتی رہی اور مجھے بولنے اور مزید دریافت حال کا موقع ہی نہ ملا۔ وقتِ نکاح قاضی صاحب بولتے رہے اور ہم دونوں سنتے رہے، لیکن اب یہ حال ہے کہ ہم دونوں بولتے ہیں، بچے روتے ہیں، محلے والے سنتے ہیں اور رشتے دار ہنستے ہیں۔''

ایک اور صاحب سے شادی کے بعد کے حالات پر تبصرہ کرنے کے لیے کہا گیا تو انھوں نے پوری روداد حیات صرف ایک مصرع میں ادا کر دی یعنی فرمایا ؎

خام بدُم، پختہ شدم، سوختم

ایک نوگرفتار نے جو ابھی تک زیر دام پھڑک رہے تھے، اپنے قلبی تاثرات بیان کرتے ہوئے کہا،

''مجھے اس بات کا کوئی غم نہیں کہ بیوی بد صورت ملی اور دو بچے ساتھ لائی، قلق اس بات کا ہے کہ جہیز برائے نام ملا۔''

پھر ایک دلدوز آہ کے بعد کہا۔

مجھے غرقاب ہونے کا نہیں اس بات کا غم ہے

جہاں کشتی میری ڈوبی وہاں پانی بہت کم تھا

ہمارے ایک واقف کا رکی ازدواجی زندگی بڑی پُر سکون اور قابلِ رشک ہے۔ ہمہ وقت مطمئن اور مسرور دکھائی دیتے ہیں۔ ان سے اس کامیابی کا راز دریافت کیا گیا تو مسکراتے ہوئے کہا،

''ابتداءً میں بھی بڑا افسردہ، ملول اور پریشان خاطر رہا کرتا تھا۔ دن تو کسی صورت گزر جاتا مگر شام ہی سے چراغ مفلس کی طرح بجھا بجھا سا رہتا کیونکہ گھر کے تصور ہی سے روح فنا ہوتی تھی۔ آخر اپنے پیر و مرشد سے رجوع کیا ان کی نگاہ التفات نے گویا گھر کے در و دیوا رہی بدل دیئے۔ یہ آں جناب کے ملفوظات سے ہے کہ اپنی منکوحہ کو تھوڑے تھوڑے وقفے

سے یہ بات جتاتے رہنا چاہیے کہ بیک وقت چار بیویاں رکھنا شرعاً جائز ہے۔ مَیں نے اس نصیحت کو گرہ میں باندھ لیا ہے اور اسی پر عمل پیرا ہوں، چنانچہ اب اللہ کا بڑا کرم ہے۔''

ایسے والدین اب خال خال نظر آتے ہیں جو ہم پلہ اور ہر لحاظ سے متوازن ہوں، ورنہ مشاہدہ شاہد ہے کہ عموماً ایک فریق دوسرے پر حاوی و غالب ہوتا ہے، اپنی کارکردگی کے باعث نہیں بلکہ قوت گویائی کے بل بوتے پر۔ یہ شریکِ حیات شریکِ غالب کا درجہ رکھتا ہے، اور قدرت نے اس کی تخلیق میں نہ جانے کیا ترکیب رکھی ہے کہ اگرچہ وہ قینچی کی طرح چلتی ہے مگر تمام عمر اس کی دھار کُند نہیں ہوتی بلکہ یوماً فیوماً تیز تر ہوتی جاتی ہے۔ غالبؔ نے غالباً ذاتی تجربے کی بنا پر کہا ہے ؎

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

غالبِ خستہ پر ہی منحصر نہیں، علّامہ اقبال جیسے شمشیر بکف مَرد مومن نے بھی دہائی دی ہے ؎

یہ دستور زباں بندی ہے کیسا تیری محفل میں
یہاں تو بات کرنے کو ترستی ہے زباں میری

علّامہ موصوف ''ذوالقرنین'' تھے نہ جانے کیا گزرتی ہو گی۔ گمان غالب ہے کہ انھوں نے اپنے مرشد روحانی مولانا رومؒ کی نصیحت پر عمل کرتے ہوئے ''سِرّ بیگماں'' کو ''حدیثِ دیگراں'' کے طور پر پیش کیا ہے۔

ایسے خانگی ماحول میں جہاں ایک فریق کو اتنی بالا دستی اور تفوّق حاصل ہو کہ فریقِ ثانی ہمیشہ سکڑا، سہما اور دم بخودر ہے، اسے نہ اذن لب کشائی ہو نہ مجال دم زدن تو ظاہر ہے کہ اس صورت حال کے باعث بڑے پیچیدہ نفسیاتی اثرات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ شادی کے بعد ایک شوہر مرضِ خود کلامی میں مبتلا ہو کر بوقت شب بحالتِ خواب بآواز بلند بڑبڑانے لگے۔ شادی سے قبل یہ عارضہ نہ تھا۔ ان کی زوجہ محترمہ نے انھیں ایک نفسیاتی معالج کو دکھایا تو اس نے پوری رام کہانی سننے کے بعد ان کی بیگم کو تخلیہ میں طلب کر کے کہا،

''آپ کے شوہر کو کوئی بیماری نہیں ہے آپ صرف اتنا کیجیے کہ انھیں بھی دن میں بولنے کا موقع دیجیے۔''

جن گھروں میں ایسا ماحول ہو کہ ایک فریق نان اسٹاپ لیکچر دیئے جائے اور دوسرا کان دبائے سنتا رہے تو اس گھر کے بچے بھی متاثر ہوتے ہیں۔

ایک ماں نے اپنی بچی کو ڈانٹتے ہوئے کہا تم کتنی فضول بکواس کرتی ہو اور مسلسل شور مچا رہی ہو، اپنے بھائی کو دیکھو وہ کتنی خاموشی سے کھیل رہا ہے۔''

بچی نے کہا، ''اس کی خاموشی کا سبب وہ نہیں ہے جو آپ سمجھ رہی ہیں۔ ہم پاپا۔ ممی۔ گیم کھیل رہے ہیں۔ مَیں ممی کا رول ادا کر رہی ہوں اور یہ پاپا کا۔ پاپا رات گئے گھر آئے ہیں اور میں انھیں آپ کے لہجے میں ڈانٹ رہی ہوں، اس لیے اسے تو خاموش رہنا ہی ہے۔''

حالات کے مارے ہوئے بعض شوہر خود اپنے گھروں میں بے بسی اور بے چارگی کی زندگی گزارنے پر مجبور ہوتے ہیں۔ ان مجبوروں پر ناحق خود مختاری کی تہمت لگائی جاتی ہے، کیونکہ ویٹو پاور(حقِ تنسیخ)ان کی بیگمات کو حاصل ہوتا ہے وہ جو چاہتی ہیں کرتی ہیں اور یہ ٹک ٹک دیدم دم نہ کشیدم پر عمل کرتے نظر آتے ہیں۔

ایک وکیل صاحب ہی بے حد ذہین و طباع اور بے حد شریف و سنجیدہ۔ عدالت میں اپنی قانونی موشگافیوں کے باعث فریقِ مخالف کا ناطقہ بند کرنے اور منصف کو اپنے قانونی استدلال اور زور خطابت سے ہمنوا بنانے میں اپنا ثانی نہیں رکھتے مگر جب گھر پہنچتے ہیں تو ان کے طُرّہ پر پیچ و خم کا سارا پیچ و خم نکل جاتا ہے کیونکہ بیوی سخت جاہل، مغرور، منہ زور اور بے لگام ہے۔ تو انھیں نبض کائنات ڈوبتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ وکیل صاحب صلح پسند اور عافیت جُو انسان ہیں، جانتے ہیں کہ ایک خاموشی سو بلا کو ٹالتی ہے۔ اس لیے وہ بیوی کی کسی بات کی تردید کرنے سے عمداً گریز کرتے ہیں۔ ایک دن ان کے صاحبزادے نے کسی معاملے میں ان سے مداخلت کی اپیل کی تو بے بسی سے ہاتھ ملتے ہوئے کہا،

''میں اس معاملے میں کچھ نہیں کر سکتا، یہ میرے دائرۂ اختیار سے باہر ہے۔ ہائی کورٹ کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ سپریم کورٹ کے فیصلے کو رد کر کے خود اپنا فیصلہ صادر کرے، بلکہ اس پر رائے زنی اور تبصرہ کرنا بھی خطرے سے خالی نہیں کہ یہ توہینِ عدالت کے مترادف ہو گا۔''

شوہر عموماً بیویوں کی بے التفاتی اور بے رخی کے شاکی ہوتے ہیں مگر یہ محض غلط فہمی ہے بیوی کے لیے اس کا شوہر مجازی خدا ہوتا ہے مگر اسے شوہر کی خوشنودی کے علاوہ اور چیزوں کا بھی خیال رکھنا پڑتا ہے۔ وہ خیر خواہی کے علاوہ کفایت شعاری پر بھی نظر رکھتی ہے۔ ایک محترمہ اپنے شوہر کے ہمراہ دانتوں کے ڈاکٹر کے پاس پہنچیں اور کہا: ''ڈاکٹر صاحب! دانت میں سخت تکلیف ہے، مگر ہمیں ایک جگہ جلد از جلد پہنچنا ہے۔ یونہی کافی تاخیر ہو چکی ہے۔ اس لیے سوئی وغیرہ کی ضرورت نہیں آپ یونہی دانت نکال دیجئے۔''

ڈاکٹر نے انھیں کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا تو انھوں نے شوہر کو کرسی کی طرف دھکیلتے ہوئے کہا، ''ڈاکٹر صاحب! دانت میرا نہیں ان کا نکلوانا ہے۔''
بیوی خواہ کسی کی ہو، اِسرافِ بیجا کی متحمل نہیں ہو سکتی۔ ہاں! اس کے زیورات اور ملبوسات کی خریداری پر خرچ ہونے والی رقم کی بات دوسری ہے۔ بقیہ معاملات میں وہ فضول خرچی برداشت نہیں کر سکتی۔ اگر بفرض محال فضول خرچی ناگزیر ہو تب بھی وہ اس میں سے کچھ نہ کچھ پس انداز کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ایک صاحب چین اسموکر(Chain Smoker) تھے یعنی مسلسل سگریٹ پیتے تھے۔ بیوی نے لاکھ جتن کئے کہ یہ عادتِ بد چھوٹ جائے اور یہ غیر ضروری خرچ کم ہو جائے مگر شوہر عادت سے مجبور تھے۔ لیکن وہ بنت حوّا ہی نہیں جو کھلّی سے تیل نکالنے کا ہنر نہ جانتی ہو۔ چنانچہ اس نیک بخت کو وہ تدبیر سوجھی جو کسی مرد کے حاشیۂ خیال میں بھی نہیں آسکتی۔ اس نے شوہر کے ہاتھ میں چھوٹا سا ڈبہ تھما دیا اور کہا، ''آپ سگریٹ کی راکھ اس میں جمع کیجیے اور اس میں نمک خوردنی ملا کر منجن کی طرح استعمال کیجیے اور بازار سے منجن کی خریداری بند کر دیجئے۔''
مرد فطرتاً لا ابالی اور لا پرواہ ہے۔ وہ معمولی اور غیر اہم چیزوں کو نظرانداز کر دیتا ہے مگر بیوی جزئیات پر بھی گہری نظر رکھتی ہے۔ ایک ماں نے اپنے بچے سے کہا،
''دیکھو! آج سامنے کی دوکان سے کوئی سودا سلف خرید کر مت لانا۔''
بچے نے حیرانی سے پوچھا ''کیوں''؟
ماں نے کہا، ''وہ دوکاندار آج ہمارے گھر سے تمہارے دادا کا ترازو اور بانٹ لے کر گیا ہے۔'' لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ مرد ہر معاملے میں غبی ہوتا ہے۔ بعض خاص معاملات میں تو اتنا زیرک اور دانا ہوتا ہے کہ عورت بھی عش عش کرتے غش کھا جاتی ہے۔ دو سہیلیاں عرصے کے بعد دوبارہ ملیں۔ وہ عورت جو خود کو ہوشیار سمجھتی تھی اپنی سہیلی کے شانہ پر سر رکھ کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ دوسری سہیلی نے جو اس کی شادی کے پس منظر سے بخوبی واقف تھی، حیرانی سے اس گریہ و زاری کا سبب دریافت کیا تو اس نے سسکیوں کے درمیان کہا،
''میں دھوکہ کھا گئی اور خود اپنے بچھائے ہوئے جال میں پھنس گئی۔ میرا شوہر مجھ سے زیادہ شاطر نکلا۔''
سہیلی نے دریافت کیا، ''کیوں! کیا وہ دولت مند نہیں ہے؟ اس کی دولت حاصل کرنے کے لیے ہی تو تم نے اس سے شادی کی تھی۔''
پہلی سہیلی نے کہا، ''دولت مند تو ہے، مگر شادی کے وقت اس نے جو عمر بتائی تھی اس سے بیس سال کم عمر کا نکلا۔''
تجربہ شاہد ہے کہ عموماً دھوکہ وہی کھاتے ہیں جو خود کو ہوشیار اور دوسروں کو بیوقوف سمجھتے ہیں۔ ایک محترمہ نے شادی کے بعد اپنے شوہر سے شکایت کی،
''آپ مجھے شادی سے پہلے بہت تحائف دیا کرتے تھے طلب کرنے پر بھی اور بے طلب بھی۔ مگر آج شادی کو تین سال ہو گئے۔ دو بچوں کی پیدائش کے بعد ہم میاں بیوی کی سرحد عبور کر کے والدین بن گئے مگر آپ نے پھُوٹی کوڑی کا بھی تحفہ نہ دیا یا۔''
شوہر نے کہا، ''کیا تم نے کبھی دیکھا ہے کہ جال میں مچھلی پھنس جانے کے بعد کوئی شکاری اسے چارہ کھلاتا ہے؟ تم خود کو بہت ہوشیار اور مجھے عقل کا اندھا اور گانٹھ کا پورا سمجھتی تھیں مگر اب کیا خیال ہے''!
شوہر سے فرمائش کرنا بیوی کا حق سہی مگر اپنی تن پوشی کے لیے شوہر کی کھال کھینچنا بھی دانش مندی نہیں۔ ایک صاحب نے اپنی بیوی کو تحفے کے طور پر ایک کوٹ پیش کیا جس میں کسی برفانی جانور کی نرم و نازک بالوں سے بھری کھال کی پیوند کاری کی گئی تھی۔ بیوی پہلے تو بہت خوش ہوئی مگر پھر دفعتہً اداس ہو گئی۔ شوہر نے ڈوبتے دل سے پوچھا:
''کیوں! کوٹ پسند نہیں آیا؟''
بیوی نے کہا، ''کوٹ تو بہت خوبصورت اور قیمتی ہے مگر میں اس کے بارے میں سوچ رہی ہوں جس کی کھال اس کوٹ کے لیے کھینچی گئی ہے۔''
شوہر نے گلو گیر آواز میں کہا، ''ہمدردی کے لیے شکریہ''!
بعض بیویوں کو شکایت ہوتی ہے کہ انھیں موزوں شوہر نہ مل سکے بالکل یہی شکایت ان کے شوہروں کو بھی ہوتی ہے۔ والدین کا درجہ حاصل کرنے کے بعد یہ احساس اور شدید ہو جاتا ہے کیونکہ اس کے بعد گلو خلاصی نا ممکن تو نہیں مگر دشوار ضرور ہو جاتی ہے۔ ایک خاتون کو اپنی خوش فہمی پر سخت ندامت اور پشیمانی ہوئی۔ شادی کے کئی سال بعد جب ان کی خوش فہمی دور ہوئی اور انھیں اپنے شوہر کے ناکارہ اور نا اہل ہونے کا یقین ہو گیا تو انھوں نے اپنے شوہر سے بڑے تاسف سے کہا، ''شادی سے قبل آپ کہا کرتے تھے کہ میں کسی لائق نہیں۔ مگر میں نے اسے آپ کی خاکساری پر محمول کیا مگر اب معلوم ہوا کہ آپ سچ کہہ رہے تھے۔'' شوہر نے کہا، ''تم مجھ پر فریب دہی کا الزام عائد نہیں کر سکتیں۔ میں آج بھی اس بات پر قائم ہوں کہ

میں کسی لائق نہیں۔‘‘
لیکن اس واقعہ سے یہ نتیجہ اخذ کرنا غلط ہو گا کہ غلطی صرف ایک فریق سے ہوتی ہے۔ دوسرا فریق اس سے بھی بڑی غلطی کا مرتکب ہو سکتا ہے۔ ایک شخص نے اپنے نئے پڑوسی سے کہا،
’’وہ کالی کلوٹی، بھدی، موٹی اور بدصورت عورت جو ابھی آپ کے گھر میں داخل ہوئی کون ہے‘‘؟
’’وہ میری بیوی ہے‘‘ ۔
’’آپ کی بیوی ہے! معاف کیجئے، مجھ سے بڑی غلطی ہوئی، میں سمجھا......‘‘
اس شخص نے ٹھنڈی سانس لے کر کہا، ’’نہیں بھائی! غلطی تو در اصل مجھ سے ہوئی ہے‘‘ ۔
اسی لیے شریکِ حیات کے انتخاب میں تعجیل مناسب نہیں۔ ’’پہلے تولو پھر بولو۔‘‘ اسی موقع کے لیے کہا گیا ہے۔ یعنی کامل غور و فکر اور تفتیش و تفخص کے بعد ہی کہنا چاہیے کہ ’’جی ہاں! قبول کیا میں نے‘‘ ورنہ تیر از کمان جستہ باز نیا ید۔ اس ضمن میں کسی فریب خوردہ کا قول ہے کہ شادی بوقت صبح کرنا اولیٰ ہے کیونکہ اتنا وقت بہر حال باقی رہتا ہے کہ انتخاب پر نظر ثانی کر کے غلطی کا کیا ازالہ کیا جا سکے یا اس کا کفارہ ادا کرنے کی کوئی صورت نکالی جا سکے۔ اس کے برعکس شام میں شادی کرنے میں یہ یہ قباحت ہے کہ اس کے بعد غور و فکر تو درکنار پچھتانے کا بھی وقت نہیں رہتا۔
اسی لیے کہا گیا ہے جلدی کا کام شیطان کا ہوتا ہے۔ بے شک! بعض بزرگان سابقہ نے یہ بھی کہا ہے کہ نیک کام میں دیر نہ کرنی چاہیے مگر یہ مشورہ انھوں نے غالباً صاحبِ اولاد ہونے کے سلسلے میں دیا ہے شادی کے معاملے میں صبر و تحمل ہی مناسب ہے ورنہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سجدۂ شکر کے بعد سجدۂ سہو ادا کرنا پڑے۔
انگریز بھی اس معاملے میں محتاط تھے۔ ایک انگریز بزرگ کا قول ہے کہ ’’Look before you leap‘‘یعنی کودنے سے پیشتر یہ دیکھ لو کہ زمین ہموار ہے یا نہیں کہیں ایسا نہ ہو کہ جلد بازی میں کسی کنوئیں یا کھائی میں جا پڑو۔
بہرحال غور و فکر اور احتیاط لازمی و مقدم ہے۔ شادی سے قبل بھی اور اس کے بعد بھی بالخصوص خانگی معاملات میں ورنہ عجلت ندامت و پشیمانی کا باعث ہو سکتی ہے۔ ایک صاحب رات گئے گھر پہنچے۔ بھوک کی شدت سے آنتیں قل ہو اللہ کا ورد کر رہی تھیں، دیکھا کہ بیگم خورد و کلاں کے نرغے میں اس طرح بیٹھی ہیں جیسے مرغی اپنے چوزوں کے درمیان۔ معلوم ہوا کہ کھانا تیار نہیں۔ جل بھُن کر خود کباب ہو گئے۔ بیگم سے استفسار کیا تو وہ بولیں،
’’کھانا کون تیار کرتا، آپ نے ملازمہ کو فون پر گالیاں دیں وہ اسی وقت ملازمت چھوڑ کر چلی گئی،‘‘
’’ارے! فون پر ملازمہ تھی، میں سمجھا تم ہو‘‘۔
خانگی معاملات میں اس نوعیت کے واقعات کا ظہور پذیر ہونا معمولات میں سے ہے لیکن اگر محترمہ امور خانہ داری سے واقف ہوتیں تو ایسی ناگوار صورتِ حال پیدا نہ ہوتی۔ اسی لیے ماہرین فرائض نسواں کا کہنا ہے کہ امور خانہ داری سے مکمل واقفیت زیورات اور ملبوسات سے زیادہ اہم ہے ورنہ تعلقات میں کشیدگی اور پیچیدگی پیدا ہونا ناگزیر ہے۔ ایک شوہر اپنی کاروباری مصروفیات سے خستہ اور بھوک سے نڈھال، افتاں و خیزاں گھر پہنچے۔ مگر پہلا لقمہ منہ میں رکھتے ہیں ان کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ قہر آلود نظروں سے بیوی کو گھورا اور لقمہ کو بمشکل نگلنے کے بعد پوچھا: ---- ’’یہ کھانا تم نے تیار کیا ہے؟‘‘
’’جی ہاں!‘‘ بیوی نے لہک کر کہا۔ ’’اس کی ترکیب میری ایک سہیلی نے بتائی تھی، کیوں؟ کیسا لگا؟‘‘
’’وہ میں بعد میں بتاؤں گا، پہلے تم مجھے یہ بتاؤ کہ شادی کے بعد تمہاری اس سہیلی کا کیا حشر ہوا؟‘‘
بیوی نے ٹھنڈی سانس لی اور کہا، ’’اس کے شوہر نے اس کی قدر نہ کی، آج کل میکے میں ہے۔‘‘
شوہر نے اس طرح سر ہلایا گویا سہیلی کا انجام اس کی توقع کے عین مطابق ہوا ہو۔ یوں بھی ایسی بیوی کا میکے ہی میں رہنا اچھا ہے جو اتنا خراب کھانا تیار کرے کہ شوہر تو کجا گھر کا کتا بھی پڑوس میں جا کر کھائے۔
مرد فطرتاً برد بار واقع ہوا ہے، طیش میں اسی وقت آتا ہے جب پیمانۂ صبر لبریز ہو جائے۔ اس میں خدانخواستہ وقوف و شعور کی کمی نہیں مگر تحمل اور درگزر اس کی فطرت ہے، مگر بدقسمتی سے اس کے اس طرز عمل کو عورت کی چشم ظاہر بین حماقت سے تعبیر کرتی ہے، خود کو اس سے زیادہ چالاک سمجھتی ہے اور پھر اسے اس چالاکی کا خمیازہ بھگتنا پڑتا ہے۔ ایک فیشن ایبل، روشن خیال اور آزاد رو محترمہ اچانک بیمار ہوئیں، بسترِ علالت بسترِ مرگ بن گیا۔ جب دم واپسیں برسرِ راہ ہوا تو آخری دو ہچکیوں کے درمیان کہا،
’’میں نے آپ سے بارہا بے وفائی کی ہے، مگر آپ کو اس کا علم نہ ہوا، مجھے معاف.........‘‘
’’مجھے اس کا علم ہو گیا تھا‘‘ شوہر نے بڑے سکون سے کہا۔ ’’لیکن تمہیں اس کا علم نہ ہو سکا کہ تمہیں زہر کس نے دیا ہے۔‘‘
یہ سن کر ان محترمہ کی آنکھیں خوف و حیرت سے پھیل گئیں اور تدفین تک اسی حالت میں رہیں۔ جو بیوی خود کو چالاک اور شوہر کو احمق سمجھے گی وہ اسی طرح غچہ کھائے گی۔

دوسروں کو بیوقوف سمجھنا غالباً عورتوں کی فطرت ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی ہم جنسوں کو بھی بے وقوف بنانے کی کوشش کرتی ہیں۔ ایک تقریب میں چند مستورات یکجا تھیں۔ ان میں سے ایک محترمہ زیادہ تیز و طرار تھیں۔ انھوں نے لوازماتِ حسن استعمال کرنے میں بڑی فیاضی سے کام لیا تھا اور اپنے بدن کو دلّی شہر کا مینا بازار بنا رکھا تھا۔ وہ محترمہ اپنی عمر اتنی کم بتا رہی تھی کہ آخر وہ عورتیں بھی چڑھ گئیں جنھوں نے خود اپنی عمریں دس دس سال کم بتائی تھیں۔ ان محترمہ کی بغل میں ان کی بیٹی بھی بیٹھی ہوئی تھی۔ اس سے برداشت نہ ہو سکا تو اس نے کہا:

''امی اب اتنی ننھی بھی نہ بنیں۔ اپنی اور میری عمر میں کم از کم نو مہینے کا تو فرق رکھیئے۔''

اپنی عمر کم بتلانا غالباً مستورات کا نفسیاتی مرض ہے اور شاید ان میں وراثتاً پایا جاتا ہے۔ ایک خاتون نے اپنے شوہر سے کہا،

''یہ اپنی نئی پڑوسن مجھ سے بہت جلتی ہے۔ خود تو نوخیز بنتی ہے مگر میری عمر تیس سال بتاتی ہے۔''

''وہ بے وقوف ہے۔'' شوہر نے کہا ''اس نے تمہاری عمر کا اندازہ غلط لگایا ہے۔''

بیوی نے خوش ہو کر کہا، ''اچھا میری عمر کے متعلق آپ کا کیا انداز ہے؟''

''کم از کم چالیس سال'' شوہر نے پورے یقین سے کہا۔

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ وبا صرف عورتوں میں پھیلی ہوئی ہے مردوں میں بھی یہ رجحان پایا جاتا ہے دروغ بر گردن راوی۔۔ جوشؔ، فراقؔ اور مجازؔ ایک رات کہیں ہم پیالہ تھے جب کئی دَور چل چکے تو جوشؔ نے کہا:

''ماشاء اللہ، ابھی جوان ہیں، ہماری عمر پچیس سال کے لگ بھگ ہو گی۔''

فراقؔ نے پوپلے منہ سے کہا، ''ظاہری شباہت سے قطع نظر میں بھی اٹھارہ بیس سال سے زیادہ عمر کا نہیں ہوں۔''

مجازؔ نے معصومیت سے کہا، ''اس حساب سے مَیں تو ابھی پیدا ہی نہیں ہوا۔''

بچے والدین کو مربوط رکھنے کے لیے سنہری زنجیر کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ نہ ہو تو ان کے درمیان ایک تکلیف دہ خلاء محسوس ہوتا ہے۔ یہ خلاء اگرچہ مصنوعی طور پر پُر بھی کیا جا سکتا ہے، مگر اوریجنل اولاد کی بات ہی دوسری ہے۔ یہ مضبوط، پائیدار اور قابلِ اعتماد ثابت ہوتے ہیں۔ فریقین میں سے کوئی رسیاں تڑانے کی کوشش کرے تو یہ زنجیر پا ثابت ہوتے ہیں۔ بعض بچے فطرتاً شوخ و شنگ اور شریر ہوتے ہیں، اتنے شریر، چالاک اور ایسے بہانہ ساز کہ والدین دانتوں تلے انگلی دبا کر رہ جاتے ہیں۔ ایک شریر بچہ اسکول سے کافی تاخیر سے گھر واپس ہوا۔ ماں نے تاخیر کا سبب دریافت کیا تو کہا،

''راستے میں اتنی کیچڑ اور پھسلن تھی کہ میں ایک قدم آگے رکھتا تو دو قدم پیچھے سرک جاتا تھا۔''

ماں نے بڑی حیرت سے کہا، ''اس صورت میں تو تمھیں گھر پہنچنے کے بجائے اسکول سے بھی آگے نکل جانا چاہیے تھا۔''

''میں اتنا بیوقوف نہیں ہوں۔'' بچے نے مسکرا کر کہا ''میں نے اپنا رخ بدل لیا تھا۔ اپنا منہ اسکول کی طرف کر لیا تھا اور پشت گھر کی طرف۔''

یہ نئی نئی شرارتوں کے موجد ہوتے ہیں۔ اگر کوئی شریر بچہ خلافِ معمول خاموش اور سنجیدہ نظر آئے تو اس کا مطلب خدانخواستہ یہ نہیں کہ وہ شرارت سے تائب ہو چکا ہے۔ بلکہ یہ در اصل اس بات کی علامت ہے کہ وہ کوئی خطرناک شرارت کر چکا ہے اور اب سنجیدگی سے والدین کے رد عمل کا منتظر ہے۔

بعض بچے اتنے نڈر اور بے باک ہوتے ہیں کہ والدین تو کجا دوسروں کو بھی خاطر میں نہیں لاتے۔ ایک بچہ اپنے گدھے کی رسی تھامے چل رہا تھا۔ جب وہ ایک کیمپ کے قریب سے گزرا تو اپنے گدھے کی گردن کو مضبوطی سے پکڑ لیا اور جلد جلد چلنے لگا۔ ایک فوجی یہ منظر دیکھ رہا تھا اس نے خوش دلی سے مسکرا کر کہا:

''تم نے اپنے گدھے کو اتنی مضبوطی سے کیوں تھام رکھا ہے؟ کیا اس سے برادرانہ محبت ہے؟''

''نہیں! مَیں نے اسے اس لیے تھام رکھا ہے کہ کہیں یہ گدھا بھی فوج میں نہ بھرتی ہو جائے۔''

فوجی نے بگڑ کر کہا، ''ہمیں تمہارے مریل گدھے کی ضرورت نہیں۔ ہمارے کیمپ میں ایک سے بڑھ کر ایک گدھے موجود ہیں۔''

عورتوں کے متعلق یہ غلط فہمی عام ہو گئی ہے کہ وہ ناقص العقل ہوتی ہیں، یہ ہوائی نہ جانے کس دشمنِ زن نے اڑائی ہے۔ ہم نے ایک واقفِ اسرارِ نسواں سے اپنا نقطۂ نظر بیان کرنے کی استدعا کی تو اس نے بعض ٹھوس دلائل پیش کرنے کے بعد اِتمامِ حجت کے لیے ذیل کا واقعہ سنایا،

''ایک شخص کو محسوس ہوا کہ اس کا دماغ کثرت کار اور ہجومِ افکار کے باعث ناکارہ ہو گیا ہے۔ چنانچہ وہ ایک اسٹور میں داخل ہوا جہاں انسانی اعضاء فروخت کیے جاتے تھے۔ سیلز مین نے اسے دو بھیجے پیش کیے ایک مرد کا تھا اور دوسرا عورت کا۔ اس شخص کو یہ جان کر سخت حیرت ہوئی کہ مرد کے بھیجے کی قیمت ناقابلِ یقین حد تک کم تھی اور عورت کے بھیجے کی قیمت حدِ قیاس سے سِوا۔ اس نے سیلز مین سے پوچھا،

''عورت کے دماغ کی قیمت اتنی زیادہ کیوں ہے؟ کیا عورت مرد سے زیادہ عقلمند ہوتی ہے؟''

''جی نہیں'' سیلز مین نے مسکرا کر کہا۔ ''آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ بات در اصل یہ ہے کہ آدمی کا دماغ استعمال شدہ ہے جبکہ عورت کا دماغ سرے سے استعمال ہی نہیں کیا گیا۔ اس لیے ابھی تک اصلی حالت میں موجود ہے۔''
مگر ہمارے مطالعے میں جو واقعہ آیا، وہ اس سے مختلف ہے۔
ایک والد صاحب اپنے بچے کی انگلی تھا مے برٹش میوزیم میں داخل ہوئے۔ ایک شوکیس میں دو کھوپڑیاں رکھی ہوئی تھیں، ایک چھوٹی دوسری بڑی۔ بچے نے اس کے بارے میں دریافت کیا تو والد بزرگوار نے تختی پر درج شدہ عبارت کو پڑھنے کی کوشش کی مگر کچھ پلے نہ پڑا۔ بچے نے وضاحت کے لیے اصرار کیا تو اپنی صوابدید کے مطابق فرمایا، ''یہ دونوں کھوپڑیاں شیکسپیئر کی ہیں چھوٹی کھوپڑی اس وقت حاصل کی گئی تھی جب وہ بچہ تھا اور بڑی اس وقت جب اس کا انتقال ہوا۔''
یہ وضاحت اس طبقے کے فرد کی ہے جو کامل العقل ہونے کا مدعی ہے خواتین و حضرات سے متعلق ایک اور متنازعہ فیہ مسئلہ یادداشت سے متعلق ہے۔ ماہرینِ امراضِ نسواں کی تحقیق کے مطابق مرض نسیان طبقۂ نسواں میں شاذ ہی پایا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مردوں میں عام ہے اور شادی کے بعد مزمن صورت اختیار کر لیتا ہے۔ خواتین اپنے ذاتی تجربے کی بنا پراس تحقیق کی نہایت شدّ و مد سے تائید و تصدیق کرتی ہیں اور اس معاملے میں وہ حق بجانب ہیں۔
ایک میاں بیوی شاپنگ کے بعد گھر لوٹے تو شوہر نے کہا،
''تم مجھے بھلکڑ کہتی ہو مگر دیکھو! تم اپنی چھتری دوکان پر چھوڑ آئی تھیں، اور مَیں نہ صرف یہ کہ اپنی چھتری لے آیا ہوں بلکہ تمھاری چھوڑی ہوئی چھتری بھی ساتھ لیتا آیا ہوں۔''
بیوی نے پیشانی پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا، ''آپ نے یہ کیا غضب کیا! ہم تو خالی ہاتھ شاپنگ کے لیے نکلے تھے۔ وہ دیکھئے ہماری چھتریاں تو گھر پر ہی موجود ہیں۔''
ہمیں افسوس ہے کہ بہت سے سخن ہائے گفتنی بخوف طوالت نا گفتہ رہ گئے۔
(ماہنامہ شگوفہ ۱۹۸۶)

نثار اختر انصاری

نثار اختر انصاری بنیادی طور پر صحافی ہیں۔ ناگپور سے شائع ہونے والے پندرہ روزہ اخبار ہمہ گیر کے ایڈیٹر کی حیثیت سے خدمات انجام دے چکے ہیں۔ اس اخبار کے چیف ایڈیٹر ان کے والد رفیق انصاری تھے۔ یہ اخبار ۱۹۸۰ سے ۱۹۸۶ کے درمیان ناگپور سے پابندی سے نکلتا رہا۔ نثار اختر انصاری اب بھی گاہے بگاہے اردو اور ہندی کے اخبارات و رسائل میں مختلف موضوعات پر مضامین لکھتے رہتے ہیں۔ انھوں نے روزنامہ انقلاب ممبئی مینظ انصاری کی ادارت کے زمانے میں شائع ہونے والے کالم ''خالی پیلی'' میں چند مزاحیہ مضامین لکھے تھے۔ ان کی تحریروں میں سماجی کی زندگی کے عکاسی اور اس پر عمدہ طنز کے نمونے ملتے ہیں۔

قوالی

نثار اختر انصاری

جمّن میاں بچپن ہی سے قوالی کے دیوانے ہیں۔ دن بھر ''ہمیں تو لوٹ لیا مل کے حسن والوں نے'' گنگناتے رہتے ہیں۔ ان کے دوست شیخو کو قوالی سے سخت نفرت ہے۔ ان کا فلسفہ یہ ہے کہ قوالی اسمٰعیل آزاد، عبد الرّحمٰن کانچ والے، صالح محمد، حبیب پینٹر، بندے حسن اور شنکر (شمبھو) کے ساتھ ختم ہو گئی۔ جبکہ جمّن میاں کا دعویٰ ہے کہ قوالی قومی یکجہتی کی علمبردار ہے۔ اور یوسف آزاد، عبد الرّب چاؤش، جانی بابو، عزیز نازاں، جعفر بدایونی اور مجید شعلہ قوالی کے روشن ستارے ہیں۔ شیخو کی رائے یہ ہے کہ قوالی اس دن سے فنا ہو گئی جب عورتوں نے اس دنیا میں قدم رکھا۔ جمّن میاں کا کہنا ہے کہ شیخو عورتوں کا دشمن ہے۔ آج کل دنیا ترقی کی منزلیں طے کر رہی ہے۔ جب عورتیں گورنر، وزیر اعلیٰ اور منسٹر بن سکتی ہیں تو قوالی گانے میں کیا برائی ہے؟

جمّن میاں کی اس قوالی دوستی سے ان کی بیگم سخت نالاں ہے۔ صبح سویرے اٹھتے ہی جمن میاں زور سے گانے لگتے ہیں۔
تیری زلفوں کے سائے میں بسیرا ہو گیا
مجھے نیند ایسی آئی کہ سویرا ہو گیا
ان کی بیوی جب میونسپل کارپوریشن کے نل سے پانی لے کر آتی ہے تو ان کی دوسری قوالی
گوری چھلکے نہ گگریا دھیرے
مجھ کو بد نام نہ کر عشق پہ تہمت نہ لگا
گانا شروع کر دیتے ہیں۔ مزہ اس وقت آتا ہے جب جمّن میاں
آنکھوں کا نور ہے دل کا سرور ہے
جانِ بہار تو تو کشمیری حور ہے
گانے لگتے ہیں اس وقت ان کی اہلیہ کا پارہ گرم ہو جاتا ہے اور نوبت بیلن تک پہنچ جاتی ہے جمن میاں دھیرے دھیرے
بڑے بدنصیب ہم تھے جو قرار تک نہ پہنچے
درِ یار تک تو پہنچے دلِ یار تک نہ پہنچے
گاتے ہوئے گھر سے باہر چلے آتے ہیں۔

ہوٹل پہنچ کر اپنے چند خاص دوستوں کے ہمراہ گپ شپ میں محو ہو جاتے ہیں۔ قوالی سننے کے لیے جمّن میاں میلوں پیدل سفر کرتے ہیں۔ اس سفر میں کلّو ملّو بھی ان کے ہمراہ ہوتے ہیں۔ کلو ملو قوالی کے پروگرام میں ۵ کا نوٹ رکھ کر ۱۰ روپے اٹھا لینے میں کافی ماہر ہیں۔ لیڈیز قوالوں سے خاص لگاؤ ہے اس لگاؤ کی وجہ سے یہ تینوں قوالی نواز اکثر اسٹیج پر ہی بیٹھ کر قوالی کا لطف لیتے ہیں۔ تھیٹر پروگرام میں کسی نہ کسی وسیلے کے تحت انھیں پاس مل جاتا ہے۔ گھر میں بھلے ہی ایک مٹھی نمک نہ ہو لیکن تھیٹر پروگرام میں جمّن میاں سو پچاس روپے قوا لوں کو دیے بغیر نہیں لوٹتے۔ جمّن میاں کے محلے میں ایک درگاہ ہے۔ اس درگاہ کی عرس کمیٹی ہر سال قوالی کے پانچ روزہ پروگرام کی ساری ذمہ داری ان کے سپرد کر دیتی ہے۔ کلّو ملّو اور جمّن میاں سب کام کاج چھوڑ کر قوالوں کو طے کرنے میں لگ جاتے ہیں۔

ہر سال بڑے سے بڑے قوالوں کی آمد ہوتی ہے۔ کلو اور ملو لیڈیز قوالوں کی دعوت اپنے گھر دیتے ہیں۔ اس طرح ہر سال چار پانچ نئی قوالہ سے ان حضرات کا رابطہ قائم ہو جاتا ہے! جمّن میاں کے دل میں بھی بڑا ارمان ہے کہ وہ قوالوں کی اپنے گھر میں ضیافت کریں جن میں خاص طور پر چند خواتین موجود ہوں۔

لیڈیز قوالوں کی دعوت اپنے غریب خانے پر رکھنے کی خواہش ہے لیکن ان کی بیوی ان کا ارمان پورا نہیں ہونے دیتی۔ جمن میاں نے کئی بار اپنی بیوی کو سمجھانے کی کوشش کی ''ارے پگلی'' قوالی ایک فن ہے۔ اس کو گانے والے چاہے مرد ہوں یا خاتون فنکار ہیں۔ فن اور فنکار دونوں کی عزت کرنا چاہیے۔ قوالی روح کی غذا ہے بیگم۔ خدا کے لیے اس مسئلہ پر اتنی سنگ دل نہ بنو۔''

لیکن ان کی بیگم بھی جھانسی کی رانی اور چاندی بی بی کی طرح ارادے کی بڑی پکی ہے۔ جمن میاں کی ساری بات ایک کان سے سن کر دوسرے کان سے نکال دیتی ہے۔ جمّن میاں بیوی کا سارا غصہ شیخو پر اتارتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ جب تک شیخو جیسے لوگ زندہ ہیں قوالی گھر گھر عام نہیں ہو سکتی ہے۔''

شیخو ان حرکتوں کا عادی ہو چکا ہے۔ آج کل دونوں میں سلام کلام سب بند ہے۔ جمن میاں نے بھی بڑھاپے کی وجہ سے پروگرام میں آنا جانا کم کر دیا ہے۔ ایک لیڈیز قوال کے ساتھ نازیبا حرکات کرنے کے جرم میں پولس کلّو اور ملّو کی کافی پٹائی کر چکی ہے۔

لیکن اُدھر شیخو نے کیسٹ کی دوکان لگا لی ہے جہاں ہر قوال اور قوالہ کے نئے پرانے تمام کیسٹ مناسب داموں میں دستیاب ہیں۔ جمن میاں اب شیخو سے بات چیت شروع کرنے کا پروگرام بنا رہے ہیں۔
(خالی پیلی، روزنامہ انقلاب، ممبئی)

شکیل شاہجہاں

شکیل شاہجہاں کا تعلق کامٹی سے تھا۔ وہ کوکن کے ایک اسکول میں برسر روز گار تھے وہیں ان کا انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنے ڈراموں کے لئے مشہور تھے۔ انھوں نے کئی ڈرامے لکھ کر اسٹیج پر کامیابی کے ساتھ پیش کیے اور اس سلسلے میں انھیں

انعامات سے بھی نوازا گیا تھا۔
شکیل شاہجہاں کے یک بابی ڈراموں کا مجموعہ ’’کبھی ایسا بھی ہوتا ہے‘‘ کافی مقبول ہوا۔ ان کی جو تحریریں ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوا کرتی تھیں ان میں مزاح قدرے زیادہ تھا۔ شکیل شاہجہاں نے اپنے ڈراموں میں ظرافت کے پردے میں سماج کی کمزوریوں پر طنز کیا یہی خوبی ان کی مزاحیہ تحریروں میں نمایاں ہے۔

زوجہ گزیدہ

شکیل شاہجہاں

آپ بازار جاتے ہیں۔ اچھی طرح دیکھ پرکھ کر دوکان سے ایک پپیتا خریدتے ہیں۔ گھر لانے کے بعد اسے کاٹتے ہیں۔ اچھا نکل گیا تو ہنسی خوشی کھا لیتے ہیں اور اگر اچھا نہیں نکلا تب بھی اسے پھینکتے نہیں، بلکہ دوا سمجھ کے کھا لیتے ہیں۔ عورت کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ اچھی طرح دیکھ پرکھ کر ایک عدد عورت کو بیوی بنا کر گھر لاتے ہیں۔ وہ اچھی نکلی تو گھر کو جنت بنا دیتی ہے ور اگر اچھی نہیں نکلی تب بھی آپ اسے خود سے الگ نہیں کرتے۔ بلکہ قسمت کی دین سمجھ کر سب کچھ بر داشت کر لیتے ہیں۔
کتے کا کاٹا بھونکتا ہے، سانپ کا ڈسا مر جاتا ہے، لیکن عورت (بیوی) کا کاٹا نہ بھونکتا ہے نہ مرتا ہے، بس تڑپتا رہتا ہے۔
ایسے ہی شخص کو ’’زوجہ گزیدہ‘‘ کہتے ہیں۔ اس شخص کے پاس الفاظ کا زبردست ذخیرہ ہوتا ہے۔ لیکن وہ استعمال نہیں کر پاتا۔ (خاص طور پر اپنی بیوی کے سامنے)ملنساری، عاجزی اور انکساری اس میں کوٹ کوٹ کا بھری ہوتی ہے۔ غصہ کم آتا ہے۔ بلند آواز میں بات نہیں کرتا۔ قوتِ برداشت زبردست ہوتی ہے اور سمجھوتے کی بے پناہ طاقت۔ یہ شخص جب تک چار دیواری میں ہوتا ہے، بھیگی بلی بنا رہتا ہے، جیسے ہی باہر نکلتا ہے شیر بن جاتا ہے۔ ہم بھی اسی زمرے میں شامل ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ہم اپنی بیوی سے ڈرتے ہیں۔ اجی حضور! ڈرنا پڑتا ہے۔ خوش حال ازدواجی زندگی کے اصولوں میں یہ بھی شامل ہے۔
جب بیوی بہت زیادہ پیار جتائے تو سمجھ لو کہ وہ کوئی راز چھپا رہی ہے اور جب بہت خوش نظر آئے تو سمجھ لیجئے کہ آپ کی جیب کی خیر نہیں، یعنی کوئی فرمائش ہونے والی ہے۔ ایک دن ہماری بیگم بہت خوش نظر آئیں۔ ہم سمجھ گئے کہ کوئی ’’مانگ‘‘ ہے۔ کیونکہ مانگ بھر نے کے بعد مانگوں کو پوری کرنے کی زحمت شوہر کو تا عمر اٹھانی پڑتی ہے۔ بیگم قریب آتے ہی کہنے لگیں۔ ’’اجی! وہ بغل والے نسیم ماسٹر اپنے بچے کے لیے ’لو اسٹوری ‘برانڈ بنیان لائے ہیں۔ آپ بھی منے کے لیے وہ بنیان لا دیجئے نا!‘‘
’’بیگم! اس بنیان کی بات کر رہی ہو، ایک مرتبہ دھلنے کے بعد جس کی ’’لو‘‘ الگ اور ’’اسٹوری‘‘ الگ ہو جاتی ہے۔ ہم نے بنیان کو اپنی زندگی سے تشبیہ دیتے ہوئے کہا۔
’’کچھ بھی ہو بنیان ضرور لانا۔‘‘ بیگم بولیں اور مصنوعی غصہ دکھاتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئیں۔ بیوی مصنوعی غصہ اس لیے دکھاتی ہے کہ اس کو روٹھنا بھی شوہر سے ہوتا ہے اور منوانا بھی شوہر ہی سے ہوتا ہے۔ خیر صاحب۔ بیوی کی فرمائش شوہر پوری نہ کرے، ہماری دانست میں ایسا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ شوہر کو بھی آخر کار بیوی ہی سے واسطہ پڑتا ہے۔ بیوی کے کہنے کے مطابق ہم نے لو اسٹوری برانڈ بنیان تلاش کی لیکن نہیں ملی۔ پھر ہم نے ’’ہمت والا‘‘ برانڈ بنیان منے لے لیے خرید لی۔ بیگم خوش، منا خوش اور ہم بھی خوش۔ خوشی کی وجہ سے رات کے دو بجے تک نیند نہیں آئی۔ اس طرح کے پر مسرت موقعوں پر اکثر جاگنے کو جی چاہتا ہے۔
ایک رات بیگم نے شکایت کی ’’اجی! جب سے آپ ’’ہمت والا‘‘ برانڈ بنیان لائے ہیں تب سے منّے کی بہت شکایتیں آ رہی ہیں۔ پڑوس کے لڑکوں کو بہت مار پیٹ کر رہا ہے۔‘‘
’’مار رہا ہے یا مار کھا رہا ہے؟‘‘
’’مار رہا ہے، جب ہی تو شکایتیں آ رہی ہیں اور بچے اس سے بہت ڈرنے لگے ہیں۔‘‘
دوسرے دن ہم بھی ’’ہمت والا‘‘ برانڈ بنیان خرید لائے اور پہن لی کہ بیگم صاحبہ بھی ہم سے ڈریں۔ لیکن بیگم پر اس بنیان کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ ہم حیران کہ آخر بات کیا ہے؟ کئی دنوں بعد یہ راز کھلا کہ بیگم جو ساڑی استعمال کرنے لگی ہیں وہ ’ ’ ہنٹر والی‘‘ برانڈ تھی۔
شہر میں جب کوئی بہت بڑا نیتا آنے ولا ہوتا ہے تو شہر کی صفائی، سڑ کوں کی مرمت، پلوں کی تعمیر شروع ہو جاتی ہے تاکہ

نیتاجی کو شہر کے انتظامیہ پر اعتماد ہو جائے۔ ٹھیک اسی طرح جب اس خاکسار کی ساس صاحبہ گھر آنے والی ہوتی ہیں تو بیگم بڑی لگن سے گھر کی صفائی سفیدی اور مرمت وغیرہ کرنے میں جٹ جاتی ہیں۔ ساس کے علاوہ ہم پربھی زور زبردستی کم ہو جاتی ہے۔ بیگم ہر لمحہ ہم پر مہربان رہتی ہیں۔ ادھر منھ سے بات نکلی اورادھرپوری ہوئی۔ زندگی کے ان ہی سنہرے دنوں کو ہم برے وقتوں میں یاد کر کے خوش ہوتے ہیں۔ ہماری ساس صاحبہ جب ہمارے گھر تشریف لاتی ہیں تو بیگم ہمارا گھر اور گھر کا بہت خیال رکھتی ہیں تاکہ ساس صاحبہ کو اپنی بیٹی کی انتظامی صلاحیتوں پر بھروسہ ہو جائے اور ہماری جانب سے کوئی شکایت ان تک نہ پہنچے۔ ساس صاحبہ دوچار دن رہتی ہیں اور چلی جاتی ہیں۔ اس کے بعد پچھلا سبق دہرا یا جاتا ہے۔ وہی بیگم۔ وہی ہم۔۔ ۔۔ ۔۔، اور وہی ہمارے درمیان کے حالات۔ ہم تو مالک سے یہی دعا کرتے رہتے ہیں کہ ساس صاحبہ دو چار سال ہمارے ہی گھر میں رہ جائیں۔ کاش ایسا ہوتا لیکن ایسا نہیں ہوتا۔

لوگ دیتے ہیں بہت زور کہ شادی کر لو
جانے کیا ان کو ملا ہے مجھے تنہا کر کے

(ماہنامہ شگوفہ، حیدر آباد۔ دسمبر ۱۹۸۹)

ڈاکٹر اشفاق احمد

ڈاکٹر اشفاق احمد ادیب الاطفال اور افسانہ نگار کے طور پر ادب میں معروف ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کئی کتابیں منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ان کے افسانچے اور کہانیاں اردو اور ہندی دونوں زبانوں میں شائع ہو چکی ہیں۔ ڈاکٹر اشفاق احمد کی پیدائش یکم جولائی ۱۹۶۱ کو رائے پور (تعلقہ چکھلی ضلع بلڈانہ) میں ہوئی۔ انھوں اردو میں ایم اے، بی ایڈ اور پی ایچ کی ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ قدوائی ہائی اسکول و جونیئر کالج ناگپور میں تدریس کے فرائض انجام دینے کے بعد سبکدوش ہوئے۔ صبح کا بھولا، برجستہ، آئینہ ایام ان کی کتابیں ہیں۔ مختلف سرکاری اور غیر سر کاری اداروں نے انھیں انعامات اور اعزازات سے نوازا ہے۔ ان کے چند مزاحیہ مضامین بھی شایع ہوئے ہیں۔

محلے کا سرکاری نل

ڈاکٹر اشفاق احمد

دنیا میں وارد ہونے کے بعد جب ہم کچھ دیکھنے، بولنے اور سننے کے قابل ہوئے تو سب سے پہلے ہمارا دھیان گھر کے سامنے چورا ہے پر لگے نل اور جم غفیر کی طرف گیا۔ اس وقت یہ بات ہماری سمجھ میں نہ آئی کہ محلے کے سبھی لوگ اسی ایک نل پر پانی بھرنے کے خواہش مند کیوں ہیں؟ اور پانی بھرنے کے لیے ایک دوسرے پر اس طرح کیوں ٹوٹے پڑتے ہیں جیسے تبرک حاصل کرنے کے لیے کسی درگاہ پر۔۔ ۔۔ یہاں لوگ معصوم بچوں کو بھی کچل دیتے ہیں۔ وقت بیتنے کے ساتھ ساتھ جب ہماری عقل کے دروازے کھلتے گئے تو یہ بات بھی کھل کر سامنے آ گئی کہ ہم جس ملک میں رہتے ہیں وہ ایک آزاد ملک ہے۔ عوام کی سہولت کے لیے سرکار نے ہر محلے میں نل لگا رکھا ہے اور سبھی کو اس پر پانی بھرنے کا پورا حق ہے۔ جو بھرتے ہیں انھیں بھی ٹیکس دینا ہوتا ہے اور جو نہیں بھرتے وہ بھی ٹیکس سے بچ نہیں سکتے۔ اس لیے کہ اس جمہوری ملک میں حکومت مساویانہ سلوک کر نے کی عادی ہو چکی ہے۔

اس طرح ہمارے محلے میں صبح اسی وقت ہوتی ہے جب سر کاری نل آتا ہے۔ نل آتے ہی عورتیں ایسے شور مچاتی ہیں جیسے ٹرین آنے پر پلیٹ فارم پر پھیری والے چلاتے ہیں۔۔ ۔ خالی برتن آواز کرتے ہیں۔ اور ہم بستر سے اٹھ کر الگ ہو جاتے ہیں۔ یوں بھی ہمارے محلے کی زندگی ان ہی کے دم سے ہے۔ یہ نہ ہو تو زندگی خاموش ہو جائے۔ صبح سویرے محلے کی سبھی عورتیں اوریجنل حالت میں نل پر پائی جاتی ہیں۔ شام میں جب یہ عورتیں شاپنگ کے لیے اپنے گھروں سے نکلتی ہیں تب آپ اپنے چشمے کا گلاس بار بار صاف کرنے کے باوجود انھیں نہیں پہچان پاتے کہ وہی عورتیں ہیں جو صبح نل پر پانی بھرنے آتی ہیں۔ اردو کے مشہور شاعر علامہ اقبالؔ نے بھی شاید کسی شاپنگ سینٹر یا میلے کی سیر کرتے ہوئے ہی یہ مصرع کہا ہو گا، وجود زن

سے ہے تصویر کائنات میں رنگ، ورنہ اگر ان کے زمانے میں سر کاری نل ہوتا تو اس مصرع میں ترمیم کر کے وہ یوں لکھتے۔ وجود زن سے ہے تصویرِ کائنات میں جنگ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ یہ مصرع انھوں نے شادی سے قبل کہا ہو۔ طاق سے جفت ہو جانے کے بعد یعنی حقیقت جاننے کے باوجود علامہ اس میں ترمیم کرنے کی جرات نہ کر سکے۔

بہر حال سر کاری نل پر روزانہ صبح شام عورتوں کی تو تو میں میں کا بازار گرم رہتا ہے۔ نل پر عورتوں کا لڑائی جھگڑا اور اس کے بعد پنچ نامہ ہونا آئے دن کا معمول ہے۔ جس دن پنچ نامہ ہوا اس کے دوسرے دن ٹینشن رہتا ہے۔ لفظی جھڑپیں ہوتی ہیں جو ہماری قوم کا طرۂ امتیاز ہے۔ لیکن تیسرے دن پھر نل پر جنگ کا ماحول چھایا رہتا ہے۔

جس طرح موت اور گاہک کا کوئی بھروسہ نہیں کہ وہ کب آ دھمکے، اسی طرح سرکاری نل کا بھی کوئی بھروسہ نہیں۔ ایک مرتبہ ہمارے محلے کا سرکاری نل مسلسل آٹھ دن تک بہتا رہا۔ آٹھ دن بعد معلوم ہوا کہ نل کا ذمہ دار شخص نل کا والو کھول کر شادی میں چلا گیا تھا۔ وہاں سے واپس لوٹا تو اسے یہ دیکھ کر بے حد خوشی ہوئی کہ محلے کی ساری گندگی گٹر لائن سے ہوتی ہوئی ناگ ندی کی نذر ہو گئی ہے اور ناگ ندی کے پانی کا فورس بڑھ گیا ہے۔ سر کار نے ہر محلے میں نل لگاتے وقت اس کے منھ کو باقاعدہ بند کرنے کے لیے ٹونٹی لگا رکھی تھی۔ تاکہ ضرورت کے مطابق پانی لے کر اسے بند کیا جا سکے۔ لیکن ٹونٹی لگانے کے ڈیڑھ گھنٹے بعد ہی محلے کے بے روزگار نوجوانوں نے اسے نکال کر اپنی ضرورت پوری کر لی۔ اس کے بعد سر کار نے نلوں کے منھ بند کرنے کا سلسلہ بند کر دیا۔ اسے اس کی پر وا نہیں ہے۔ اس کے سامنے ہر کسی کا منھ کھلا ہے آخر وہ بھی کس کس کا منھ بند کرے؟ اور پھر جہاں صبح شام عورتوں کا ڈیرہ رہتا ہے وہاں نل جیسی شے کا منھ کھلا رہنا نامناسب ہی نہیں بلکہ واجبی ہے۔

نل پر عورتوں کے علاوہ وہ مرد بھی پانی بھرنے آتے ہیں جن کی عورتیں ان پر حکمرانی کرتی ہیں۔ پڑھے لکھے ہیں تو خاموشی سے پڑوسی کا گیٹ کھول کر اخبار اٹھا لاتے ہیں اور پڑھنے میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ ان پڑھ ہیں تو بیڑیاں پھونک کر ٹائم پاس کرتے ہیں۔ جن گھروں میں شوہر، بیوی دونوں ایک دوسرے پر حکومت کرتے ہیں اور ایک دوسرے کے پریشر میں آئے بغیر آرڈر فالو نہیں کرتے صبح نل پر ان کے بچے پانی بھرنے کے لیے نل پر لائین لگاتے ہیں۔۔ یہاں ان لوگوں پر ترس کھایا جاتا ہے جو بیوی کے معاملے میں خود کفیل نہیں ہیں اور پانی بھرنے لے لیے بلا ناغہ لائین میں شریفانہ انداز سے کھڑے نظر آتے ہیں۔ دوسرے ان عورتوں کو بھی فوقیت حاصل ہے جن کے بال قدرتی طور پر چھوٹے ہیں یا انھوں نے بیوٹی پارلر جا کر اپنے بال چھوٹے کروانے میں عافیت سمجھی ہے۔ جہاں عورتیں اپنے بال کٹوا کر نڈر ہونے کا ثبوت پیش کر رہی ہیں وہیں اس کا سائیڈ ایفیکٹ یہ ہو رہا ہے کہ مرد اپنے بال بڑھانے میں ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں۔

سر کاری نل اگر لیکیج ہو جائے تو عورتیں وہاں بھی برتنوں کی لائین لگا کر پانی بھرنا شروع کر دیتی ہیں۔ لہٰذا اہلِ محلہ کی فلاح و بہبود کی خاطر پانی کی اس روانی کو بند نہیں کیا جاتا۔ کئی محلے ایسے بھی ہیں جہاں سڑک کے کنارے سرکاری نل لگائے گئے ہیں لیکن آج وہ اس طرح غائب ہو چکے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔ در اصل وہاں کے لوگوں نے اس نل کو مرکز مان کر اسے کمپاؤنڈ سے گھیر لیا ہے۔ گزشتہ پیڑھی نے یہ حماقت کی تھی، نئی نسل اسے اپنی جاگیر سمجھتی ہے اور جن لوگوں میں یہ جرات نہیں ہے کہ وہ نل کو اپنے کمپاؤنڈ کے اندر کر لیں وہ خود اپنے ساز و سامان کے ساتھ باہر آ جاتے ہیں۔ پھر وہ نل پر کپڑے دھونے کے علاوہ غسل بھی فرماتے ہیں۔

محلے میں کچھ بڑے لوگ بھی ہیں جن کے یہاں ذاتی نل ہیں۔ اگر نہیں ہیں تو نوکرانی ہے جس کی ساری زندگی ان کے گھر پانی بھرتے بیت جاتی ہے۔ اگر یہ سب کچھ نہ ہو تو انھیں کوئی فرق نہیں پڑتا۔ آخر بڑے لوگ ہیں ان کے گھر تو قانون بھی پانی بھرتا ہے۔

محلے کا سرکاری نل جائے واردات ہی نہیں بلکہ براڈکاسٹنگ سینٹر بھی ہے جو پورے محلے کو کور کرتا ہے اور صبح کا اخبار آنے سے پہلے کی خبریں یہیں سے نشر کی جاتی ہیں۔ یہاں عورتوں کے خفیہ پروگرام بھی ترتیب پاتے ہیں جن کا شوہروں کی عدم موجود گی میں اہتمام ہوتا ہے۔ یہی عورتوں کا وہ پلیٹ فارم ہے جہاں ایک دوسرے کی ناکیں ذبح کی جاتی ہیں، جہاں ایک دوسرے کو بد چلنی کے پرمان پتر سے سمّانِت کیا جاتا ہے۔

کہتے ہیں نل پر کیا ہوا عشق دیر پا اور مستحکم ہوتا ہے۔ ایسے کئی بوڑھے جن کی جوانی میں نل پر نل پر آنکھ لڑی تھی، آج بھی نل پر پانی بھرتے دیکھے جا سکتے ہیں۔

محلے کے سرکا ری نل پر جہاں یہ سب کچھ ہوتا ہے وہیں نئے رشتے بھی طے پاتے ہیں۔ نئی نئی گالیاں ایجاد کی جاتی ہیں۔ دوستی کا دشمنی میں اور دشمنی کا دوستی میں تبدیل ہونا یہاں روزانہ کا معمول ہے۔ محلے کا نل اگر صبح شام عورتوں کی عدالت ہے تو دوپہر میں اسی نل پر محلے کے من چلے نوجوان تاش اور شطرنج کھیل کر اپنی ذہانت کو چمکاتے ہیں اور اپنے والدین کی دولت کو داؤ پر لگاتے ہیں۔ دیر رات تک محلے کے بزرگ حضرات کی پارلیمنٹ اپنا ڈیرہ جمائے رہتی ہے اور جب یہ تمام رخصت ہو جاتے ہیں تو کتے اس جگہ پر قبضہ جما لیتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ نل ہماری تہذیب ہے نہ جانے کتنی پیڑھیاں آئیں اور اس نل پر پانی بھر کر اللہ کو پیاری ہو گئیں مگر نل اپنی جگہ جوں کا توں ہے۔

ڈاکٹر اظہر حیات

ڈاکٹر اظہر حیات ناگپور میں پیدا ہوئے۔ انھوں نے اردو اور عربی میں ایم اے کیا اور ناگپور یونی ورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کی۔ ناگپور میں ایک ڈگری کالج میں لکچرر کے عہدے پر فائز تھے، سبک دوش ہونے کے بعد انجمن گرلز ڈگری کالج کے پرنسپل مقرر ہوئے۔
ڈاکٹر اظہر حیات کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں جن میں حافظ ولایت اللہ حافظ، حیات و خدمات، احمد شوقی ایک مطالعہ، لبیک (حج رپورتاژ)، آتش فشاں (ترجمہ) وغیرہ، انھوں نے اخبارات اور رسائل میں طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور کالم بھی تحریر کئے۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ ’’بس کچھ نہ پوچھئے‘‘ ، زیرِ ترتیب ہے۔

بس کچھ نہ پوچھئے

محمد اظہر حیات

خدا رکھے ہمارے ایک بزرگ ہیں وضع دار۔ ۔ روایت کے پاس دارا ور تنخواہ دار کہ ایک لگی بندھی تنخواہ پر عمر کاٹ دی۔ نوکری کی، بڑی شان سے کی، پابندی سے قرض لیتے تھے اور پابندی سے چکاتے تھے۔ اللہ کے فضل سے ابھی موصوف بقیدِ حیات ہیں اور ان ہی کا ایک قول دہرانے کی ہم سعادت حاصل کر رہے ہیں۔ وہ کہا کرتے ہیں کہ میاں مہینے کے تین حصے ہیں۔۔ ۔ مہینے کے پہلے دس دن یعنی پہلا عشرہ تر بتر، دوسرا عشرہ کاٹ کسر اور تیسرا عشرہ در بدر۔ ۔ ان کی اس تقسیم زبانی کو ہم اس وقت سمجھے جب خود نوکر ہوئے اور تینوں عشروں سے بنفسِ نفیس گزرنے کا اتفاق ہوا۔ رمضان کی تقسیم اکثر مولوی صاحبان سے سنی تھی کہ اول عشرہ رحمت دوسرا مغفرت اور تیسرا آگ سے نجات کا عشرہ ہے۔ مگر تنخواہ دار کے لیے ہر مہینہ چاہے وہ رمضان ہی کیوں نہ ہو زحمت ہی زحمت ہے۔ گویا پہلا عشرہ رحمت کے بجائے زحمت اور دوسرا مغفرت کے بجائے توبہ بھی قبول نہ ہوتی اور تیسرا عشرہ آگ سے نجات کی بجائے تنخواہ دار کے تن بدن میں، دل و دماغ میں آگ ہی آگ لگی ہوئی ہوتی ہے۔ تنخواہ حقیقتاً ’’تن کھا‘‘ ہوتی ہے جو تن کھاتی ہے۔ من کھاتی ہے اور صبح و شام کا چین کھاتی ہے۔
آخری عشرہ شروع ہوتے ہی ہماری جیب اور بیوی کا بٹوا اس طرح خالی ہو جاتا ہے جیسے عاشقِ نامراد کی آنکھوں سے آنسو غائب ہو جاتے ہیں۔ گھر میں رکھے اناج کے خالی ڈبے تو ہاتھ لگاتے، چڑ چڑا اٹھتے ہیں تو بس، بیتے ہوئے اچھے دنوں کی یادیں رہ جاتی ہیں۔ باقی ہر چیز دھواں دھواں، خواب خواب معلوم ہوتی ہے۔ ہاں اگر یاد رہتا ہے تو دال آٹے کا بھاؤ۔ صبر و شکر کی کیفیات کا غلبہ ہوتا ہے۔ ضبط و تحمل، انکساری و عاجزی والی صفات حسنہ خود بخود ان دنوں عود کر آ جاتی ہیں۔
مہینے کے آخر دن کچھ اس طرح کے ہوتے ہیں کہ بے اختیار خدا یاد آ جاتا ہے۔ بس کچھ نہ پوچھئے، عجیب بے خودی کا عالم طاری رہتا ہے۔ ان دنوں، ہر دم کسی سوچ میں غرق رہتے ہیں مگر دیکھنے والے سمجھتے ہیں کہ ہم یادِ الٰہی میں غرق ہیں۔ اس طرح لوگ ہمیں خدا ترس، خدا شناس اور خدا رسیدہ سمجھتے ہیں۔
لیکن کچھ لوگوں کے لیے۔۔ ۔ ۔ بلکہ اکثریت کے لیے پہلی تاریخ کے بعد سے ہی مہینے کے آخری دن شروع ہو جاتے ہیں۔ تنخواہ ملی۔ ساہوکار، بنیا۔ بزاز، دودھ، اخبار والا، مالکِ مکان کا بقایا ادا کیا اور خود باقی بچنے پر شکر خداوندی بجا لائے۔ مہینے کے آخری دنوں کا اپنا ایک چارم اور دلکشی ہوتی ہے۔ دیکھئے نا اگر مہینے کے آخری دن نہ ہوں تو مہینے کے ابتدائی دنوں کی قدر کون کرے گا۔ اسی مہینے کے آخری دنوں۔۔ ۔ کا مزہ ان لو گوں کے نصیب میں نہیں ہے جو بیوپاری ہیں یا جنھیں دستِ غیب کی مدد حاصل ہے۔ یا یوں کہئے کہ گنگا نہائے ہوئے ہیں۔ ایسے لوگ بھلا کیا جانیں ایام آخر کے مزے۔ یہاں تو مہینے کے آخری دنوں میں یہ حال ہوتا ہے کہ اخبار کی ردی بھی محبوبۂ دلنواز کی طرح حسین لگتی ہے۔ اس آڑے وقت میں کام آنے والی چیز کو کسی ردی ذہنیت والے نے ردی کہہ کر پکارا کہ یہ مونس جاں تنخواہ دار کے لیے در بدری کے دور کی رفیقِ دیرینہ ہے۔ در

اصل سرمایہ دار طبقے نے اس کی حیثیت کا مذاق اڑایا ہے۔
مہینے کے آخری دنوں میں آپ اسکوٹر گھر میں رکھ کر صحت بنانے کے لیے پیدل چل سکتے ہیں اس طرح سے آپ گلی کوچوں کی راہ سے گھر بھی پہنچ سکتے ہیں جس کا ایک فائدہ یہ بھی ہے کہ دکاندار کی نظر سے بچ جاتے ہیں۔ یہ سب اور بہت کچھ آپ کر سکتے ہیں لیکن مہمان سے بچنا ذرا مشکل ہی ہے۔ مگر بڑے تجربہ کاروں نے اس کے بھی راستے نکال لیے ہیں۔ ہاں ایسا کوئی شعر لکھ کر دروازے کی چوکھٹ پر لٹکا یا جائے تو مہمان شرطیہ واپس جائے گا۔
خالی ہے جیب آخری ہفتہ ہے ان دنوں
مہمان آج گھر میں نہ آئے خدا کرے
اور بعض تجربہ کاروں نے اس سے آسان ترکیب بتائی ہے کہ آپ خود کسی کے گھر مہمان بن کر چلے جائیں اور گھر پر ذرا بڑا سا تالا ڈال جائیں۔ لیکن اس بات کا خیال رہے کہ جو بڑھ کر خود اٹھا لے ہاتھ میں مینا اسی کا ہے۔ آپ نے دیر کی اور کوئی مہمان آپ کے گھر آ دھمکا۔
مہینے کے آخری دنوں کا ذکر ہے کسی صاحب کا ایک کتا گم ہو گیا انھوں نے ایک اخبار میں اشتہار دیا کہ کتے کو دھونڈ کر لانے والے کو پانچ سو روپئے کا نقد انعام دیا جائے گا۔ اشتہار کی اشاعت کے بعد موصوف شام کو اخبار کے دفتر گئے تاکہ معلوم کریں کہ کتے کا پتہ چلا یا نہیں۔ دفتر پہنچے تو دیکھا کہ دفتر میں سناٹا بول رہا ہے، ہڑتال کا سا ماحول ہے۔ اونگھتے ہوئے چوکیدار سے دریافت کیا کہ ماجرا کیا ہے تو اس نے جواب دیا کہ آج جو کتے کے لیے اشتہار چھپا ہے اسی کتے کی تلاش میں سب نکل پڑے ہیں۔

رونق جمال

رونق جمال رونق جمال۲۵ , مئی ۱۹۴۵ کو کھولا پور ضلع امراؤتی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم امراؤتی میں حاصل کی اور بعد میں وہ درگ (چھتیس گڑھ) میں سکونت پذیر ہو گئے۔
۱۹۸۰ کے آس پاس قلم سنبھالا۔ منی افسانہ نگار اور ادیب الاطفال کے طور پر مشہور ہیں۔ افسانچہ نگاری سے انہیں خصوصی تعلق ہے اس کی ترویج و اشاعت کے سلسلے میں وہ سرگرمِ کار رہے ہیں۔ ان کے افسانچوں کے مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں جن میں قتل کا موسم خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ انھوں نے بچوں کے لیے بھی کئی کہانیاں لکھی ہیں۔ انھوں نے چند مزاحیہ مضمون بھی تحریر کئے ہیں۔

آپ کے منہ میں

نواب رونق جمال

انسان اور جانور کے جسم میں سب سے اہم حصہ ہے منھ! منھ جس کا تعلق سب سے پہلے پیٹ کی دوزخ سے ہے۔ انسان اور جانور صدیوں سے پیٹ کی آگ بجھانے میں مصروف ہیں۔ لیکن پیٹ کی آگ کو بجھانے کی جتنی کوشش کی جاتی ہے یہ اتنی ہی بھڑکتی جاتی ہے۔ جانور تو بہر حال جانور ہے لیکن انسان سب کچھ جانتے ہوئے، سمجھتے ہوئے، پیٹ کی آگ کو نہ جانے کیوں دہکائے ہوئے ہے اور وہ ہر روز صبح سے شام تک اس بھٹی میں طرح طرح کا ایندھن ڈالتا رہتا ہے۔ شاید اسی ڈر سے کہ پیٹ کی آگ ٹھنڈی ہو گئی تو اس کی زندگی کی شمع بھی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بجھ جائے گی۔ خیر یہ پیٹ کی بات ہے جس پر کسی اور وقت بات کریں گے فی الحال تو ہم منھ کی بات کر رہے ہیں۔ نہیں، منھ کی بھی نہیں، بلکہ منھ سے متعلق کہاوتوں کی بات کر رہے ہیں۔ چونکہ منھ ایک ایسی چیز ہے جس کی کئی شاخیں ہیں اور ہر ایک شاخ کی بھی کئی کئی شاخیں ہیں۔ ان تمام شاخوں پر اس وقت بات کرنا ممکن نہ سہی لیکن مشکل کام ضرور ہے۔ اس لیے میں منھ سے متعلق کہاوتوں کو نشانہ بنا رہا ہوں کیونکہ منھ سے متعلق کہاوتیں دلچسپ اور معنی خیز ہیں۔ نہایت گہرا مطلب رکھتی ہیں۔ ایک کہاوت ایک موٹی کتاب جتنا مطلب بیان کر دیتی ہے۔ اس لیے یہ کہاوتیں صدیوں سے استعمال ہو رہی ہیں اور انسان اپنی بھڑاس ان کہاوتوں کی آڑ میں نکالتا چلا آ رہا ہے اور

قیامت تک نکالتا رہے گا۔
اب اسی کہاوت کو لیجئے! اپنے ”منھ مٹھو بننا“ جب کسی کو خود اپنی تعریف کرنے کی بیماری لگ جاتی ہے اور وہ شخص ہر جگہ ہر محفل میں خود اپنی مدح سرائی کرنے لگتا ہے، لوگ کہتے ہیں یہ جناب اپنے منھ میاں مٹھو بن رہے ہیں۔ جب کوئی شخص چاپلوسی کرنے لگے اور اس طرح کی باتیں کرنے لگے کہ دل میں کچھ اور زبان پر کچھ ہو تو ایسے شخص کے لیے کہا جاتا ہے کہ ”بغل میں چھری اور منھ میں رام“ جب کوئی بوڑھا شخص اپنی عمر سے کم والی حرکتیں کرنے لگتا ہے تو اسے اس کی عمر کا احساس دلانے یا اوقات یاد دلانے کے لیے کہا جاتا ہے۔ منھ میں دانت نہیں اور پیٹ میں آنت نہیں۔ جب کوئی شخص بنا سوچے سمجھے باتیں کرنے لگتا ہے تو ایسے آدمی کے لیے کہاوت ہے، ارے اس کے منھ میں جو آتا ہے بک دیتا ہے۔ جب کسی شخص کو اس کی اوقات یاد دلا کر جواب دیا جاتا ہے اور وہ لا جواب ہو جاتا ہے تو ایسے وقت کہا جاتا ہے ”منھ کی منھ میں رکھ دینا“۔ یعنی اس سے جواب نہیں بن پڑا۔ جب کوئی خبر یا بات دور تک چلی جائے تو کہتے ہیں منھ در منھ۔ جب کوئی ایک دوسرے سے اتنے خفا ہو جائیں کہ ایک دوسرے کی شکل دیکھنا پسند نہ کریں تو کہتے ہیں میں تو اس کے منھ پر اپنا منھ نہ پڑنے دوں گا۔ جب کسی کی چوری پکڑی جائے اور وہ گھبرا جائے تو کہتے ہیں منھ پر ہوائیاں اڑنا۔ جب کسی کو کوئی حیرت انگیز بات سنائی جائے اور اور وہ حیرت کے دریا میں غرق ہو جائے تو کہتے ہیں، منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ جب کسی سے کوئی خفا ہوتا ہے تو چڑ کر کہتے ہیں، اب کبھی منھ مت دکھانا۔ جب کسی کو اس کی سینہ زوری کا بھر پور جواب ملتا ہے اور وہ شرمندہ ہو جاتا ہے تو کہتے ہیں منھ کی کھانا۔ جب کوئی شخص فضول بحث کرتا ہے اور بات ہا تھاپائی تک پہنچ جائے اور وہ بے وقوف آدمی پھر بھی عزت کو خاک میں ملانے پر آمادہ ہو تو کہتے ہیں۔ منھ کریں باتیں اور جسم کھائیں لاتیں۔ جب کوئی چھوٹا بڑوں سے زبان لڑانے لگے تو کہتے ہیں، منھ کرنا۔ جب کوئی غلط کام کرتا ہے، خاص کر صنفِ نازک تو کہتے ہیں منھ کالا کر نا۔ کوئی شخص امید سے کم چندہ دے یا مالی تعاون کرنے میں کنجوسی کرے تو کہتے ہیں، جناب آپ کا یہ تعاون اونٹ کے منھ میں زیرہ ہے۔ جب کسی شخص کا جھوٹ پکڑا جائے اور وہ شرمندہ ہو کر صفائی نہ دے سکے اور گناہ بھی قبول نہ کرے تو کہتے ہیں سانپ کے منھ میں چھچھوندر، نہ اگلے بنے نہ نگلے بنے۔
آپ لغت اٹھا کر دیکھیں گے تو سیکڑوں محاورے اور کہاوتیں منھ کے بارے میں مل جائیں گی۔ جیسے منھ آنا، منھ اتر جانا، منھ اٹھا کر چلنا، منھ اجلا ہونا، منھ اندھیرے، منھ باندھے ہوئے بیٹھنا، منھ برا بنانا، منھ بگاڑنا، منھ بند کر دینا، منھ بولا، منھ بھرنا، منھ بھرائی، منھ بھر کے کوسنا، منھ بھرکے گالیاں دینا، منھ پر پاؤں رگڑ نا، منھ پر پھٹکار برسنا، منھ پر پھینک مارنا، منھ پر خاک اڑنا، منھ پر رونق آ جانا، منھ پر کچھ، پیٹھ پیچھے کچھ، منھ پر کھری کھری کہنا، منھ پر تھوکنا، منھ پھیر لینا اور تمہارے منھ میں گھی شکر!
منھ میں گھی شکر کی کہاوت سامنے آئی تو ایک صاحب کا چہرہ ذہن میں گھوم گیا۔ اور ان کا اندازِ گفتگو اور تکیہ کلام بے اختیار یاد آیا۔ آپ کے منھ میں۔ وہ چند دوستوں کے ساتھ بیٹھے اپنی جوانی اور شکار کے قصے مزے لے لے کر سنا رہے تھے۔ ایک شکار کا قصہ اپنے تکیہ کلام ”آپ کے منھ میں“ کو جوڑ کر کچھ اس طرح سنانے لگے۔
صاحب ایک مرتبہ ہم شکار کے لیے گئے آپ کے منھ میں، اتنا بڑا اور خطرناک جنگل آپ کے منھ میں، چاروں طرف سناٹا ہی سناٹا اور گہرا اندھیرا آپ کے منھ میں، ہم نے ہم ہمت دکھائی اور چڑھ گئے ایک بڑے سے پیڑ پر آپ کے منھ میں، بندوق میں گولیاں ڈالیں اور تان لی بندوق آپ کے منھ میں، اور انتظار کرنے لگے شیر کا آپ کے منھ میں، شیر کو نہ آنا تھا نہ آیا آپ کے منھ میں، لیکن ہم بھی ضد کے پکے صبح تک بندوق تانے بیٹھے رہے آپ کے منھ میں، صبح جوں ہی پو پھٹی آپ کے منھ میں، ایک بڑا سا شیر آ گیا آپ کے منھ میں، گھبر اکر ہمارے ہاتھ سے بندوق گر پڑی آپ کے منھ میں، بندوق کے نیچے گرتے ہی شیر زور سے دھاڑا آپ کے منھ میں، شیر کی دہاڑ سن کر ہمارا پیشاب خطا ہو گیا آپ کے منھ میں!

شاہد رشید

شاہد رشید، ۲۱ جنوری ۱۹۵۲ کو پیدا ہوئے۔ تعلیمی اعتبار سے وہ بی ایس سی بی ایڈ کے علاوہ اردو میں ایم اے بھی ہیں۔ اردو ہائی اسکول وروڈ (ضلع امراؤتی) میں سائنس ٹیچر کے طور پر خدمات انجام دیں اور وہیں پرنسپل مقرر ہوئے۔ اس عہدے سے سبک دوش ہونے کے بعد وہ ایک اسکول کے نگراں کی حیثیت سے بر سرِ کار ہیں۔
شاہد رشید نے سائنسی موضوعات کو شگفتگی کے ساتھ بے تکلفانہ انداز میں اپنے مضامین میں پیش کیا۔ ان کی کتاب ”مکاشفات“ ان تحریروں کا مجموعہ ہے۔ انھوں نے خالص طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی لکھے جو ماہنامہ شگوفہ میں شائع ہوئے۔ رابطہ:

9960309055

خیر خواہانِ قوم

شاہد رشید

ایک علم شناس بزرگ نے مجھ سے کہا۔ میاں ہمارے زمانے میں درس گاہوں سے بچّے انسان بن کر نکلتے تھے۔ آج باپ انسان کا بچّہ لا کر چھوڑتا ہے۔ لیکن دانش گاہوں سے بندر باہر نکلتے ہیں۔ پتہ نہیں مذکورہ بزرگ کی بات میں کتنی سچائی ہے لیکن یہ بات ببانگِ دہل کہی جا سکتی ہے کہ اسکولوں اور کالجوں میں بچہ بجز علم کے عملی زندگی کا ہر ہنر سیکھتا ہے۔ مثلاً چاپلوسی، خود غرضی، رشوت خوری نا انصافی۔ غرض یہ کہ ہر وہ کام جو بچہ اپنے استادوں کو کرتے ہوئے دیکھتا ہے خود اختیار کرتا ہے۔ کہتے ہیں کہ بچہ آدمی کا باپ ہوتا ہے اس لیے ہر وہ چیز جس کا مشاہدہ کرتا ہے۔ ضرور بالضرور اپنے تجربے میں لاتا ہے۔ ہمارے ایک دوست کا بچہ کاغذ کا سگریٹ بنا کر پی رہا تھا۔ اس کی ماں نے اس سے کہا۔ بیٹا بری بات ہے۔ سگریٹ نہیں پیتے۔ اس نے کہا لیکن ابّو تو پیتے ہیں۔ ماں نے سمجھایا بیٹا وہ بڑے ہیں۔ بچے نے کاغذ پھینکتے ہوئے کہا۔ اچھا تو میں بھی بڑا ہو جاؤں گا تو سگریٹ پیوں گا۔

عام طور پر درس گاہوں میں اساتذہ کے دو گروپ ہوتے ہیں ایک وہ جو پڑھاتے ہیں دوسرا گروپ وہ جو روایتی درس و تدریس کا سرے سے قائل ہی نہیں ہوتا۔ اول الذکر محنت فروخت کرتے ہیں یعنی پیدائشی مزدور ہوتے ہیں۔ ثانی الذکر ملازمت خریدتے ہیں۔ خریدار کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی شئے کا اپنی مرضی کے مطابق استعمال کرے۔ کسی مائی کے لال میں ہمت نہیں کہ ان سے کام لے لے۔ اسٹاف روم میں بیٹھے ہوئے ایسے ہی ایک استاد کو شامت کے مارے ایک نگراں کار نے کہا۔ جناب کلاس میں جائیے۔ اسے منہ توڑ جواب ملا، ’نقد ساٹھ ہزار روپے کس لیے دیے ہیں؟ کلاس میں جانے کے؟ ‘بیچارہ اپنا سا منہ لے کر رہ گیا۔ شکایت کرتا بھی تو کس سے؟ بھڑ کے چھتّے کو چھیڑنے کی ہمت بھلا کون کرے گا۔ اگر آپ کو پرنسپل کی جی حضوری کرنا نہیں آیا تو شیخ سعدی کے ناخدا کے الفاظ میں تمھاری تو ساری زندگی بے کار ہے۔ سخت نادان ہیں وہ لوگ جو دنیا داری کو نہیں سمجھتے کولہو کے بیل کی طرح جتے رہنے والے استاد کیا جانیں۔ صاحب اقتدار کو خوش رکھنے کا ہنر ایسے استادوں سے طلباء و سرپرست دونوں نالاں رہتے ہیں۔ اس شارٹ کٹ کے زمانے میں موٹی موٹی کتابیں پڑھنے اور پڑھانے والے بے وقوف نہیں تو اور کیا ہے؟ ہمارے ایک استاد اکیس نمبری کہلاتے ہیں۔ آپ نے چھے نمبری، چوبیس نمبری اور بتیس نمبری تو سنا ہو گا۔ لیکن شاید اکیس نمبری سے نا آشنا ہوں۔ یہ صاحب اکیس سوالات کے جوابات(Twenty One Question set)طلباء کو رٹا کر پاس کروانے کا ٹھیکہ لیتے ہیں۔ آج تو نتیجہ دیکھا جاتا ہے۔ پرنسپل خوش کہ اس کی سرکاری خیرات پر آنچ نہیں آئی۔ سرپرست مطمئن کہ بچّہ پاس ہو گیا۔ اب زبان سکھا کر شیکسپیر یا غالبؔ تو بچّوں کو بنانا نہیں ہے رزلٹ دیکھنا چاہیے انتظامیہ کو گرانٹ لینا ہے۔ حکومت کو دینا ہے۔ بچوں کو پاس ہونا ہے اور سرپرستوں کو انھیں پاس کروانا ہے۔ ایسے ہی قوم کے ہم درد اساتذہ کو راشٹر پتی ایوارڈ دیا جانا چاہئے۔ یہ صاحبان قوم پر احسان کرنے کے لیے ہی پیدا ہوئے ہیں۔ جب تک قوم کے یہ سیاہ سپوت قوم میں زندہ رہیں گے اپنی روشنائی سے قوم کو سرفراز کرتے رہیں گے۔ جاگیے صاحبان جاگیے۔ اب بھی اگر آپ نے ان کے احسانات کا بدلہ نہیں چکایا تو

داستاں تک نہیں رہے گی داستانوں میں

ہم نے ایک جگہ بورڈ لگا دیکھا۔ جلدی کیجیے گیا وقت ہاتھ آتا نہیں۔ تھوک کا دام چلّر کا کام ہم نے اپنے دوست سے پوچھا۔ یہ شیخ کالو صاحب کے پڑوس میں کیا فروخت ہوتا ہے۔ پہلے تو ٹال گئے لیکن ہمارے مزید استفسار پر ہنس کر کہنے لگے۔ اجی صاحب کوئی بیوپاری ان کے پڑوس میں نہیں ہے بلکہ یہ بورڈ انھیں کے گھر پر لگا ہے۔ اب بچے اور ان کے سرپرست کہاں۔ ہر ممتحن کے گھر نمبرات بڑھانے کے لیے جائیں گے۔ اس لیے یہ صاحب معمولی مشاہرہ پر یہ کام انجام دے لیتے ہیں۔ کام نہ ہونے کی صورت میں مشاہرہ واپس کرنے کی کیا گیارنٹی ہوتی ہے۔

ہمارے ایک وظیفہ یاب دوست ہم سے ملنے آئے۔ زندگی میں انھوں نے کبھی بے نفع کام نہیں کیا، اگر کبھی انھوں نے ایک کپ چائے بھی پلا دی تو ہم سوچتے ہیں کہ اب یہ اپنا کوئی کام ہم سے نکلوانا چاہتے ہیں۔ انھوں نے اپنی ملازمت کے دوران طلباء و طالبات کو ربڑ سے لے کر درسی کتب تک اور یہاں تک کہ نمبرات بھی فروخت کیے ہیں۔ خیر صاحب ہمارے یہ دوست ہم سے صلاح مانگنے آئے تھے کہنے لگے۔ ہم ایک سیاسی پارٹی کی کیا مدد کر سکتے ہیں۔ ہمارے مزید دریافت کرنے پر کہنے لگے ہماری پارٹی اگر بر سرِ اقتدار آ گئی تو ہم حسبِ ذیل سفارشات منظور کریں گے۔

(اسکول اور کالجوں کے امتحان میں شرکت کے لیے لا زمی حاضری کا کالا قانون ختم کیا جائے گا۔)
(درس گاہوں میں وقت پر آنے کی پابندی ختم کی جائے گی۔)
(ٹیکسٹ بُک بیورو)ختم کیا جائے گا اور سرکاری سطح پر اکیس سوالات میں پاس ہونے کی کنجی شائع کی جائے گی۔
(امتحان میں ہر طالبِ علم کو Logarithmکی طرح جوابات بھی مہیا کیے جائیں گے۔)
(ممتحن کو نمبرات بڑھانے کی فیس ادا کرنے کے لیے ہر طالبِ علم کو بلا سودی قرض دیا جائے گا۔)
(اساتذہ کو کام کروانے کے لیے (Leave Travelling Concession) دیا جائے گا۔)
(اسی طریقے سے پاس ہونے والے نوجوانوں کو ملازمت کی گیارنٹی دی جائے گی۔)
(ملازمت کے خواہش مند نوجوانوں کو ملازمت حاصل کرنے کے لیے آسان قسطوں پر یک مشت رقم فراہم کی جائے گی)
ہم نے کہا۔ آپ کی پارٹی کا دستور بہت اچھا ہے لیکن اگر آپ ہماری ایک سفارش مان لیں تو ہم یقین دلاتے ہیں کہ نہ صرف ہم آپ کی پارٹی کے ممبر بن جائیں گے بلکہ ممبر سازی کا کام بھی کریں گے ان کے اثبات پر ہم نے کہا: 'آج کل کھلے بازار کا زمانہ ہے۔ معاشیات کا اصول یہ ہے کہ ملک کی ترقی مکمل مسابقت میں پوشیدہ ہے۔ آپ بھی مکمل مسابقت کے حمایتی بن جائیے۔
'کہنے لگے، 'اس سے تمھاری کیا مراد ہے؟ 'ہم نے سمجھایا: 'دیکھیے آج کل ملازمتوں میں گلا کاٹ مسابقت(Cut throat Competition)ہو رہا ہے۔ کم سے کم آپ کو اس کی مخالفت کرنی چاہیے۔ ملازمتوں میں بھی مکمل مسابقت ہونی چاہیے اس لیے خالی آسامیوں کو نیلام کیاکیجئے تاکہ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق نیلام میں بولی بول سکے۔ ہماری پارٹی کھلے بازار کی حمایتی ہو گی۔ چپکے چپکے خطیر رقم لے کر ملازمت دینے کے ہم خلاف ہیں۔ نیلام میں بڑھ چڑھ کر بولی بولنے والے ہی کو ملازمت دی جائے۔ ہماری حکومت مساوات کی علم بردار ہو گی۔
'اس تجویز پر ہمارے دوست کی باچھیں کھل گئیں۔ واہ۔ واہ کیا نکتہ اخذ کیا ہے۔ چلو اب جلدی سے اس کا نام بھی تجویز کر دو ہم نے کہا اس کا نام خدائی خدمت گار رکھیے۔ آپ سے گزارش ہے کہ اگر ہماری پارٹی کے منثور سے اتفاق رکھتے ہیں تو اس کے ممبر بن جائیے۔

عمر حنیف

عمر حنیف ۱۹۵۳ کو سرس گاؤں ضلع امراؤتی میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۷۴ سے منی افسانے لکھنے شروع کئے۔ ان کی تحریریں ماہنامہ بیسویں صدی، روبی، گل فام، ہم زبان اور شگوفہ میں شائع ہوئیں۔
عمر حنیف ملازمت کے سلسلے میں کھام گاؤں میں مقیم تھے، وہیں ان کا انتقال ہوا۔ انھوں نے افسانے اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین اور کالم لکھے۔ امراؤتی سے نکلنے والے اخبار ''آتش فشاں'' میں ان کا کالم ''بال کی کھال'' شائع ہوا کرتا تھا۔ ان کے چند مزاحیہ مضامین ماہنامہ شگوفہ، حیدر آباد میں بھی شائع ہوئے۔ عمر حنیف کی تحریروں میں سیاست اور حالاتِ حاضرہ طنز کے نشانے پر ہیں۔

چاند

عمر حنیف

چاند کا نام لیتے ہی ہمارے ذہن میں چاند کے ساتھ ساتھ ایک بہت ہی خوبصورت، تازگی سے سرشار کسی دو شیزہ کا چہرہ ابھر آتا ہے۔ پتہ نہیں کس زمانے میں کن صاحب نے کس حسین صورت کو چاند سے تشبیہ دینے کا سلسلہ شروع کیا تھا؟ شاید وہ صاحب آج دستیاب نہ ہوں ورنہ انھیں آج چاند کی حالت زار پر رونا آیا ہوتا۔ کمبخت سائنس اور سائنسدانوں نے ایک خوبصورت تصور جاناں کو مٹی کے تودوں اور گڑھوں میں بدل کر رکھ دیا ہے۔ چاند سی خوبصورتی سے جتنا شاعروں کی ذات نے استفادہ کیا، اتنا شاید ہی کسی نے کیا ہو۔ شاعروں نے چاند پر خوب جی کھول کر طبع آزمائی کی۔ ایک شاعر نے تو ایک چاند کے دو چاند کر ڈالے بقول شاعر 'ایک چاند آسماں پر ہے اور ایک میرے پاس' ایک شاعر دو قدم اور آگے بڑھ گئے اور کہا۔
'میرے یار کا حسن ایسا کہ چاند بھی شرما جائے '

غرض انھیں ہر صورت میں چاند نظر آیا۔ جن شعرا حضرات کے دیوان روبرو آئے ان میں کئی اشعار چاند سی صورت پر نظر آئے۔
آرمسٹرانگ کے چاند پر اترنے کے بعد ’چاند کی جو تصویریں سامنے آئیں‘ اس نے شاعروں کے حوصلوں کو بھی متاثر کر ڈالا۔ اس کے بعد شاعر تھوڑے پس و پیش میں نظر آئے۔ ایک الجھن سامنے آئی کہ آیا کسی خوبصورت چہرے کو چودھویں کے چاند کی مانند کہے یا نہ کہے؟ کچھ نے اپنی روایت کو قائم رکھا اور کچھ اس ڈگر سے ہٹتے نظر آئے۔ جو شاعر حضرات روایت پر قائم رہے وہ شاید اس حقیقت کے حق میں تھے کہ انھیں کسی کے اندرونی معاملے سے کوئی سروکار نہیں۔ چاند کی اندرونی ساخت چاہے کچھ بھی ہو، ہمیں صرف ان کی ظاہری خوبصورتی کو مد نظر رکھنا چاہیئے۔ اسی لیے ’محبوبہ‘ کو چاند سی محبوبہ کہنا جاری و ساری رکھا گیا۔ ہمیں کسی کے بھی اندرونی معاملات میں دخل اندازی نہیں کرنی چاہیے۔ وہ چاند ہی کیوں نہ ہو۔ شاعروں نے بھی اپنی دیانت داری کا بھرپور ثبوت دیا اور اپنے محبوب کو چاند کی مانند بتلا کر اپنے محبوب کا دل تو جیتا ہی ساتھ ہی واہ واہی بھی لوٹی۔۔
یوں تو چاند کا کسی سے کوئی تنازعہ نہیں۔ تنازعے پیدا کرنا ہم انسانوں کی فطرت میں شامل ہے۔ کمالِ فطرت دیکھئے کہ چاند کو ہم نے عرش سے فرش پر لا کر اپنے بحث و مباحثوں میں شامل کر لیا۔ ان بحث و مباحثوں کے لیے دنیا کے ہر شہر میں باقاعدہ کمیٹیاں بنائی گئیں۔ نام کرن کچھ اس طرح کیا گیا: ’رویت ہلال کمیٹی‘۔ قناعت پسندی ان ہلال کمیٹیوں سے سیکھی جائے۔ سال میں صرف ایک ہی میٹنگ کا انعقاد کیا جاتا ہے وہ بھی صرف رمضان المبارک کا! اس میٹنگ کو محض اس مجبوری میں کال کیا جاتا ہے کہ ’چاند واضح طور پر نظر نہیں آیا‘ چہ میگوئیاں شروع ہوتی ہے کہ کیا جائے؟ ایسی صورت میں صدر ہلال کمیٹی دعوت بحث و مباحثے کا اہتمام کرتے ہیں۔ وہ لوگ بھی اس بحث و مباحثے میں شریک ہوتے ہیں جو باقاعدہ ہلال کمیٹی کے ممبران نہیں ہوتے۔ باہر کے لوگوں کی شمولیت کو اجازت فراہم کرنا ممبران کمیٹی کی فراخدلی، زندہ دلی و شفافیت کا مظہر ہوتا ہے۔
زمانہ قدیم میں ان ہلال کمیٹیوں کا کہیں کوئی ذکر نہیں ملتا۔ شاید اس لیے کہ اس وقت ان کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی تھی۔ اس لیے بھی کہ اس دور کے لوگ ایک دوسرے سے لڑنے پر اتارو نہیں ہوا کرتے تھے۔ کسی بھی مسئلے کا حل آپسی صلاح و مشورے کے بعد پرامن طور پر نکل آتا تھا۔ ہلال کمیٹیوں کا وجود عمل میں اس لیے آیا کہ انتیس شعبان کو رمضان المبارک کا چاند نظر نہ آنے یا پھر اطراف یا دوسرے شہروں میں نظر آنے کی صورت میں لائحہ عمل کیا ہو؟ اگلے دن کا روزہ ہو گا یا نہیں؟ بس اس بات کو لے کر ہر ایک کو اپنی دلیل پیش کرنے کا موقع فراہم کیا جاتا ہے۔ چونکہ ان میٹنگوں کا اہتمام مسجدوں میں کیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے لوگ باگ اپنے ہاتھ دوسرے کے گریباں تک پہچانے میں صبر سے کام لیتے ہیں۔ (کہیں کہیں صبر ٹوٹتا بھی ہے)۔
تاریخ ہماری بہادری کی داستانوں سے بھری پڑی ہے کتنی جنگیں ہم نے لڑیں اور کئی فتوحات ہم نے حاصل کیں۔ لیکن آج کل ہم نے آؤٹ ڈور جنگیں بند کر دی ہیں۔ ن دنوں ہمارا دھیان اِن ڈور جنگوں پر زیادہ مرکوز ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب قوم کا کوئی تنازعہ سامنے آتا ہے، ہم اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہیں۔ غرض اس ’چاند‘ کی میٹنگ میں کئی پہلوؤں پر غور کیا جاتا ہے اور شہادتوں کے بعد فیصلہ صادر ہوتا ہے۔ لیکن اگر چاند واضح طور پر نظر نہ آیا ہو تو فیصلہ کوئی بھی متنازعہ قرار دیا جاتا ہے اور پھر ہر کوئی اپنے آپ کو ہلال کمیٹی کا خود ساختہ رکن و صدر مان کر اپنے اپنے فیصلے پر عمل کرتا ہے۔
کمیٹیوں اور انجمنوں کی تشکیل ہماری روایت رہی لیکن ان کے فیصلوں پر عمل نہ کرنا ہمارا شیوہ رہا ہے۔ در اصل چاند کو ہم نے اپنی ذاتی ملکیت سمجھ رکھا ہے جبکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ چاند پر دیگر اقوام کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا کہ ہمارا! دیگر اقوام کو شاید اس بات کا علم نہیں کے چاند کے مالکانہ حقوق میں ہمارے ساتھ وہ بھی برابر کے حصے دار ہیں۔ ابھی تو چاند پر ہم اپنی پوری ملکیت جتاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ مستقبل میں تمام اقوام کی چاند پر حصہ داری طے کرنے کے لیے ایک نیا تنازعہ کھڑا ہو جائے۔
ہمارے یہاں اپنے بچوں کا نام ’چاند‘ رکھنے کا بھی چلن رہا ہے۔ شاید اپنے بچے کا نام چاند رکھ کر ماں باپ کو بچے کے تعلق سے چاند سی ٹھنڈک اور خوبصورتی کا احساس ہوتا ہو بھلے ہی بچہ کالا کلوٹا ہی کیوں نہ ہو؟ ہم نے ایسے چاند بھی دیکھے ہیں جو نہ اندھیرے میں نظر آتے ہیں اور نہ جن کے سر پر پانی کی ایک بوند ٹھہر نے کو تیار ہوتی ہے۔
چاند کے ساتھ چاندنی کا ذکر کرنا بے محل نہ ہو گا۔ ’چاند‘ کا چاندنی سے کیا رشتہ ہے، اس کی وضاحت آج تک نہ تو چاند نے کبھی کی اور نہ کسی اور نے۔ اس کی اصل سچائی تو ’چاند‘ سے پوچھ کر ہی معلوم کی جا سکتی ہے یہ اور یہ پوچھنے کا خیالی کام کوئی شاعر ہی کر سکتا ہے۔ جیسے ایک شاعر چاند سے کچھ اس طرح مخاطب ہوئے۔
’میں نے پوچھا چاند سے .... میرے یار سا حسیں .... دیکھا ہے کہیں؟......... چاند نے کہا....... نہیں .... نہیں!!!۔۔
(ماہنامہ شگوفہ۔ سالنامہ ۲۰۱۹)

یحییٰ جمیل

ودربھ کے نئے ابھرنے والے مزاح نگاروں میں۔ یحییٰ جمیل نے بہت کم مدت میں اپنی فطری صلاحیتوں کو ظریفانہ تحریروں کے ذریعے منظر عام پر لا کر اپنی پہچان بنائی ہے وہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ ان کے تحقیقی مضامین کا مجموعہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ یحییٰ جمیل ۳۰, جنوری ۱۹۷۴ کو امراؤتی میں پیدا ہوئے۔ فارسی میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری لینے کے بعد امراؤتی کے ڈگری کالج میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔
یحییٰ جمیل کی بیشتر ظریفانہ تحریریں خاکوں پر مشتمل ہیں جن میں ان کے آس پاس موجود کوئی شخص طنز کے نشانے پر نظر آتا ہے۔

دولہا سر

یحییٰ جمیل

انگریز نے ’کوٹ‘ کی شکل میں دنیا کو وہ نادر و نایاب تحفہ عطا کیا جو بلا شرکتِ غیرے عزت و وقار کی نشانی بنا۔ ہمارے ملک میں کوٹ پہننے کے لیے مخصوص لباس کی شرط نہیں۔ پٹھان شلوار پر کوٹ پہنتا ہے، حیدرآبادی ڈھیلے پاجامے پر، مراٹھا دھوتی پر اور جنوبی ہند کے باشندے لنگی پر۔ ایک ملک کا بادشاہ چڈی پر کوٹ پہنتا ہے۔ وہ چڈی کو عزت بخشتا ہے یا کوٹ کو رسوا کرتا ہے، وہی جانے۔ بادشاہ ہے، کوئی پوچھ سکتا ہے؟ ہمارے کرم فرما، باقاعدہ ٹراوزر پر ہی کوٹ پہنتے ہیں، لیکن جس طریقے سے پہنتے ہیں، اس سے بخوبی واضح ہو جاتا ہے کہ خود کو عزت بخشتے ہیں یا کوٹ کو رسوا کرتے ہیں۔
موصوف، ایک دیہات میں ٹیچر ہیں اور طلبہ میں بطور ’دولہا سر‘ مشہور ہیں، کہ گاؤں کے بچے صرف دولہے کو کوٹ میں دیکھنے کے عادی ہیں۔ جب کلاس کے ایک ’ہری رام نائی‘ نے انھیں یہ اطلاع بہم پہنچائی تووہ خوشی سے پھولے نہ سمائے، اور ان کا قہقہہ جامے سے باہر ہو گیا، جو اکثر ہوتا ہے، کہ ’’بیوقوف، یہ خطاب ہے، اگلے زمانے میں مرزا نوشہ تھے اس زمانے میں ہم ہیں، دولہا سر۔‘‘ دروغ بر گردنِ راوی کہ اس کے بعد وہ بیت الخلاء بھی کوٹ پہن کر جانے لگے۔
ویسے دولہا سر کا نام، ’شیخی جان ‘ہے۔ موصوف کے اسم گرامی کے بارے میں کئی روایتیں ہیں۔ کچھ کے مطابق ان کے دادا کا نام، شیخ بھورو تھا، اس لیے یہ شیخی ہو گئے۔ شاید ان کی سیاہ رنگت نے انھیں ’ بھوروی‘ ہونے سے باز رکھا ہو۔ کچھ کا کہنا ہے کہ ان کا نام سلیم تھا، والد پیار سے شیخو کہتے تھے جو رفتہ رفتہ شیخی میں بدل گیا۔ کچھ بد خواہوں کے مطابق اس نام کے لیے، اُن کے شیخی بگھارنے کو خارج از امکان قرار نہیں دیا جا سکتا۔ لیکن ہم انھیں دولہا سر ہی کہتے ہیں کہ لفظ دولہا میں جو ’داد خواہی‘ پوشیدہ ہے، اسے ہر شادی شدہ بخوبی سمجھ سکتا ہے۔
دولہا سر ایک مرتبہ پکنک پر گئے ہوئے تھے، جہاں دو اساتذہ نے شرط لگائی کہ ان کا کوٹ اتروایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ ایک استاد نے طلبہ کو ورغلایا کہ دولہا سر سے ندی میں نہانے کی ضد کریں۔ بچوں کے اصرار پر دولہا سر بے تأمل کوٹ پہن کر پانی میں اتر گئے اور بچوں کے ساتھ کھیلنے لگے۔ وہاں انھوں نے ڈبکیاں بھی لگائیں اور قہقہے بھی اڑائے۔ بعد ازاں ایک چٹان پر بیٹھ کر کوٹ سُکھا لیا، لیکن اتارا نہیں۔ در اصل دولہا سر، بچپن سے کپڑے گیلے کرنے کے عادی ہیں۔
سیر سپاٹا بھی ان کی سرشت میں داخل ہے۔ تعلیم کے زمانے میں ایک صبح انھوں نے اپنے والد محترم کو اطلاع دی کہ، ’’آج، ہم چند دوستوں کے ساتھ پکنک پر جا رہے ہیں۔‘‘
والد صاحب نے پوچھا، ’’کون سے استاد کے ساتھ جا رہے ہو؟؟‘‘
بولے، ’’ہم سر کے بغیر جا رہے ہیں۔‘‘
والد صاحب نے کہا، ’’سر کے بغیر مت جاؤ۔‘‘
فرمایا، ’’ہم سر کے بغیر جائیں گے۔‘‘ اور والد کے لاکھ منع کرنے کے باوجود سر کے بغیر چلے گئے۔
یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ بین الاقوامی کانفرنس ہو، سیمینار ہو، تعلیمی ورکشاپ ہو یا آل انڈیا مشاعرہ؛ موصوف ہر جگہ سر کے بغیر پہنچ جاتے ہیں۔ اس لیے کسی کو دکھائی نہیں دیتے، حالانکہ وہ موجود ہوتے ہیں۔ اور اپنی موجودگی کا یقین دلانے کے

لیے بحالت مجبوری انھیں تقاریب کی تصاویر میں اپنا سر 'پیسٹ' کرنا پڑتا ہے۔
دولہا سر بچپن میں گھر کی دیوار پر لکھتے تھے، پھر دُکانوں کے بورڈ لکھنے لگے اور اب وھاٹس ایپ پر لکھتے ہیں۔ غضب کے لکھاری واقع ہوئے ہیں۔ پچھلے سال ان کی ایک کتاب، ''تنکا تنکا جوڑ کر' 'شائع ہوئی۔ اس میں انھوں نے حروف تہجی کے مطابق اپنی پسند کے تین سو اشعار جمع کیے ہیں۔ کتاب کی اشاعت کے بعد بہت دنوں تک کتاب کی رونمائی کے لیے پریشان رہے، لیکن کوئی بندوبست نہ ہو سکا۔
ایک دن دیکھا کہ محلے میں بچے کے ختنہ کی تیاری شروع ہے۔ منڈپ ڈالا جا رہا ہے، مائک ٹیسٹنگ ہو رہی ہے۔ دولہا سر سے رہا نہ گیا۔ وہ بچے کے والد کے پاس پہنچ کر اس سے مستدعی ہوئے کہ ختنہ کے فوراً بعد میری کتاب کی رونمائی رکھ دیں۔ اس نے سوچا، مسکین کی دعا سے بچے کا زخم جلد سوکھ جائے گا، بخوشی راضی ہو گیا، اور بتاشے بانٹنے سے پہلے کتاب کی رونمائی کرا دی۔ اس کامیابی کے بعد دولہا سر کا کانفی ڈینس بڑھ گیا۔ اب عالم یہ ہے کہ جہاں چار لوگ جمع ہوئے، کتاب کی رونمائی کرا لیتے ہیں۔
ایک دن محلہ میں زوجین کا جھگڑا راستہ تک آ گیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔ دولہا سر نے مجمع دیکھا تو فوراً اپنے بیگ سے دو کتابیں نکالیں اور دونوں کے ہاتھ میں دے کر موبائل سے تصویر لے لی۔ تصویر کلک ہونے کے بعد دونوں نے کتابوں سے ایک دوسرے کو مارا لیکن وھاٹس ایپ پر خبر گردش کرنے لگی کہ، 'زوجین کا جھگڑا'، دولہا سر کی کتاب سے نمٹا'۔
موصوف بڑے فخر سے بتاتے ہیں کہ کتاب میں اتنے صفحات نہیں ہیں جتنی مرتبہ میری کتاب کی رونمائی ہو چکی ہے۔
رونمائی کے شانہ بشانہ کتاب پر تبصرے بھی شائع ہونے لگے۔ ایک تبصرہ معروف نقاد کے نام سے شائع ہوا تو اس نقاد نے سخت اعتراض کیا کہ وہ انھوں نے نہیں لکھا۔ دولہا سر نے خوب شور مچایا کہ، ''وہ میری شہرت سے فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔'' یہ بات کسی طور حلق سے نہ اتری کہ انکار سے کیسے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے، لہٰذا ہم نے اپنا شک دور کرنے کے لیے ان سے پوچھا، ''کیا آپ گھوسٹ رائٹنگ بھی کرتے ہیں؟''
موصوف نے کچھ یوں قہقہہ مارا گویا کہہ رہے ہوں، 'جہانِ عشق میں تفریقِ اسم و ذات نہیں۔' ہم نے یہ سوچ کر دل کو سمجھا لیا کہ اگر کوئی ادیب اس طرح اپنی تحریر کا صدقہ نکالتا ہے تو کیا برائی ہے۔
ادھر، دولہا سر نے ادبی اصطلاحیں وضع کرنے کا ٹینڈر بھرا اور ٹھیکہ ان کے نام ہوا۔ ایک معروف افسانہ نگار نے گائے پر چند افسانچے سپردِ قلم کیے تو انھوں نے بے دریغ مشورہ دیا کہ آپ نے نئی صنف ایجاد کی ہے، آپ اسے بجائے افسانچہ کے بقرانچہ لکھیے۔ شکر ہے کہ افسانہ نگار نے اُس کے بعد افسانچہ ہی لکھنے سے توبہ کر لی۔ ورنہ وہ ان کے بچوں پر لکھے گئے افسانچوں کو 'طفلانچے' اور عورتوں پر لکھے گئے افسانچوں کو 'زنانچے 'کہتے۔ و علیٰ ہٰذا القیاس۔
ایک دن اطلاع ملی کہ دولہا سر، اسکول کی عمر رسیدہ چپراسن کے عشق میں گرفتار ہیں۔ یہ سن کر ہمارا اپنا جمالیاتی ذوق شک کے دائرے میں آ گیا۔ ہم نے عرض کیا، ''آپ کے والد مؤذن ہیں؟'' بولے، ''بھئی حکیم الامت بھی اس وادیِ پر خار سے گذر چکے ہیں۔''
ہم نے از راہ ہمدردی کہا، ''لیکن آپ ٹیچر ہیں اور وہ بیچاری ...؟''
قہقہہ مار کر بولے، ''کفو نکاح کے لیے ضروری ہے، عشق کے لیے نہیں۔ بندہ کے لیے بغیر عشق کے سانس لینا بھی حرام ہے۔''
ہم نے کہا، ''جو بھی ہو، مگر یہاں، وہ منھ کھولے تو اس کے پَون انچی دانت دکھائی دیتے ہیں۔''
فرمایا، ''ان دانتوں میں ایک دانت سونے کا بھی ہے۔'' اُس دن ہم اپنے جمالیاتی ذوق پر شرمندہ ہو کر دولہا سر کے معاشی ذوق پر رشک کرنے لگے۔ یہ عشق بہت لمبا چلا اور اس کا اختتام بڑے المیے پر ہوا۔ دولہا سر کو امید تھی کہ جس روز سالخوردہ معشوقہ کو پیغام اجل آئے گا، وہ یہ دانت تبرکاً حاصل کر لیں گے۔ مگر پھر انھیں معلوم ہوا کہ ایک وہی دانت ذاتی ہے اور باقی تمام مستعار۔ چونکہ اصل ہے اس لیے پیلا پیلا چمکتا ہے اور نقلی دانت سفید دکھتے ہیں۔ اس کے بعد انھیں لفظ عشق سے نفرت ہو گئی۔
ایک دن سر راہ مل گئے، خیریت پوچھنے پر فرمایا، ''انگریزی الفاظ کے معمے حل کرنے میں جو لطف ہے وہ عشق بازی میں بھی نہیں۔'' ہم نے، کلمات تحسین سے ان کے کانوں کو نوازا۔ موصوف خوش ہو کر بولے، ''صاحب! ہم نے وہ معمہ (puzzle) صرف چھ مہینے میں حل کر دیا جس کے اوپر ''۲ سے ۵ سال کے لیے'' لکھا ہوا تھا۔
ہم نے کہا، ''بھئی آپ دنیا کے سب سے بڑے جینیس ہیں!''
انھوں نے اونٹ کی طرح گردن اونچی کی اور بولے، ''وہ تو ہم نے ثابت کر دیا ہے۔''
براہِ کرم، دولہا سر کو 'قدرتی حماقت پر مصنوعی ذہانت' کی جیتی جاگتی تصویر نہ کہیں، ہاں ... قہقہہ لگاتی تصویر کہہ سکتے ہیں۔

محمد توحید الحق

تندرستی بڑی مصیبت ہے؟

محمد توحید الحق

نہ جانے کس دانشور نے کہا ہے:

تندرستی ہزار نعمت ہے!

ہمیں آج تک اِس قول کی صداقت پر یقین نہیں آیا۔ ہمارا ذاتی تجربہ بتاتا ہے کہ وہ دن لَد گئے ' جب تندرستی بڑی نعمت ہوا کرتی تھی اور نحیف، لاغر اور مریض لوگ صحت مند لوگوں پر رشک کیا کرتے تھے۔ اب موسم کی طرح سماجی و اخلاقی قدریں بھی تیزی سے بدل رہی ہیں۔ آج تندرست ہونا دائمی مصیبت اور پریشانی کا پیش خیمہ ہے۔ لہٰذا میں جب بھی کسی صحت مند آدمی کو دیکھتا ہوں، خوش ہونے کے بجائے اس سے ہمدردی کا اظہار کرتا ہوں اور دعا کرتا ہوں کہ وہ بھی صحت مند ہونے کی سزا نہ بھگتے۔ اسکول میں دیکھیے ...! آفیسر یا ہیڈ ماسٹر صاحب بھی اچھے خاصے تندرست استاد کو اسکول کے لیے کوئی خدائی انعام سمجھتے ہیں۔ ہمیشہ انھیں کوئی نہ کوئی کام سونپ دیتے ہیں۔ اسکول کے لاغر اور مریض قسم کے اساتذہ ان کے صحت مند ہونے کا نہ صرف مذاق اڑاتے ہیں بلکہ مشورہ بھی دیتے ہیں کہ اگر اس طرح کے کاموں سے ہمیشہ کے لیے نجات پانی ہو تو فوراً کسی اچھی سی بیماری کا انتخاب کر لو اور پھر اس میں مبتلا ہو جاؤ۔ کیا مجال ہے کہ کوئی آپ کو کام کے لیے مجبور کرے۔ ایک دن ہم نے احتجاجاً ہیڈ ماسٹر صاحب سے بہت زیادہ کام دیے جانے کی شکایت کی تو فوراً کہنے لگے: جناب! ایسا مت سمجھیے کہ ہم آپ کی صحت کے دشمن ہیں۔ خدا آپ کو یوں ہی سدا صحت مند رکھے۔ ذرا دیکھیے انوار صاحب کو! وہ بے چارے یوں ہی بیماری سے پریشان ہیں۔ اس سے زیادہ ان کے طالب علم اور گھر والے پریشان ہیں۔ اگر ہم انھیں کوئی کام دے دیں اور خدا نخواستہ کام کے بوجھ اور تنخواہ دیر سے ملنے کے تناؤ سے ان کی طبیعت بگڑ گئی تو اسکول کی چھٹی کرنی پڑے گی۔ دوم ان کی ناگہانی موت کا الزام ہم اپنے قطعی نہیں لینا چاہیں گے۔ آپ چوں کہ ماشاء اللہ صحت مند ہیں، لہٰذا آپ کو کام دینے میں ایسا کوئی خطرہ نہیں ہے۔ پھر یہ بھی تو دیکھیے کہ اس طرح کے کام دے کر ہم نہ صرف آپ کی صحت کے قائل ہیں بلکہ جتنا کام آپ کرتے ہیں آپ کی قابلیت اور صحت میں اتنا اضافہ ہوتا ہے۔ ان کی دلیل سن کر ہم لاجواب ہو گئے۔

اپنی صحت کو بحال رکھنے کے لیے ہم علی الصبح اٹھتے ہیں اور پیدل چلتے ہوئے کسی ہرے بھرے باغ یا میدان کا رخ کرتے ہیں۔ لوگ باگ کہہ گئے ہیں کہ پیدل چلنے سے صحت اچھی رہتی ہے۔ حالانکہ پیدل چلنے کے لیے پہلے سے صحت کا اچھا ہونا ضروری ہے۔ بہر حال میدان میں پہنچ کر ہلکی پھلکی ورزش کرتے ہیں، دوستوں سے ملتے ہیں، ہیڈ ماسٹر کی غیبت کرتے ہیں اور گھر واپس آتے ہیں۔ صحت مند ہونے سے سب سے زیادہ پریشانی گھر والوں کو ہوتی ہے۔ ایک دن بیگم صاحبہ جھنجھلا کر کہنے لگیں: آپ صبح اٹھ کر ایسا کون سا کام کر لیں گے جس سے ملک کی غریبی یا بے روزگاری دُور ہو جائے گی۔ ہمارے جلدی اٹھنے سے بیگم صاحبہ کی نیند اور دماغ میں خلل ہوتا ہے۔ انھیں معلوم ہے کہ نیند سے بیدار ہوتے ہی ہم ہوا خوری کے لیے نکل جاتے ہیں۔ وہاں سے ایک گھنٹے کی واپسی کے بعد چائے اور ناشتہ تیار ملنا چاہیے۔ اگر اس میں ذرا سی بھی تاخیر ہو گئی تو پھر طرح طرح کی باتیں سننی پڑیں گی۔ لہٰذا وہ خود ہماری صحت سے قدرے ناخوش ہیں۔ ایک دن کہنے لگیں: ہمارے پڑوسی قاسم بھائی کو دیکھیے! ہمیشہ بیمار رہتے ہیں۔ خود دیر تک سوتے ہیں اور گھر والوں کو زیادہ سے زیادہ آرام کرنے کی صلاح دیتے ہیں۔ کھانا نہایت سادہ اور وہ بھی برائے نام کھاتے ہیں۔ اس سے نہ صرف رسوئی گیس کی بچت ہوتی ہے بلکہ طرح طرح کے کھانے بنانے کی جھنجھٹ سے بھی گھر والوں کو نجات مل گئی۔ بیماری کی وجہ سے ان کی طبّی معلومات میں غیر معمولی اضافہ ہوا ہے۔ اکثر گھر آنے والوں کو مفت طبّی مشورہ دیتے ہیں۔ دواؤں کے نام اور ان کے استعمال کی ترکیب بتاتے ہیں۔

صحت مند آدمی کو ہر وقت نظر لگنے کا ڈر رہتا ہے۔ جسے دیکھیے اسے تندرست دیکھ کر ٹوکنا شروع کر دیتا ہے۔ ڈاکٹر صاحبان بالخصوص صحت مند انسان سے ایسے ہی دور رہتے ہیں جیسے مہاتما گاندھی سینما سے یا ہمارے نیتا ایمانداری سے!

ایک دن ہمیں نہ جانے کیا سوجھی۔ اپنے ڈاکٹر دوست کے گھر اُن سے ملنے کے لیے چلے گئے۔ دوران گفتگو شکایت بھی کر دی کہ آپ تو ہمارے گھر آتے ہی نہیں۔ فوراً تنک کر بولے۔ حضور والا، اس کی واحد وجہ ہماری بد اخلاقی نہیں بلکہ آپ کی تندرستی ہے۔ ہم ٹھہرے ڈاکٹر۔ ہماری غیرت یہ کبھی گوارا نہیں کرتی کہ ہم کسی بھلے چنگے اور صحت مند آدمی سے ملنے اس کے گھر جائیں۔ بہتر ہو گا کہ آپ جلدی سے کوئی چھوٹی موٹی بیماری پال لیں۔ اس سے نہ صرف ہماری آمدنی میں اضافہ ہو گا بلکہ آپ سے ملاقات بھی ہوتی رہے گی۔ ایک راز کی بات یہ بھی بتا دیں کہ ہم ڈاکٹروں کو کسی کی موت کا اتنا افسوس نہیں ہوتا جتنا ایک گاہک کے کم ہو جانے کا ہوتا ہے۔ اُن کا دعویٰ ہے کہ صحت مند آدمی نہایت خود غرض اور بیکار ہوتا ہے۔ انسانیت کی معراج یہ ہے کہ آدمی دوسروں کے کام آئے۔ ذرا سوچیے بیمار آدمی سے کتنے لوگوں کو روزی ملتی ہے۔ آپ صحت مند ہیں، بتائیے اپنے علاوہ آپ کی ذات سے کسی کو کوئی فائدہ پہنچ رہا ہے؟

ہمارے ایک اور دوست ہیں شرما جی! ایک دن کہنے لگے: یار! ابھی تک ہم اِس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ تندرست آدمی کی زندگی قابل رشک ہوتی ہے۔ مگر یہ غلط فہمی اُس وقت دوُر ہو گئی جب کسی بیماری کی پاداش میں ہمیں شہر کے مشہور اسپتال میں بھرتی کروایا گیا۔ اُس وقت ہمیں محسوس ہوا کہ تندرست رہ کر ہم نے زندگی کے کتنے بہترین دن برباد کر دیے۔ بڑا شاندار اے، سی کمرہ، ایل سی ڈی اور خوشنما پردوں سے مزین۔ سنگ مرمر کا فرش۔ تین چار خوبصورت نرسیں جو ہر لمحہ مسکراتے ہوئے نہ صرف حال چال پوچھتی ہیں بلکہ اتنی پابندی سے مقر رہ وقت پر دوائیں دیتی ہیں کہ گھر والے بھی کیا ایسی تیمار داری کریں گے۔ ملنے جلنے والے طرح طرح کے پھل اور بسکٹ وغیرہ لاتے ہیں وہ الگ! آپ بیمار ہو جائیے اور پھر دیکھیے آپ کسی وی آئی پی سے کم نہیں معلوم ہوتے۔ پھلوں کی بات تو چھوڑیے لیکن خوبصورت نرسوں کا خیال آتے ہی ہمیں ہماری تندرستی بری لگنے لگی اور ہم من ہی من بیمار ہونے کی دعا کرنے لگے۔

تندرست آدمی گہری نیند سوتا ہے۔ اس لیے ہر وقت چوری کا کھٹکا لگا رہتا ہے۔ اس کے برعکس بیمار آدمی رات بھر بے چین رہتا ہے، کروٹیں بدلتا ہے، کھانستا ہے، خود جاگتا ہے اور گھر والوں کو جگاتا ہے۔ کس چور کی شامت آئی ہے جو ایسے گھر میں چوری کرنے کی حماقت کرے!

غرض تندرستی بڑی مصیبت ہے!!

ڈاکٹر اظہر ابرار

۱۴، مئی ۱۹۷۹ کو اچل پور میں پیدا ہوئے۔ اردو میں ایم اے اور ڈاکٹریٹ کی ڈگری حاصل کرنے کے بعد ایس کے پوروال کالج کامٹی میں لکچرر کے عہدے پر فائز ہیں۔ افسانے اور طنزیہ و مزاحیہ مضامین کے علاوہ انھوں نے تنقیدی مضامین بھی تحریر کئے ہیں۔ ان کی نگارشات اردو کے معروف رسائل مثلاً ماہنامہ ایوانِ اردو، اردو دنیا، شگوفہ، کتاب نما، تحریر نو وغیرہ میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔ ان کی دو کتابیں دوسرا ٹکٹ (محمد اسد اللہ کے منتخب انشائیے) اور، گلدستہ شائع ہو چکی ہیں۔

کار ڈرائیونگ

ڈاکٹر اظہر ابرار

انسانی خواہشات کا سلسلہ بڑا عجیب ہے، ایک خواہش پوری ہوتے ہی دوسری فوراً سر اٹھا لیتی ہے۔ مرزا غالبؔ نے اس خیال کو کیا خوب شعری جامہ پہنایا کہ ’’ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے‘‘ ایسی ہی ایک تمنا ہمارے دل کے سرد خانے میں نجانے کب سے پڑی تھی شاید اس وقت سے جب سے ہم بالغ ہوئے اور وہ خواہش تھی ڈرائیونگ سیکھنے کی جسے اتنا عرصہ بیت جانے کے بعد اب ہماری شریک حیات نے جلا بخشی۔ ہم تو اپنی موٹر سائیکل ہی میں خوش تھے، مگر بیگم صاحبہ تہیہ کر چکی تھیں کہ ہمیں ڈرائیونگ سکھا کر ہی دم لیں گی۔ یوں تو بیگم کی سوچ بھی صحیح تھی کیونکہ موٹر سائیکل اور کار کا فرق اگر معلوم کرنا ہو تو آپ سگنل پر تھوڑی دیر رک کر اپنے آس پاس کا مشاہدہ کریں۔ کار میں بیٹھے افراد کی نظر یں آپ

کو یہ فرق بآسانی سمجھا دیں گی۔ بہر حال ڈرائیونگ سیکھنے کا مرحلہ ہمارے لیے کسی پہاڑ کو سر کرنے کی مانند تھا۔ مگر ہمیں اس میدان کارزار میں قدم رکھنا ہی پڑا۔
اس رات ہم میں اور نیند کے درمیان میٹر ہی نہیں کلومیٹر کا فاصلہ تھا کبھی کبھار یکبارگی جھپکی لگ بھی جاتی تو عجیب و غریب خواب پریشان کرتے، ان کے خوفناک سائے منڈلانے لگتے۔ فجر کے وقت الارم کا بجنا کسی خطرے کی گھنٹی سے کم نہ تھا، مارے خوف کے ہم نے رضائی میں اپنا سر یوں چھپا لیا جیسے شتر مرغ خطرہ بھانپ کر ریت کا سہارا لیتا ہے۔ کچھ دیر بعد ہمیں اٹھایا گیا اور ناشتہ کروا کر اس طرح تیار کیا گیا جیسے ہم کوئی سپاہی ہوں اور سرحد پر معرکہ آرائی کے لیے ہمیں بھیجا جا رہا ہے۔ ہمارے بیگ میں رو مال اور چشمے کے ہمراہ ایک پانی کی بوتل بھی بڑے اہتمام سے رکھی گئی۔ ہم نے جوں ہی ہتھیلیوں سے اپنی پیشانی کو چھوا تو محسوس ہوا گویا ہمارا سارا خون منجمد ہو گیا، جسم سرد پڑ گیا، زبان دانتوں میں پھنس گئی اور ہم اشاروں کنایوں میں باتیں کرنے لگے۔ ہم نے اپنے بوجھل قدم گھر سے باہر نکالے تو دیکھا استاد (ڈرائیور) مع کار حاضر تھے۔ سیٹ پر بیٹھتے ہی سیٹ بیلٹ باندھ کر اسٹیرنگ ہمارے ہاتھوں میں تھما دی گئی ہم لرز اٹھے اور دل میں اپنے رہبر کو دہائی دی 'ارے استاد کیوں جان لینے پر تلا ہے۔' اس نے ہمیں سب سے پہلے ان تمام کل پرزوں کے فنکشنس سمجھا دئیے۔ یہاں تک کہ ہارن بجا کر بھی بتا دیا، ہم دیکھتے رہے اور اثبات میں سر لگاتار ہلتا رہا۔ ایک اہم بات ہمیں سمجھائی گئی کہ کار اسٹارٹ کرنے سے پہلے ائیر بریک ضرور نیچے کر دیا کریں اور اس بریک کو ایمرجنسی کے وقت ہی اوپر کریں۔ بے چینی کے عالم میں ہم پسینہ پوچھنا تو درکنار پانی پینا بھی بھول گئے۔ یہ فور وھیلر گاڑیاں بھی بڑی عجیب ہوتی ہیں یہاں ہاتھوں سے کم اور پیروں سے زیادہ مشقت لی جاتی ہے۔ دو پیر اور کام تین بھلا بتائیے کہ کس طرح انسان ایک ساتھ کلچ بھی دبائے، ایکسلیٹر بھی دے اور ساتھ ہی بریک بھی لگائے۔ کئی بار تو ہم گھبرا گئے بیک وقت اتنا کام ہم نے زندگی میں کبھی نہیں کیا تھا۔ ہم سوچنے لگے یہ اب ہم سے نہ ہو گا۔ کار میں ہم بیک سیٹ پر یا ڈرائیور کی بغل اکثر بیٹھا کرتے، تب ہمیں باہر کی دنیا بڑی رنگین معلوم ہوا کرتی تھی۔
ہم نے کار اسٹارٹ کرنے کے بعد سب سے پہلے کلچ دبایا
پھر گئیر میں گاڑی ڈالی اور کم ایکسلیٹر دیا، اسپیڈ بڑھ رہی تھی جس سے کار تیزی سے چلنے لگی۔ ڈرائیور نے اس بات کا اطمینان دلا رکھا تھا کہ اس کی جانب بھی ایک اور بریک ہے لہٰذا ہم مطمئن ہو گئے۔ بڑی ہمت کے ساتھ ہم نے کار دوسرے گیئر میں ڈالی اور مزید رفتار بڑھائی اس وقت یقین جانیے ہمارا دل زور سے دھڑکا۔ ہمیں ایسا محسوس ہوا گویا ہم بے قابو ہوئے جا رہے ہیں۔ پیروں میں اچانک چونٹیاں بھرنے لگیں دماغ سن پڑ گیا اور اچانک سامنے اسکولی بچے آ گئے جو غالباً سڑک پار کر رہے تھے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کریں اور ایک دم سارے فنکشنس بھول گئے، کار بہکنے لگی مگر ڈرائیور نے اس وقت فوراً ہوش مندی سے کام لیتے ہوئے رفتار کم کر دی اور بریک لگا دیے۔
سڑک پر ابھی تک جو نظارے رنگین معلوم ہو رہے تھے وہ گویا اب ہم پر ہنستے ہوئے دکھائی دیے۔ بعد ازاں ڈرائیور نے ہماری توجہ کار کے شیشے پر مبذول کرائی اور سمجھایا کہ کس طرح پیچھے کی سمت سے آنے والی گاڑیاں ان میں صاف نظر آتی ہیں۔ پھر کار اسٹارٹ کرنے کے بعد پہلے گیئر سے مشق جاری ہوئی اور دوسرا گیئر بدلا گیا لیکن جب گاڑی تیسرے گیئر میں آئی تو اس وقت اور بھی زیادہ تیز ہو گئی ہم تھوڑا سنبھل کر بیٹھ گئے۔ اب پہلی بار سے کچھ بہتر کرنے کی ٹھان لی، ابھی رفتار تیز ہوئی ہی تھی کہ دیکھا ایک مصیبت مخالف سمت سے ہماری جانب ہاتھ میں لاٹھی تھامے آ رہی ہے۔ وہ ایک ضعیف العمر بڑے میاں تھے جو سڑک کو اپنی ملکیت سمجھ کر آڑے ترچھے ہو کر چل رہے تھے۔ ہم نے فوراً ہارن بجانا شروع کیا اور بجاتے ہی چلے گئے لیکن وہ ٹس سے مس نہ ہوئے شاید ضعیفی نے ان کی سماعت اور مزاج دونوں کو متاثر کر رکھا تھا۔ ان کی ڈھٹائی جیسے ہمارے صبر کا امتحان لینے پر تلی ہوئی تھی۔ ڈرائیور نے کہا "مت ڈرو ہمت سے کام لو یہ تو ایک چھوٹی مصیبت ہے ابھی تمھیں بہت بڑی بڑی مصیبتوں کو پار کرنا ہے" ۔ ایسی سچویشن میں سب سے پہلے کار کو چھوٹے گیئر میں ڈالنا چاہیے پھر اسے نیوٹرل کرنا چاہیے مگر یاد رکھو کہ کبھی بھی بڑے گیئر میں ہر گز بریک نہ لگایا جائے جس سے کار کے گھومنے یا پلٹنے کا خطرہ ہوتا ہے۔ ہم نے ہدایت پر عمل کیا اور کار رک گئی۔
پھر سے ہم نے اپنی مشق جاری رکھی پہلے گیئر سے دوسرا، تیسرا اور چوتھا گیئر بدلتے چلے گئے۔ ہم سے پچھلے وقتوں میں جو غلطیاں سرزد ہوئی تھیں اب ان کا ازالہ بتدریج ہوتا جا رہا تھا۔ یہ سلسلہ لگاتار پندرہ روز تک جاری رہا آخر وہ دن بھی آیا کہ جب ہم نے کار کے اعصاب پر پوری طرح سے کمانڈ حاصل کر لی۔ اس بار ہمارا ڈرائیور بیک سیٹ پر بیٹھا باہر کے نظاروں سے لطف اندوز ہو رہا تھا تو وہیں ہم بھی فرنٹ سیٹ سے قدرتی مناظر کو دیکھ کر سرشار ہوئے جا رہے تھے۔ دونوں جانب موجود درخت یوں لگ رہے تھے جیسے وہ صف بستہ ہمارے استقبال کے لیے کھڑے ہیں۔ اس وقت ہماری کار ہوا سے باتیں کر رہی تھی اور ہم جیسے ہوا میں اڑ رہے تھے۔
ہم کار پارک کر کے جوں ہی گھر میں داخل ہوئے اور نہایت تمکنت کے ساتھ اہل خانہ کو اور بالخصوص ہماری شریک حیات کو

یہ خوش خبری سنائی کہ بالآخر ہم نے کار سیکھ ہی لی! انسان میں لگن ہونی چاہیے جس طرح فرسٹ گیئر میں کار پہلے دھیرے دھیرے ہی چلتی ہے اور پھر فورتھ اور ٹاپ گیئر تک آتے آتے ہوا سے مقابلہ کرتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح زندگی کی گاڑی بھی روز مرہ کی سڑک پر ابتدا میں بھلے ہی آہستہ خرامی سے چلے مگر اس کے باوجود ایک نہ ایک دن وہ اپنی رفتار پا ہی لیتی ہے۔

ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ

ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ۴،مارچ ۱۹۵۶ء کو ملکا پور، ضلع بُلڈانہ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے (اردو، فارسی، عربی) اور پی ایچ ڈی کی اسناد حاصل کیں۔ انھوں نے اسماعیل یوسف کالج، ممبئی میں صدر شعبۂ اردو کی حیثیت سے خدمات انجام دیں۔
ڈاکٹر محمد کلیم ضیا ناگپور میں بھی تدریسی خدمات انجام دے چکے ہیں۔ شاعر، ادیب اور بچوں کے ادیب کی حیثیت سے معروف ہیں۔ ان کی کئی کتابیں شائع ہو چکی ہیں۔ انھوں نے چند مزاحیہ مضامین بھی قلم بند کئے ہیں۔
موبائیل: 9892933626

جوتے کی واپسی

کلیم ضیا

جوں ہی میں وضو کر کے جائے وضو سے نماز کے لیے باہر آیا، کیا دیکھتا ہوں کہ میرا جوتا جو کہ پلاسٹک کوٹیڈ تھا، غائب ہے۔ حیران و پریشان دیکھ، لوگوں نے پوچھ لیا ’کیا بات ہے بھائی صاحب؟‘۔ ۔۔ ۔۔۔ ’ارے یار! دو منٹ پہلے کی بات ہے، یہیں جوتا رکھّا تھا‘ وضو کر کے لوٹا تو۔ ۔۔ ۔ اِسی درمیان ایک صاحب طنزیہ مسکراہٹ کے ساتھ بول پڑے۔ ’کیا‘؟ مجھے بھی با دلِ ناخواستہ کہنا پڑا۔ ۔ ہاں۔۔ ۔۔ وہ پھر بولے۔۔ ۔ جماعت کھڑی ہونے جا رہی ہے پہلے نماز پڑھ لو، بعد میں دیکھتے ہیں۔۔ ۔۔ ۔ اب بتائیے جس کا جوتا مسجد میں داخل ہوتے ہی گم ہو جائے، اُس کا دل نماز میں تو لگنے سے رہا اور پھر مجھ جیسا دنیا دار جس کے بارے میں علامہ اقبالؔ نے فرمایا کہ
ع۔ ترا دل تو ہے صنم آشنا تجھے کیا ملے گا نماز میں
جیسے تیسے نماز ختم ہوئی ’دعا کے لیے سب کے ہاتھ دراز تھے، میرے بھی، مگر گردن لٹّو کی طرح چاروں طرف گھوم رہی تھی اور آنکھیں انجانے چور کو یوں تلاش کر رہی تھیں گویا وہ مجھے دیکھتے ہی جوتا لا کر دے دے گا۔ مجھے تو اُس وقت معلوم ہوا کہ دعا ختم ہو چکی ہے جب لوگ میرے گرد جمع ہونے لگے۔ ورنہ میرے ہاتھ تو ابھی تک کٹورا بنے ہوئے تھے۔
کیسا جوتا تھا؟۔ ۔۔ ۔ اچھا جوتا تھا! میں تو سمجھا چپل تھی۔ جوتے میں موزے بھی ہوں گے نا؟۔ ۔ چمڑے کا ہی تھا نا؟ لال تھا کہ کالا؟۔ ۔۔ نیا ہی رہا ہو گا۔ ۔؟ غرض کہ جتنے منہ اتنی باتیں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے سوالات نہ کیے جا رہے ہوں بلکہ موسل برسائے جا رہے ہوں۔ پھر کہیں سے آواز آئی۔۔ ۔ ارے بھیّا! کیا گھر تک ننگے پاؤں ہی جاؤ گے؟
اب تو واقعی احساس ہوا کہ گھر تک ننگے پاؤں ہی جانا ہے۔ اٹھنا بھی لازمی تھا اٹھا ہی تھا، کہ کسی منچلے نے آواز لگائی۔۔ ۔۔ ۔ چندہ جمع کرو یار۔ دو، دو روپے نکالو، نیا جوتا آ جائے گا۔ ۔۔ ۔ اتنی جھنجھٹ کا ہے کو منگتا یار۔ چل لا دو روپے نکال! لیجیے اب نوبت یہ آئی کہ ہم چندے کا جوتا پہنیں۔۔ ۔۔ ۔۔ مگر یہ بات تو قبول کرنی ہی پڑے گی کہ جمعہ کے دن مسلمان واقعی سخاوت میں حاتم طائی کا باپ ہو جاتا ہے۔ اب ہوا یہ کہ جنہیں معلوم تھا کہ چندہ کیوں جمع ہو رہا ہے، وہ آہستہ آہستہ کھسکنے لگے، جو انجان تھے اور نماز کی تکمیل کے بعد جانے لگے تھے، کوئی دو روپے دیتا، کوئی پانچ اور کوئی دس۔۔ آناً فاناً میں تین سو ستائیس (۳۲۷) روپے جمع ہو گئے۔ میں ان تمام باتوں سے لا تعلق کہ میں کون ہوں اور میری معاشی حیثیت کیا ہے؟ پیسوں کو یوں تکنے لگا گویا یہ میرا پیدایشی حق ہے۔
اس نے وہ رو مال جس میں پیسے جمع کیے گئے تھے، میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ۔۔ لے باپ تین سو ستّاویس (ستائیس) روپے جمع ہو گئے۔ اس میں تو سالا مست جوتا آ جائے گا۔ ۔۔ دوسرے نے فوراً کہا۔ ۔۔ ابے اے! اس میں دو جوتے آئیں گے۔ اِتّا (اتنا) مے گا(مہنگا) لے گا کیا؟۔ ۔۔ ۔ اے بھائی! دو لینا دو، کبھی اگلی بار چوری ہوا نا تو دوسرا کام آئے گا نا باپ!

اتنے میں پہلے والے حضرت جنہوں نے نماز پڑھنے کے بارے میں کہا تھا، سنتوں اور نفلوں سے فارغ ہوئے اور مجھ سے ایسے مصافحہ کیا جیسے ابھی ابھی حج بیت اللہ سے تشریف لا رہے ہوں۔ بڑی دیر تک لکچر پلایا۔ میاں جوتے بغل میں دابا کرو! چور اچکوں کی کمی تھوڑی ہی ہے۔ اب ہمیں کو دیکھ لو۔ سجدے کی جگہ پر جوتے رکھتے ہیں۔ کیا مجال کوئی چھو بھی لے!۔۔ یہاں پارہ ذرا نیچے اُترا ہی تھا کہ اِن کی لاف و گزاف نے پھر اوپر کر دیا۔ میں نے بڑے ہی ضبط سے کام لیتے ہوئے کہا۔ حضرت! میں نماز نہیں پڑھ رہا تھا صرف جوتے اتار کر وضو کے لیے بیٹھا تھا۔ اچھا یہ بات ہے! پھر بھی میاں جوتے جوتے ہوتے ہیں۔ نل کے اوپر ہی رکھ لیتے۔ یہ نوبت تو نہ آتی؟۔۔ میں نے بھی جل کر کہہ دیا۔ جی غلطی ہو گئی، آئندہ نل کے اوپر ہی رکھوں گا اور اگر وہاں جگہ نہ رہی تو اپنے سر پر۔۔ ۔۔ ۔ جملہ اس لیے ادھورا رہ گیا تھا کہ اب وہ پیسوں کا رو مال میری طرف بڑھانے لگے تھے۔ آنکھیں بالکل کے۔ این۔ سنگھ (پرانی فلموں کا وِلن) کے انداز میں حرکت میں آ گئی تھیں۔ میں نے فوراً اپنے دونوں ہاتھ آگے بڑھا دیے اور اس نعمت غیر مترقبہ کو مضبوطی سے تھام کر آگے بڑھنے لگا۔ ساتھ میں کھڑے ہوئے لوگ بھی میرے ساتھ ایسے چلنے لگے جیسے کوئی شخص اپنے وطن عزیز سے پردیس سدھار رہا ہو اور یہ لوگ اسے گاڑی تک چھوڑنے جا رہے ہوں۔ ۔ آہستہ آہستہ بھیڑ چھٹنے لگی۔ تھوڑی دور چل کر جب میں نے اپنے آپ کو بالکل تنہا پایا تو چاروں طرف دیکھ، تیز تیز قدم اٹھانے لگا کہ اتنے میں ایک پتلی سی گلی میں سے ایک چودہ پندرہ برس کا لڑکا، کُرتا پاجامہ پہنے سر پر ٹوپی لگائے، آنکھوں میں سُرمے کی پوری شیشی اُنڈیلے، خوش بو میں لپٹا ہوا ایسے نمودار ہوا جیسے کسی تیز رفتار کار یا گاڑی کے سامنے عموماً مسلم محلوں سے بچے وارد ہوتے ہیں۔ میں نے بھی اپنے بریک لگائے۔۔ سلام الیکم! وعلیکم السلام! میں نے کہا۔۔ وہ پیسوں کی تھیلی کہاں ہے؟۔۔ اب بتائیے مجھے ایسے وقت تو چونکنا چاہیے تھا نا۔ ۔ یہاں تو کچھ اور ہی کیفیت تھی کہ:

ع۔ میں تھا کسی کے ساتھ مرا دل کسی کے ساتھ۔۔

یہ ہے۔ میں نے کہا۔

یہ لیجیے آپ کا جوتا اور لائیے وہ تھیلی۔۔ ۔ اب تو ہوش ٹھکانے آ گئے۔ میں نے کہا۔ ابے! یہ کیا ڈراما ہے؟۔ ۔ ڈراما وراما کچھ نہیں۔ یہ جوتا وہیں بازو میں ہی پڑا ہوا تھا۔۔ ۔۔ ۔ وہ مولوی صاحب (غالباً جنہوں نے مجھے لکچر دیا تھا) نے کہا ہے کہ ان سے پیسے لے لو اور جوتے دے دو۔ میں نے کہا۔ اچھا! یہ بات ہے۔ میں نے بھی پھر تو خوشی خوشی پیسے دیے، جوتے پہنے اور چل دیا۔ راستے بھر خدا کا شکر ادا کرتا رہا اور دل ہی دل میں اپنی بے خیالی اور لاپرواہی کو کوستا رہا کہ جوتا شاید وہیں کہیں رہ گیا ہو گا، میں نے خواہ مخواہ ہی تماشا بنا دیا۔ لوگ کیا سوچیں گے؟ بہر حال کسی طرح گھر پہنچا اور کاروبار زندگی میں ایسا مصروف ہوا کہ اس واقعے کا کسی سے ذکر تک نہ کر سکا۔

ایک ہفتہ بیت گیا، پھر جمعہ آ گیا اور اتفاق ایسا کہ آج پھر اسی مسجد میں جمعہ ادا کرنا تھا۔ جوں ہی جمعہ کا خیال آیا اور پھر وہی مسجد۔۔ ۔۔ فلم کے پردے کی طرح گذشتہ ہفتے کا واقعہ ایک ایک سطر میں گزرنے لگا۔ دل ہی دل میں مسکراتا ہوا پھر جائے وضو پر پہنچا۔ جوتے سمیٹے اور انہیں گود میں رکھ کر وضو کر لیا۔ باہر نکلا تو پھر وہی بڑے میاں۔۔ سلام علیکم!۔۔ میں نے کہا وعلیکم السلام چچا! آپ کی بڑی عنایت کہ آپ نے پچھلے ہفتے میرا جوتا واپس دِلا دیا تھا۔ ورنہ پتا نہیں میں چندے کے پیسوں سے خریدے ہوئے جوتوں کے بارے میں ان کے پھٹنے تک کیا کیا سوچتا رہتا! بڑے میاں پہلے تو مسکرائے، پھر یک بیک چونک پڑے، پھر کہنے لگے، کیا مطلب؟ میں نے کہا۔۔ اجی آپ نے میرے جانے کے بعد ایک لڑکے سے جوتا نہیں بھجوایا تھا اور پیسے واپس نہیں منگوا لیے تھے! یہ دیکھیے، یہ وہی تو جوتے ہیں۔۔ ۔ میں نے انہیں اپنا پلاسٹک کوٹیڈ جوتا بتایا۔ اب اس کے بعد کا منظر واقعی دیکھنے جیسا تھا۔ انہوں نے اپنا سر پیٹ لیا۔ میرا خیال ہے وہ بھی با وضو تھے، ایک گندی سی گالی دی۔ ضرور یہ حرکت بھی اس مادر۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔ کی ہے جوتا چوری کر لیا ہو گا اور جب دیکھا کہ اتنے پیسے جمع ہو گئے، فوراً جا کر جوتا۔۔ ۔۔ ۔۔ میں نے انہیں درمیان میں ہی ٹوک دیا اور کہا۔ آئیے میں بھی ایک مرتبہ اور وضو کر لوں اور آپ بھی کر لیجیے۔

خان حسنین عاقب

خان حسنین عاقب ۸، جولائی ۱۹۷۱ کو اکولہ میں پیدا ہوئے۔ انگریزی اردو اور تاریخ میں ایم اے کے علاوہ ایم ایڈ کی سند بھی حاصل کی۔ شعبۂ تدریس سے وابستہ ہیں۔ مختلف زبانوں کے ماہر ہیں۔

خان حسنین عاقب نے شاعری اور تنقید کے علاوہ ترجمہ نگاری کے شعبے میں بھی قابلِ قدر خدمات انجام دی ہیں۔
''رمِ آہو'' اور ''خامۂ سجدہ ریز'' ان کے شعری مجموعے ہیں۔ انھوں نے چند طنزیہ و مزاحیہ مضامین بھی قلم بند کئے ہیں۔
رابطہ 9423541874

ٹی وی اور 'بی وی'

خان حسنین عاقبؔ

دیکھا جائے تو ٹی وی اور بی وی (آپ املا پر نہ جائیں، اسے بیوی ہی پڑھیے کہ اس سے ہماری مراد 'بیوی' ہی ہے، کچھ اور نہیں) میں ایک قدر مشترک ہے کہ دونوں الفاظ ہم قافیہ ہیں لیکن ہم ٹی وی کو بی وی پر فوقیت دیتے ہیں۔ ہاں بھائی، ہماری اپنی کچھ دلیلیں، کچھ وضاحتیں ہیں اس ضمن میں۔ آپ کو ٹی۔ وی شروع کرنی پڑتی ہے جب کہ بی وی خود بخود شروع ہو جاتی ہے۔ آپ ٹی۔ وی کو جب چاہے بند کر سکتے ہیں لیکن بی وی کے بارے میں ایسا سوچنا ممکن ہی نہیں بلکہ پاپ بھی ہے۔ آپ ٹی۔ وی کا چینل بدل سکتے ہیں لیکن بی۔ وی کا موڈ بدل نہیں سکتے۔ بجلی چلی جانے پر ٹی۔ وی آف ہو جاتی ہے لیکن بجلی چلی جانے پر بی۔ وی کی حربی قوت میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ ٹی۔ وی کو شوہر کے رشتے داروں سے کوئی بیر نہیں ہوتا لیکن بی۔ وی کے لئے شوہر کے رشتے دار اتنے ہی ازلی دشمن ہوتے ہیں جتنی ازلی دشمنی ابنِ آدم اور شیطان میں ہے۔ آپ سکون پانے کے لئے ٹی۔ وی شروع کرتے ہیں اور بی۔ وی شروع ہو جائے تو سکون کی تلاش میں ہمالیہ جا کر بھی ناکامی ہی ہاتھ آتی ہے۔
لیکن ایک بات ہے کہ ہم اور مرزا احترام بیگ ایک معاملے میں ایک دوسرے کے بالکل مخالف ہیں۔ ہمیں ٹی۔ وی اور بیوی سے جتنا شدید اختلاف ہے انہیں ان دنوں سے اتنی ہی شدید محبت ہے۔ یہ بات دیگر کہ ان کا اصول ہے ' ٹی۔ وی اپنے گھر کی اور بیوی پڑوس کے گھر کی۔' ان کے پاس اس کی بہت واضح دلیل ہے۔ کہتے ہیں، ''میاں، تم کیا جانو! پڑوسی کے حقوق کیا ہیں؟ کہا گیا ہے کہ پڑوسی سے بالکل اپنوں جیسی محبت کرو۔ ورنہ آج کل تو خون کے رشتوں میں بھی محبت باقی نہیں رہی۔''
اور ان حقوق کی ادائیگی کے لئے مرزا جی ہر پڑوسی کے ہر وقت کام آنا اپنا فرض سمجھتے ہیں۔ پڑوسی کو کوئی کام ہو یا نہ ہو، مرزا جی بڑی محبت سے اس کے گھر روزانہ حاضری دیتے ہیں۔ ہر پڑوسی کے گھر کو وہ اپنا گھر اور پڑوس کے ہر رشتے کو وہ اپنا رشتہ سمجھتے ہیں۔ پڑوسی اپنی بیوی کو اتنی محبت سے آواز نہ دیتا ہو گا جتنی محبت سے مرزا جی اس کی بیوی کو 'بھابھی' کہہ کر پکارتے ہیں۔ لیکن ایسا صرف ان ہی گھروں میں ہوتا ہے جہاں ''بھابی'' خود کو اتنی محبت کے ساتھ ''بھابھی'' کہلوانے کا شوق رکھتی ہوں۔ ورنہ مرزا جی اتنے بدھو بھی نہیں ہیں کہ جہاں انہیں انگلی رکھنے کو جگہ نہ ملے، وہاں خود گھُستے پھِریں۔ یہ تو مرزا جی کا خلوص ہی ہے ورنہ اب ایسے لوگ کہاں؟
خیر، یہ مرزا نامہ تحریر کرنے کیا سوجھ گئی بھائی؟ بات ہو رہی تھی ٹی۔ وی اور بیوی کی۔
بیوی سے تو ہم پہلے ہی سے چڑتے ہیں۔ آپ یہ نہ سمجھیں کہ یہ چڑ ہمیں شادی کے بعد لاحق ہوئی ہے۔ نا جی نا، اپنی شادی سے پہلے ہم ہر بیوی سے چڑتے تھے، یہ سوچ کر کہ ہر کوئی کسی نہ کسی کی بیوی ہے، ہماری ایک عدد بیوی کیوں نہ ہوئی؟ البتہ شادی کے بعد صرف اپنی ہی بیوی سے چڑتے ہیں۔ دوسروں کی بیویوں پر تو رشک آتا ہے کہ کیسی سگھڑ، گھریلو اور فرمانبردار بیویاں ہیں۔ کاش۔۔ ۔۔ خیر، جانے دیجئے، نا ممکن بات کی کیا خواہش کرنا!
اسی حوالے سے ہمیں ایک واقعہ یاد آ رہا ہے۔ کچھ عرصے قبل ہمارے گھر کی ٹی۔ وی بگڑ گئی تھی۔ ہم نے اسے درست کروانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ بچوں کے امتحانات کا موسم تھا۔ لیکن بچے کہاں مانتے ہیں۔ انہوں نے ٹی۔ وی سے استفادے کا عمل جاری رکھا۔ ٹی۔ وی کا کوئی پُرزہ اندر سے ڈھیلا ہو چکا تھا اور اُسے ایک ہلکا سا دھکا دئے بغیر تصویر نہیں آتی تھی، وہ ریڈیو ہی بنا رہتا تھا۔ دھیرے دھیرے ٹی۔ وی معمولی دھکے کھانے کے بعد بھی 'بلبل فقط آواز ہے' کی عملی شکل بنی رہی تو بچوں نے اسے ٹھونکنا شروع کر دیا۔ پھر ٹی۔ وی اس ٹھونکا ٹھانکی کی بھی عادی ہو گئی تو بچوں نے اسے لاتوں گھونسوں پر رکھ لیا۔ ہمیں جب خبریں یا میچ دیکھنا ہوتا تو کبھی کبھی ہم خود بھی اس 'زد و کوب' میں شامل ہو جاتے۔ یہ مریضہ اور مضروب ٹی۔ وی کبھی ایک جگہ ٹِک کر نہیں رہی۔ سیاسی لیڈروں کی طرح (جو پارٹی بدلتے رہتے ہیں) یہ ہمیشہ کمرے بدلتی رہی۔ کبھی ہال میں، کبھی بیڈروم میں، اور کبھی ہال اور بیڈروم کے درمیان اپ۔ ڈاؤن کرتی رہی۔ بچے جہاں چاہتے، مریضہ کو سیر کے لئے لے جاتے۔ ہمارے چھوٹے صاحبزادے عدنان احمد خان نے تو ایک نئی ترکیب نکال لی تھی۔
مریضہ جب بیڈ روم میں سکونت پذیر تھی تو بچے مع اپنی ماں کے، آرام کے ساتھ بستر پر جم جما کر مریضہ سے استفادہ (بہ

ترکیبِ عیادت) کرتے۔ مریضہ کے اسکرین پر جب کوئی انتہائی دل چسپ منظر چلتا اور ایسے میں اچانک اس کی تصویری صلاحیت غائب ہو جاتی اور وہ محض ریڈیو بن جاتی تو عدنان میاں اس کو ٹھونکنے کے لئے ایک لمبا سا ڈنڈا پاس رکھتے تھے جسے وہ ایسی صورت میں فوراً مریضہ کے سر یا پیٹھ یا جس جگہ مناسب محسوس ہوتا، رسید کر دیتے۔ یعنی بستر سے اُتر کر مریضہ تک پہنچنے کا تکلف کرنے کی کوئی ضرورت اس نئی ترکیب کی وجہ سے باقی نہیں رہی تھی۔ مریضہ شاید اس ڈنڈا کشی کی وجہ سے تھوڑا افاقہ محسوس کرتی تھی اس لئے کبھی کبھی یہ ترکیب کام کر جاتی تھی۔ ابھی کچھ دن پہلے ہم نے اپنے بال بچوں کو اس 'مشقِ ستم' سے نجات دلا دی یعنی اس ٹی۔ وی کو باہر میدان میں لے جا کر لوہے کی سلاخ سے اس کی پکچر ٹیوب پر ایسا وار کیا کہ بس دیکھنے والوں کو ضربِ کلیم (علامہ اقبال کی بھی) ہی یاد آ گئی ہو گی، لیکن وہ تو اچھا ہوا کہ دیکھنے والا کوئی نہیں تھا ورنہ وہ سارا وقت 'ضربِ کلیم' کے معنی ڈھونڈنے میں لگا رہتا۔ ۔ بہر حال، اس ضربِ کلیم سے استفادے کے بعد ٹی۔ وی بے چاری کسی کام کی نہ رہی اور صبح کچرے والا اسے اُٹھا لے گیا۔ کانچ اب بھی وہیں بکھرے پڑے ہیں۔

بس، یہ سلوک آپ صرف ٹی۔ وی کے ساتھ ہی کر سکتے ہیں۔ بی۔ وی کے ساتھ تو۔۔ نہیں۔ ہم کچھ نہیں کہیں گے۔۔ بقول قتیل شفائیؔ

ے گرمیِ حسرتِ ناکام سے جل جاتے ہیں

اب یہی دیکھ لیجئے۔ ہم ابھی قتیل شفائی کا یہ مصرعہ ٹائپ کر ہی رہے تھے کہ ہماری اہلیہ آ دھمکیں۔ انہیں آتا دیکھ کر ہماری سٹی پٹی گُم ہو گئی۔ اس سے پہلے کہ ہم اپنا چشمہ ڈھونڈ کر کمپیوٹر پر مضمون کا اسکرین غائب کرتے، ہم ان کے احاطۂ رسائی میں پہنچ چکے تھے۔ (یا شاید زیادہ درست یہ ہو کہ وہ ایسے احاطہ میں پہنچ چکی تھیں جہاں سے ہم تک ان کی رسائی سے فرشتے بھی انہیں باز نہیں رکھ سکتے تھے۔) انہوں نے پوچھا، ''کیا لکھ رہے ہیں؟'' ہم نے کہا ''کچھ نہیں۔'' ہمارے ان دو لفظوں سے زیادہ ہماری ہکلاہٹ نے ان کے شُبہ کو تقویت بخشی اور انہوں نے ہمیں ایک ہاتھ سے یوں بازو سرکایا جیسے کوئی شخص اپنے سامنے رکھی خالی رکابی کو بے نیازی کے ساتھ بازو کر دیتا ہے۔ ہم سہم کر رہ گئے۔ جہاں تک قتیل شفائی والا مصرعہ ٹائپ ہو چکا تھا، انہوں نے وہاں تک یہ انشائیہ پڑھا، بہت ہنسیں، بہت ہنسیں، خوب ہنسیں۔ کہنے لگیں ''رُکو، ذرا ٹھہر کر پڑھتی ہوں۔ ہنستے ہنستے جبڑے دُکھنے لگے ہیں۔'' ہم کو اپنے قلم کی طاقت پر ناز ہوا کہ وہ مارا۔ آج تو شیر شکار ہو گیا۔ پھر جب وہ پڑھ چکیں اور پڑھتے پڑھتے مہینے بھر کی ہنسی کا کوٹہ پورا کر چکیں تو اچانک ٹھٹھک گئیں۔ بس، ہم ان کے اسی ٹھٹکنے سے خوف کھاتے ہیں۔ وہ اپنی پیشانی پر بَل ڈال کر(انہیں بَل ڈالنے کی ضرورت نہیں پڑتی، ہمیں اور ہمارے رشتے داروں کو دیکھ کر خود بخود ان کی پیشانی پر غیب سے یہ بَل نمودار ہو جاتے ہیں) بولیں، ''تم نے یہ بیوی اور ٹی۔ وی پر انشائیہ لکھا ہے، تو بیوی کے بارے جو اتنی باتیں لکھیں، یہ کس کی بیوی کے بارے میں ہیں؟ کہیں یہ میں تو نہیں ہوں؟'' ہم نے فوراً ان کے شُبہ کو یقین میں بدلنے سے روکتے ہوئے کہا، ''ارے بیگم، تم بھی کمال کرتی ہو۔ کہاں تم جیسی لاکھوں میں ایک بیوی اور کہاں میرے انشائیے والی بیوی! یہ تو ہم نے دوسروں کی بیویوں کے بارے میں لکھا ہے۔ ہم جب تم پر لکھیں گے تو دیکھنا، کیسا انشائیہ لکھیں گے۔ تم امر ہو جاؤ گی۔'' ہماری اہلیہ بے انتہا خوش ہو گئیں کیونکہ انہیں امر ہونے میں دل چسپی تھی، یہ جاننے میں کوئی دل چسپی نہیں تھی کہ امر کب ہوا جاتا ہے۔ چلئے، یوں ہماری جان چھوٹی۔

شوہر اور بیوی میں وہی رشتہ ہوتا ہے جو ادبی تخلیق کار اور نقاد میں ہوتا ہے۔ شوہر ادبی تخلیق کار کی مانند ہوتا ہے اور بیوی نقاد کی طرح۔ یہ واقعہ ہمیں اسی ضمن میں یاد آ رہا ہے۔ اور ہاں، یہ انشائیہ 'لیڈی چیٹرلیز لورز' یا ' کیسانووا' کی محبت کی کہانیوں کی طرح بالکل چھپا کر پڑھئے گا ورنہ آپ جانئے۔ خیر، تو سُنئے۔ ایک ولی اللہ اپنی ریاضت اور تقویٰ کی وجہ سے کمال کو پہنچے ہوئے تھے۔ ان کے مرید ملک بھر میں پھیلے ہوئے تھے۔ دور دراز سے مرید ان کی خدمت اور فیوض سے استفادہ کرنے کے لئے آتے۔ لیکن گھر میں پیرانی صاحبہ کا اپنا مزاج تھا۔ وہ پیر صاحب کے مریدوں کو کاہل، نکھٹو اور نہ جانے کن کن القاب سے نوازتیں اور اپنے شوہر کی ولایت کو تو کسی طور خاطر میں نہیں لاتی تھیں۔ حضرت گھر کی آفت سے بچنے کے لئے مریدوں کے ساتھ کسی گوشۂ عافیت میں چلے جاتے۔ اس بات پر پیرانی صاحبہ کا غصہ مزید بھڑک اُٹھتا۔

ایک دن پیر صاحب عصر کی نماز سے فارغ ہو کر گھر تشریف لائے۔ پیرانی صاحبہ تو پہلے ہی لبریز بیٹھی تھیں۔ حضرت کے دروازے میں قدم رکھتے ہی ان پر ٹوٹ پڑیں۔ کہنے لگیں۔ ''بہت دیکھے تم جیسے ولی۔ تم کیا ولی ہو سکتے ہو۔ ولی تو ایسے ہوتے ہیں جیسے میں نے آج دیکھے۔'' حضرت کو جاننے کا اشتیاق ہوا کہ پیرانی صاحبہ نے کیا دیکھا۔ انہوں نے رغبت سے پوچھا، ''اچھا، بتاؤ تو، ولی کیسے ہوتے ہیں؟'' پیرانی صاحبہ بولیں۔ ''آج جب میں آنگن میں پانی لینے کے لئے گئی تو اچانک آسمان کی طرف نظر اُٹھ گئی۔ کیا دیکھتی ہوں کہ ایک سفید براق لباس پہنے ہوئے بزرگ، نورانی چہرہ، خوبصورت داڑھی، چہرے پر نور کی تجلی، آسمان میں اُڑے جا رہے ہیں۔ ولی ایسے ہوتے ہیں۔'' حضرت نے پوچھا، ''نیک بخت، کیا بتا سکتی ہو کہ یہ کتنے بجے کا وقت ہو گا''؟ پیرانی صاحبہ بولیں، ''تقریباً ظہر کے آس پاس کا وقت تھا۔'' حضرت بولے، ''اری نیک بخت، وہ

میں ہی تھا۔ در اصل مریدوں میں پند و نصیحت کی وجہ سے دیر ہو گئی تو میں نے سوچا کہ نماز میں دیر نہ ہو جائے اس لئے اُڑتا ہوا مسجد کی طرف چلا گیا۔'' پیرانی صاحبہ کے چہرے پر چند لمحے کے لئے شکست خوردگی نمودار ہوئی لیکن فوراً سنبھالا لیتے ہوئے وہ چمک کر بولیں، ''اچھا؟ وہ تم تھے؟ تبھی تو میں کہوں کہ ٹیڑھے ٹیڑھے کیوں اُڑ رہے تھے۔'' اسے آپ منفی سمت نہ لے جائیے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک دوست بولے، 'یار، یہ بیویاں بڑی شجیع اور بہادر ہوتی ہیں۔' ہم ہنس دئے۔ انہوں نے استعجابیہ انداز میں ہماری طرف دیکھا۔ ہم نے وضاحت کی، 'بھائی، یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں؟ معمولی کاکروچ اور چھپکلی سے ڈر جانے والی عورت بہادر اور شجیع کیسے ہو سکتی ہے؟'

وہ بولے، 'کیا شادی کے دن آپ اپنی بیوی کو لانے کے لئے اکیلے گئے تھے؟'

ہم نے زور سے (اتنی زور سے کہ گردن میں موچ آتے آتے رہ گئی) نفی میں سر ہلا کر کہا، 'ارے صاحب، ایسا کیسے ہو سکتا ہے؟'

انہوں نے پوچھا، 'کتنے لوگ گئے تھے اسے لانے؟'

ہم نے تھوڑا سوچ کر کہا، 'صرف خاندان والے ہی کم از کم سو ڈیڑھ سو ہوں گے۔'

وہ بولے، 'اس کا مطلب سینکڑوں لوگ بارات میں شامل تھے۔ یعنی تم بیچاری اُس اکیلی عورت کو لانے کے لئے سینکڑوں لوگوں کو لے کر گئے۔ اور اُدھر اُس 'بِنتِ اسد' کو دیکھو کہ شام میں بغیر کسی کو ساتھ لئے، پہلی مرتبہ تمہارے ساتھ، سینکڑوں اجنبی لوگوں کی ہمرہی میں، تنِ تنہا، کس خسروانہ شان سے بڑی جرات و شجاعت کے ساتھ چلی آئی۔ پھر بھی اس کی بہادری کو تسلیم نہیں کرتے؟'

ہم خاموش ہو رہے۔ انہیں کیا بتاتے کہ ہم تو بیوی کی بہادری کو برسوں سے، روزِ اول ہی سے، اور روزانہ تسلیم کرتے آرہے ہیں۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ بھی سچ ہے کہ ٹی وی کے بغیر انسان زندگی گزار سکتا ہے لیکن بیوی کے بغیر نہیں۔

محمد رفیع الدین مجاہد

محمد رفیع الدین مجاہد ۱۵, جولائی کو قصبہ پنچر ضلع اکولہ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے (اردو) اور بی ایڈ کرنے کے بعد اکولہ میں تدریسی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

ادبی مضامین، تبصرے اور بچوں کے لئے کہانیاں لکھنا ان کے ادبی مشاغل میں شامل ہیں۔ انہوں نے مزاحیہ مضامین بھی تحریر کئے جو اخبارات و رسائل میں شائع ہو چکے ہیں۔ ان کے مزاحیہ مضامین کا مجموعہ زیرِ ترتیب ہے

رابطہ: 8087382570

حلال خور

محمد رفیع الدین مجاہد

معاف کیجیے گا! دنیا رنگ برنگی ہے۔ شخصیات کے اعتبار سے بھی اور خصوصیت کے اعتبار سے بھی۔ اسی ضمن میں کہہ رہا ہوں کہ اگر حرام خور ہو سکتا ہے۔ تو کوئی حلال خور کیوں نہیں ہو سکتا؟ آپ کہیں گے کہ دونوں میں تو فرق ہے۔ آپ کی بات بجا ہے۔ بے جا نہیں۔ لیکن بات فرق کی نہیں ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ حرام خور، حرام خور ہوتا ہے۔ اور حلال خور، حلال خور ہوتا ہے۔ مگر یہ بھی تو ایک بحث ہے کہ کیا کوئی نصف بھی ہوتا ہے؟

آئیے اصل مقصد کی طرف جو حلال خور سے منسوب ہے۔ بات ان دِنوں کی ہے۔ جب چاروں طرف شدت کی سردی پڑ رہی تھی۔ ٹھنڈی ٹھنڈی ہوائیں چل رہی تھیں۔ نہیں بہہ رہی تھیں کہنا زیادہ مناسب رہے گا۔ کیوں کہ ہوا ٹھنڈی ہو یا گرم پھر معتدل، ہوا بہہ ہی سکتی ہے چل نہیں سکتی۔ اس کے پاؤں جو نہیں ہوتے (ہے نا مزے کی بات) ٹھنڈ سے لوگوں کا بُرا حال تھا ویسے ماضی اور مستقبل میں بھی کوئی خاص فرق نہیں تھا(لوگوں کے یا سردی کے خود ہی سمجھ لیجیے!) ایک جگہ آگ کا الاؤ روشن تھا اور لوگ اسے گھیرے یوں بیٹھے تھے جیسے مکھیاں گُڑ کو گھیر کر اور چپک کر بیٹھتی ہیں۔ طرح طرح کے لوگ تھے اور طرح طرح کی باتیں ہو رہی تھیں۔ وہ بھی ان لوگوں میں شامل ہو گیا۔ (وہ یعنی ہمارے اس مضمون کا عنوان۔ اتفاق سے وہ گوشت پوست

کا ہے۔) کتنی ٹھنڈ لگ رہی ہے۔ ایک آدمی دونوں ہتھیلیوں کو آپس میں رگڑتے ہوئے بولا۔ ٹھنڈ یا سردی دوسرے نے پوچھا۔ سردی ہی کہنا ٹھیک ہو گا۔ تیسرے نے جواب دیا۔ لگ رہی ہے یا بج رہی ہے؟ چوتھے نے جاننا چاہا۔ اب ٹھنڈ لگ رہی ہے یا بج رہی ہے اور سردی لگ رہی ہے یا بج رہی ہے کہ علاوہ اور کیا کہا جا سکتا ہے؟ وہ پہلی دفعہ ان لوگوں کی باتوں میں بھی شامل ہو گیا۔ اجنبی تھا اور ڈر رہا تھا کہ کہیں اسے یہاں سے بھگا نہ دیا جائے۔ ہاں بھلا اور کیا کہا جا سکتا ہے! کسی نے گویا سبھوں کے دلوں کی بات کہہ دی۔ سب لوگ اسی طرف دیکھنے لگے۔ میرے خیال سے سردی محسوس ہو رہی ہے۔ یا ٹھنڈ محسوس ہو رہی ہے کہنا زیادہ مناسب ہو گا۔ اس نے کہا۔ ہاں بابو! بالکل ٹھیک کہا۔ بھلے آدمی معلوم ہوتے ہو۔ کیا نام ہے تمھارا؟ ایک بوڑھے نے پوچھا۔ جی حلال خور۔ کیا!!! سبھوں کو حیرت سے بھی زیادہ حیرت کا شدید جھٹکا لگا۔ یہ کیسا نام ہے بھئی؟ ایک بوڑھے نے آنکھوں کو مسلتے ہوئے پوچھا۔ حیرت کے عالم میں غوطہ خوری کی وجہ سے آنکھوں پر لگا چشمہ اتارنا بھی مناسب نہیں سمجھا تھا۔ کیسا ہے یہ تو مجھے نہیں معلوم۔ مگر ہے میرا نام ایسا ہی اس نے گویا اپنے ساتھ اپنے نام کا بھی تعارف کروا دیا۔

خیر، جیسا بھی نام ہو۔ ہمیں اس سے کیا! یہ بتاؤ کہ آخر اتنی سردی محسوس کیوں ہو رہی ہے؟ ایک نے پھر سے سوال داغا۔ کیوں کہ اتنی گرمی جو محسوس نہیں ہو رہی ہے! اس نے جواب دے کر سبھوں کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔ اس بیچ آگ الاؤ سُست پڑ رہا تھا۔ شاید باتوں باتوں میں کسی کا دھیان اس طرف نہیں گیا تھا۔ موسم سردی کا ہو گا تو ظاہر بات ہے کہ سردی ہی پڑے گی نا! کسی کا دم دار بات کہی۔ وہ تو ٹھیک ہے۔ اس کے علاوہ کل پانی بھی تو آیا تھا نا! میرا بیٹا جو ایک انگریزی اسکول میں پڑھتا ہے۔ کھڑ کی میں سے چلا چلا کر کہہ رہا تھا۔ اِٹس رے ننگ۔ اِٹس رے ننگ۔ ایک پڑھے لکھے سابق اردو اسکول کے ثا بت ہیڈ ماسٹر صاحب نے بارش کا ذکر کر دیا۔ بارش ہو رہی ہے۔ بارش ہو رہی ہے۔ اس نے کسی سے پوچھے بغیر انگریزی کا اردو میں ترجمہ کر دیا۔ کیا! پھر تو الاؤ کی آگ ٹھنڈی ہو جائے گی۔ اور ہم بھی گیلے ہو جائے گے۔ چلو اپنے اپنے گھروں پر چلتے ہیں۔ ایک بوڑھے نے اٹھتے ہوئے سبھوں کو اٹھانا اور اٹھا کر بھگانا چاہا۔ ارے ابھی نہیں کل۔ کل بارش ہو رہی تھی۔ ایسا ان کا پوتا جسے وہ بیٹا سمجھتے ہیں کہہ رہا تھا۔ ایک نوجوان نے زور دار آواز دی اور اشاروں کے ساتھ سمجھایا۔ وہ بوڑھا شانت ہو گیا۔ پھر سبھی شانت ہو گئے اور پتہ نہیں کیوں؟ خاموش بھی ہو گئے کوئی لکڑی سے انگارے اِدھر اُدھر کرنے لگا تو کوئی بار بار نہارنے لگا۔ اور وہ بھی ایک دوسرے کو۔

ارے بھائی یہ آگ تو بجھی جا رہی ہے۔ اس کا کچھ انتظام کرو! اس نے گفتگو کے سلسلے کو زندہ کرنا مناسب خیال کیا۔ سبھوں نے اپنی اپنی ساس لا کر روشن کیا تھا بھیّا! ایک آپ ہی حلال خور تھے جو بغیر ساس کے گھس بیٹھے تھے۔ گھس بیٹھے، کو کہنے والے نے اتنا گھِس کر کہا جیسے بے چارہ حلال خور واقعی گھس پیٹھی ہے جو فوج کی موجودگی میں بھی ملک میں گھس آتے ہیں۔ ساس کو آگ میں ڈالنے کا ذکر کر کے حلال خور کو مشکل میں ڈال کر خوفزدہ کر دیا تھا۔ اور فرار ہونے کے واسطے بغلیں جھانک رہا تھا تاکہ پر تول سکے۔ ان کا مطلب اصلی ساس، جو بیوی کی ماں ہوتی ہے۔ سے نہیں بابو! یہاں کی بولی میں سب لوگ اپنا اپنا ھن کوڑا کرکٹ جمع کر کے لاتے ہیں اور اسے آگ میں ڈال کر اس طرح جلاتے ہیں اور اسے ساس لانا کہا جاتا ہے۔ شت لہر چل رہی ہے نا! ایک بوڑھے نے بڑے پیار سے سمجھایا تو اس نے بھی راحت کی سانس لی کہ ساس کو لانے سے جو بچ گیا تھا۔ اس عمر میں تمھیں اتنی رات کو کڑاکے کی ٹھنڈ میں جاگنے اور ساس کا بچاؤ کرنے کی کیا ضرورت آپڑی کاکا! ایک من چلے نے چٹکی لی اور سب ہنس پڑے۔ اس میں ضرورت والی کون سی بات ہے رے! میری گھر والی سسرال گئی ہے اس لیے میں یہاں بیٹھ کر جاگ رہا ہوں۔ بوڑھے نے جواب دیا۔

عورت میکے جاتی ہے۔ یہ سنا تھا، لیکن سسرال جاتی ہے پہلی مرتبہ سن وہ ہوں۔ اسی من چلے نے اعتراضاً کہا۔ اصل میں۔ مَیں رہتا ہوں اپنی سسرال میں گھر داماد بن کر اب میری گھر والی کو کچھ کام ہو گا تو وہ چلی گئی۔ اس کے ساس سسر سے ملنے۔ اس بات کو اتنا لمبا بلکہ اس قدر لمبا کھینچنے کی کیا تک ہے بھئی؟ کیوں؟ درست کہہ رہا ہوں نا میں! کیا نام ہے تمھارا بابو؟ جی بالکل درست فرمایا۔ ویسے یہاں بیٹھ کر تاپ کرنے یا آگ تاپنے یا پھر سینکنے والی بات کو بھی اتنا زیادہ بلکہ مزید لمبا کھینچنے کی اب کوئی ضرورت نہیں محسوس کی جانی چاہیے اور اپنے گھروں میں جا کر گرما گرم چائے پی کر موٹی روئی کی گودڑی اوڑھ کر خراٹوں سے ہم آغوش ہو جانا چاہیے۔ اس نے لمبائی کو گھٹانے کی چاہ میں مزید لمبا کرتے ہوئے کہا اور سب اُٹھ کھڑے ہوئے۔ چلتے چلتے ہر ایک یہ سمجھ رہا ہو گا کہ وہ ہم سے کسی ایک کے ہاں مہمان ہے اور اسی کے ساتھ جا رہے۔ تاکہ حلال خور کی ہوا خوری پر کوئی حرف نہ آئے۔

محمد ایوب

محمد ایوب ۱۵ ستمبر ۱۹۵۳ کو کامٹی ضلع ناگپور میں پیدا ہوئے، ابتدائی تعلیم کامٹی کے اسکولوں میں حاصل کرنے کے بعد

انھوں نے ممبئی گریجویشن اور پوسٹ گریجویشن کیا۔ محکمۂ پوسٹ اینڈ ٹیلی گراف اور پھر تبادلے کے بعد ایر انڈیا کی ملازمت کے سلسلے میں ممبئی میں رہے۔ ناگپور سے بحیثیت ڈپٹی مینیجر سبک دوش ہوئے۔
ادبی تقریبات کی نظامت اور سماجی خدمات کے لئے مشہور ہیں۔ ان کی کتاب ''نقشِ تحریر'' ۲۰۱۹ میں منظرِ عام پر آئی جس میں دیگر مضامین کے علاوہ چند فکاہیہ تحریریں بھی ہیں۔

چاند رات کی سیر

محمد ایوب

آپ نے چاندنی رات کی سیر کے بارے میں تو بہت سنا ہو گا بلکہ بنفس نفیس اس کا لطف بھی اٹھایا ہو گا، ہم بھی اس سے لطف اندوز ہو چکے ہیں، مگر ہمیں چاندنی رات کی اہمیت کا احساس اس وقت تک نہیں ہوا تھا جب تک کہ پانچویں یا چھٹی کلاس میں اس پر مضمون نہیں لکھوایا گیا۔ ہمیں یاد ہے ہم نے اس مضمون پر اپنا سارا زور قلم صرف کر دیا تھا اور فصاحت اور بلاغت کے دریا بہا دیے تھے۔ ہمارے ایک ہم جماعت نے تو جوشِ بیان میں صفحے کے صفحے سیاہ کر دیے۔ ٹیچر نے دلچسپی اور تجسس کے ہاتھوں مجبور ہو کر سارا مضمون پڑھ ڈالا اور پوچھا ''برخوردار! اس میں چاندنی رات کہاں ہے'' تو لڑکے نے ندامت سے سر کھجاتے ہوئے کہا، ''سر! وہ ڈالنا تو میں بھول ہی گیا۔''
چاند کے تعلق سے جو باتیں مشہور ہیں وہ اس کے شباب یعنی چودھویں رات کی ہیں۔ قدیم شعرا نے چاند سے اپنے محبوب کی مشابہت ثابت کرنے کے لیے اپنی ساری انرجی صرف کر دی۔ بعضوں نے تو معشوق کے مقابلے میں چاند کو بھی کمتر ثابت کرنے کی سعیِ بلیغ کی۔ بعد میں جب چاند کے بارے میں سائنسی حقائق سامنے آئے تو یہ خیال ہوا کہ جو ہوا، سو ہوا، اب شاید شعرا چاند کا پیچھا چھوڑ دیں گے، مگر جب انشا جی کی مشہور غزل پڑھی اور سنی کہ:
کل چودھویں کی رات تھی شب بھر رہا چرچا ترا
کچھ نے کہا یہ چاند ہے کچھ نے کہا چہرا ترا
تو ہمیں یقین ہو گیا کہ چاند کے طلسم سے انسان کا چھٹکارا پانا ممکن نہیں۔ مشہور جدید شاعر شہر یار نے اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔
سب کچھ بدل گیا ہے مگر لوگ ہیں مصر
مہتاب ہی میں صورتِ جاناں دکھائی جائے
۔ مرزا غالبؔ نے بھی ایک طویل قصیدہ لکھا اور چاند سے کچھ دلچسپ سوالات پوچھے:
ہاں مہِ نو سنیں ہم اس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام
اب یہ تو نہیں معلوم کہ چندا ماما نے چچا غالب کو کیا جواب دیا۔ مگر مہ نو خمیدہ صورت اب بھی مجسم سوالیہ نشان بنا ہوا ہے۔ حالاں کہ چاند کا حسن اس کی تکمیل میں سمجھا جاتا ہے مگر عید کا چاند صرف ایسا ہے جو تھوڑی دیر کے لیے روشن ہوتا ہے مگر لوگوں کے دماغ کی بتّیاں جلا دیتا ہے اور دلوں کے چراغ روشن کر دیتا ہے۔ لیکن کچھ ایسے بھی ہیں جن کے لیے رویت ہلال کے علاوہ بھی عید منانے کا دوسرا جواز ہے۔ جیسا کہ شاعر کہتا ہے:
انتیسویں کو رخ کی ترے دید ہو گئی
اب چاند ہو یا نہ ہو مری عید ہو گئی
ہمارا گمان ہے کہ عید سے زیادہ لوگ چاند رات مناتے ہیں یا پھر چاند دیکھتے ہی بے تحاشہ عید منانا شروع کر دیتے ہیں۔
ہمارے بچپن میں چاند رات کا منظر کچھ اور ہی ہوتا تھا۔ ان دنوں ماہ رمضان کی قصیدہ خوانی کا زور تھا۔ بچّوں اور بڑوں کی الگ الگ ٹولیاں بنتی تھیں جو سارا مہینہ پرائمری اسکول کے ماسٹروں سے جو اتفاق سے شاعر بھی ہوا کرتے تھے۔
ماہِ رمضان کی عظمت میں فلمی دھنوں پر قصیدے لکھواتے اور مہینے بھر اس کے گانے کی مشق کرتے۔ یہ قصیدے صرف رمضان کی عظمت اور اس کے ہجر کی داستان ہی نہیں سناتے تھے بلکہ اس میں شعرا حضرات نے روز مرّہ کے مسائل اور دنیا جہان کی دلچسپ حکایات بھی سمو دی تھیں۔ اس وقت صرف خوش آواز اور بہترین ترنم والے بچے اور بڑے ہی اس میں بار پاتے تھے۔ بچے اپنے خوشحال رشتے داروں کے گھر لالٹین لیے ہوئے پانچ، سات کی تعداد میں پہنچ جاتے، اور کچھ نہ کچھ لے

کر ہی ٹلتے۔ عید منانے کے لیے ان کا یہ اضافی سرمایہ ہوتا تھا۔ بڑوں کی ٹولیاں بھی خاصی بڑی ہوتیں۔ ان میں دو یا تین ایسے لوگ ہوتے جو زیادہ بلند آواز ہوتے اور سوالی کہلاتے تھے۔ وہ قصیدے کے بول اٹھاتے اور باقی جو جوابی کہلاتے اسے ایک ساتھ دہراتے۔ ایک سماں بندھ جاتا۔ چلتے لوگ ٹھہر جاتے۔ غریب سامعین داد دیتے اور امیر انھیں نقد انعام سے نوازتے۔ یہ لوگ چوراہوں اور بازاروں میں رکتے ہوئے چلتے۔ اگر قدردان مل گئے تو ایک ہی جگہ کئی کئی گھنٹے گزار دیتے۔ اس وقت تفریح کے وسائل بہت کم تھے۔ اس لیے اس کی خوب پذیرائی ہوتی تھی۔

بازاروں میں اتنی بھیڑ بھاڑ نہیں ہوا کرتی تھی۔ اکّا دکّا تلے ہوئے پاپڑ اور بھجیے کی دُکانیں ہوا کرتی تھیں۔ کیا زمانہ تھا ایک پاپڑ میں سارا گھر آسودہ ہو جایا کرتا تھا۔ ان دنوں ریڈی میڈ کا رواج نہیں تھا۔ چاند رات میں تو درزیوں کا ناک میں دم ہو جاتا تھا۔ یہ طبقہ خشوع و خضوع سے مہینہ بھر ۳۰ویں روزے والی عید کی دعا مانگتا تھا۔ بازاروں میں لڑکیاں بالیاں گلے کی مالا، کانوں کے نقلی زیور، کانچ کی چوڑیاں اور بالوں کے لیے ربن خریدتی پھرتی تھیں۔

زمانے نے کروٹ بدلی، خوشحالی آئی۔ ریڈیو کی جگہ ٹی وی آیا۔ اب گلے بازی کے دن لد گئے۔ لوگ قصیدے اور قصیدہ پارٹیوں کو بھولنے لگے۔ پاپڑ بھجیے کی جگہ، سموسے کباب اور سیخ و نان کی دُکانیں آ گئیں اور ترقی ہوئی پہلے بریانی کی جگہ پلاؤ کا رواج تھا وہ بھی کسی بڑے رئیس کی شادی میں۔ اب گھر گھر بریانی بننے لگی۔ لوگوں کا ذوق بدلا، بازاروں میں بطور خاص چاند رات میں بریانی کی دیگوں پر دیگیں چڑھنے لگیں۔ تولا، نان، کباب اور تندوری مرغ کی اشتہا انگیز خوشبو سے سارا بازار مہک اٹھتا ہے۔ لوگوں کا ہجوم اشیائے خورد و نوش پر اس طرح ٹوٹ پڑتا ہے جیسے ابھی ابھی آسمان سے ''منّ و سلویٰ'' اترا ہو۔ عوام کو ''کُلُو وَ الشْرَبُو'' کے سوا کچھ سجھائی نہیں دیتا۔ خواتین کے بازار مانو، زمانۂ قدیم کے مینا بازار کا منظر پیش کرتے ہیں۔ جہاں خواتین کی آرائش و زیبائش کی ہر چیز دستیاب ہے۔

بازار میں اتنی بھیڑ کے تل دھرنے کو جگہ نہیں۔ گئی رات تک بازار میں لوگوں کا ہجوم دیکھ کر لگتا ہے کہ لوگ جب چاند رات میں ہی اپنے دل کے سارے ارمان نکال لیں گے تو عید کیا خاک منائیں گے، مگر وہ جو چچا غالب کہہ گئے ہیں کہ:

بہت نکلے مرے ارمان لیکن پھر بھی کم نکلے

سید اسد تابش

سید اسد علی جن کا قلمی نام سید اسد تابش ہے یکم جولائی ۱۹۷۳ کو بارسی ٹاکلی ضلع اکولہ میں پیدا ہوئے۔ ایم اے بی ایڈ تک تعلیم حاصل کی اور اب اسی شہر کے ایک تعلیمی ادارے، بابا صاحب دھابے کر ودھیالیہ و جونیئر کالج میں مدرس ہیں۔ طالبِ علمی کے زمانے ہی سے انھیں لکھنے کا شوق رہا ہے۔ اسکول میں کئی یک بابی ڈرامے پیش کر چکے ہیں۔ نثر اور شاعری میں طبع آزمائی کرتے ہیں۔ بچوں کے لیے لکھی گئی ان کی کہانیاں، ڈرامے اور مزاحیہ مضامین ملک کے مشہور رسائل مثلاً ماہنامہ امنگ، بچوں کی دنیا، الفاظِ ہند اور شگوفہ میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ ادبی حلقوں میں مشہور ہونے کے علاوہ وہ ایک مقبول مدرس بھی ہیں۔

بدلتے موسم

سید اسد تابش

یوں تو سال میں تین موسم ہوتے ہیں لیکن لوگ، پت جھڑ، ساون بسنت، بہار میں سے کسی ایک کا جب ذکر کرتے ہیں تو اسے بھی چوتھا موسم قرار دیتے ہیں۔ بعض لوگوں کے نزدیک پانچواں موسم پیار کا ہوا کرتا ہے۔ شاید اس بات میں یہ اشارہ موجود ہے کہ پیار کا بھی کوئی بھروسہ نہیں کب موسم کی طرح بدل جائے۔ ہمارے نزدیک تو یہ موسم کم اور موسمی بخار زیادہ ہے۔ سبھی موسموں کا تغیر و تبدل بھلا لگتا ہے۔ جبکہ دنیا میں حکومتیں بدلتی ہیں، حالات بدلتے ہیں، نیتیں بدلتی ہیں تکنولوجی بدلتی ہے، فیشن بدلتے ہیں اور اقدار بھی بدلتی ہیں۔ نہ جانے بدل جانے کی یہ ادا ان چیزوں نے موسموں سے سیکھی ہے یا موسم کو

بھی ان ہی نے بگاڑا ہے۔

ہمارے کرم فرما انیس صاحب کو مختلف علاقوں کی مشہور الوانِ نعمت کا ذائقہ اچھا لگتا ہے۔ اسی لیے وہ مختلف علاقوں کی سیر کر کے جہاں جو چیز مل جائے سیر ہو کر کھاتے ہیں۔ انھیں سیر کا اصل مزہ دستر خوان ہی پر دستیاب ہوتا ہے۔ ہم جب بھی ہر نئے موسم کی تبدیلی پر خوشی کا اظہار کرتے ہیں تو وہ کہتے ہیں: بھائی دنیا میں اتنی چیزیں ہیں لطف اندوز ہونے کے لیے، آپ ہیں کہ موسم کی تبدیلی ہی کے مزے میں گم ہیں اور پھر وہ بارہا سنایا ہوا شعردہراتے ہیں جس میں چند کلیوں پر قناعت کر جانے کی مذمت کی گئی ہے۔ ظاہر ہے ہمارا ذوق ان سے جدا ہے اور ہمیں ہر بدلتا ہوا موسم اس لیے بھی پسند ہے کہ ایک عربی محاورے کے مطابق ہر نئی چیز لذیذ ہوا کرتی ہے۔

ایک مرتبہ ہمارے ایک شناسا نے جو ذرا اونچا سنتے تھے ہم سے شکایتاً کہا، یار ملتے نہیں ہو آج کل؟ ہمیں جلد کوئی معقول بہانا سوجھا نہیں۔ سنبھلتے ہوئے کہا: ''سردی پڑ رہی ہے، دن چھوٹے ہو گئے ہیں'' ۔ وہ اپنے کان پر ہاتھ رکھ کو بولے، کیا کہا دل چھوٹے ہو گئے ہیں؟ ہم نے تصحیح کی تو کہنے لگے۔ زندگی میں پہلی بار سن رہا ہوں، بالکل نئی اور منفردو جہ ہے۔ دوستوں سے نہ ملنے کا نیا بہانا ڈھونڈ لیا تم نے۔ ۔ ۔

ایک بزرگوار مئی کی گرم دوپہر میں ہمیں بینک میں ملے۔ یوں تو وہ بات بات پر جھلاہٹ کا شکار ہو جایا کرتے تھے، مگر ہماری طرف محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے ''۔ کہو کیسے ہو،'' بہت جلدپتہ چل گیا کہ انھیں بینک کا کوئی فارم ہم سے بھروانا تھا۔ خوشامد بھرے لہجے میں کہنے لگے: ''برخوردار! آج کل ملاقات نہیں کرتے۔ کہاں مصروف رہتے ہو؟'' ہم نے مسکرا کر ان کے فارم پر ایک نگاہِ غلط انداز ڈالی اور جیب سے پین نکالتے ہوئے کہا: ''گرمی کے دن چل رہے ہیں نا؟'' حسب عادت غصے سے کہا: ''پھر؟ گرمی کھاتی ہے کیا تم کو''۔ ہم نے کہا، ''نہیں، در اصل سورج ہم پر کچھ زیادہ مہربان ہے۔ اس پر انھوں نے طنزیہ لہجے میں کہا: کیا تم سوریہ ونشی ہو؟''

اس کا جواب کیا دیتے۔ خاموشی سے فارم بھر کر ان کے حوالے کیا اور چلتے بنے۔

بارش کے موسم میں گھومنا پھرنا تو گویا ہماری ہابی ہے، کسی سے مڈ بھیڑ کا خطرہ جو نہیں رہتا۔ بارش کے ڈر سے لوگ گھروں سے نکلنے کی ہمت نہیں کرتے۔ بارش میں چھتری لے کر نکلنے کی ایک اور بھی وجہ ہے۔ جن کے پاس چھتری نہیں وہ رکے رہتے ہیں اور آپ چلتے جاتے ہیں۔ ایک بارش ہی کیا زندگی میں بھی اس امتیازی شان سے چلنا ہمیں ایک الگ قسم کے سرور سے دوچار کرتا ہے۔

ایک مرتبہ ایام نو جوانی میں ایک بارات کے ساتھ شادی میں جانے کا اتفاق ہوا۔ بارات کی ذمہ داری یعنی باراتیوں کو گاڑی میں بٹھانا، جائے نوشہ پر کھانے پینے اور دیگر انتظامات ہمارے رشتے کے دو ماموؤں کے ذمے تھے۔ بارات میں ان کا طنطنہ دیکھ کر ہم رشک کرتے جاتے تھے۔ وہ بھی ہماری کیفیت کو جان گئے تھے اسی لیے ہمیں ادھر ادھر کے کاموں میں لگا دیا کرتے تھے۔ ہم ان کا قہر کم کرنے کے لیے کچھ کہتے تو جواب ملتا۔ آج موسم بہت خوشگوار ہے۔ ہم نے جب بھی جب بھی کوئی بات کرنی چاہی انھوں نے تان موسم ہی پر توڑی ہمیں بے اختیار یہ شعر یاد آیا۔

موسم ہی پہ ہم کرتے رہے تبصرہ تا دیر\
دل جس سے دکھے ایسی کوئی بات نہ آئی

اس دن محسوس ہوا کہ موسم کا سب سے بڑا فائدہ، جو لوگوں کی نظر سے پوشیدہ ہے، یہی ہے کہ ہم جب کسی سے ملیں تو دل دکھانے والی باتوں سے بچ نکلنے کے لئے موسم کے تذکرے سے بہتر کوئی علاج نہیں۔ یوں تو یہ انگریزوں کا شیوہ ہے کہ وہ ملتے ہی سب سے پہلے موسم کی بات کرتے ہیں۔ ان کا دیکھا دیکھی ہم نے بھی یہی طریقہ اپنا لیا۔ ورنہ ہمارے گاؤں اور قصبوں میں عام طور پر یہ رواج رہا ہے کہ لوگ ایک دوسرے سے ملتے تو سب سے پہلے خیریت دریافت کرتے اور یہ پوچھتے کہ تم نے کھانا کھا لیا یا نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس رواج میں ہماری تہذیب اور اس سے زیادہ ہماری غربت جھلکتی ہے مگر اس سے زیادہ لوگوں کا خلوص اور انسانی ہمدردی اس میں پوشیدہ ہے۔

بات چلی تھی ان ماموؤں کی جو موسم کی تعریف میں مگن تھے، اچانک موسم نے کروٹ بدلی، موسلا دھار بارش شروع ہو گئی، پتہ چلا وہ دونوں بجلی سے بچوں سے بھی زیادہ ڈرتے ہیں اسی لیے کسی کمرے میں جا کر چھپ گئے ہیں ہم وہاں پہنچے اور موسم کا راگ چھیڑ دیا جو انھیں بالکل پسند نہیں آیا اور وہ بار بار کہتے میاں تم یہاں سے جاؤ ہمیں چین سے بیٹھنے دو، ہم کہاں چپ رہنے والے تھے دیر تک بجلی سے مرنے والوں کے ایک سے ایک خطر ناک واقعات سنا سنا کر انھیں ہلکان کرتے رہے آخر انھوں نے دھمکی دے ڈالی کہ یہاں سے نہ ٹلے تو ہم سے برا کوئی نہ ہو گا۔ مجبوراً ہمیں بدلتے ہوئے موسم کی طرح وہاں سے رخصت ہونا پڑا۔

فردوسِ گوش

ودربھ میں مزاحیہ شاعری

احسن حسین شیخ شاہ محمد
طرفہ محمد پناہؔ
حامد۔ سید غلام رسول عرف جیا میاں پیر زادہ
عرفان۔ سید میاں عرف چھجو میاں
محزوں۔ میر حیدر
طرب۔ انبا پر شاد
حاذق۔ محمد عظیم
حافظ محمد ولایت اللہ
عبد الصمد جاوید(علامہ گنبد)
فیاض افسوس
ناظم انصاری
جمال ادین جملوا
سر فراز کاتب
نواب سر خاب اکولوی
فنی ایوت محلی
عبد الحفیظ لقب عمران، اچلپور
فوجی جلگانوی
غنی اعجاز، اکولہ
رفیق شاکر، کھامگانوی
انوار احمد قریشی نشتر، اکولہ
عظیم۔ محمد عظیم ناگپوری
منہ پھٹ ناگپوری
مسعود احمد جھانپڑ، ناگپور
مفلس قارونی
اقبال خلش
خواجہ سعید الدین اکولوی، سر خاب
سوامی کشنانند۔ سوختہ
خواجہ زین العابدین۔ نایاب
حیدر بیابانی
متین اچلپوری
فصیح اللہ نقیب، اکولہ
ح خ جھنجھٹ اکولوی
ریاض الدین کاملؔ
محمد توحید الحق، کامٹی
نادر بالاپوری
انیس احمد شوق

وحیدّ شیخ۔ ناگپور
التمش شمس اکولوی
عقیل ساحر
۔ بشیر بشر، بدنیرہ
ڈاکٹر عمران علی خاں عمران، اکولہ
جمیل انصاری
شاداب انجم، کامٹی

نام دار خاں پنّی

ہجو

جب مچھّو میاں گھر سے کھا پان نکلتے ہیں
اور جورو کے ہاتھوں سے حیران نکلتے ہیں
مونچھوں کے تئیں اپنے یوں تان نکلتے ہیں
گویا کہ دلوں کے سب ارمان نکلتے ہیں
جیسے میں بھی شاعر ہوں یوں آن نکلتے ہیں
جیوں گنبد بے در سے شیطان نکلتے ہیں
استاد جو ہیں ان کے یوں دھج سے نکلتے ہیں
کسبی کی طرح گھر سے یوں سج کے نکلتے ہیں
جس طرح ستی حاجی خوش حج سے نکلتے ہیں
تعلیم دی نوچی کو کیا کج کے نکلتے ہیں
جیسے میں بھی شاعر ہوں یوں آن نکلتے ہیں
جیوں گنبد بے در سے شیطان نکلتے ہیں

احسن حسین شیخ شاہ محمد

جو دیکھوں تو سیں تیرے آنے کا ڈھب
نہ دیکھوں کبھو تیرے جانے کا ڈھب
جِنے تم کو دیکھا سو تیرا ہوا
نہ تجھ سا کسی کا ہے آنے کا ڈھب
شکر ہے زباں میں، زہر دل کے بیچ
پڑا اب کے ایسا زمانے کا ڈھب
لٹک میں ڈھلک تیری ہے خوش نما
نہ ایسا ہے موتی کے دانے کا ڈھب
نہ کر ترش روئی کسو سے کبھی
یہی شیرنی کے ہے کھانے کا ڈھب
طلسمِ جہاں کو اگر سوچئے
تو ہے پتلیوں کے نچانے کا ڈھب

کہاں تک تو احسنؔ کرے گا رقم
فقط یہ جہاں ہے فسانے کا ڈھب

طرفہ محمد پناہؔ

ہار موتی کا جو اس کے گلے سے ٹوٹ جائے
قطرۂ شبنم زمیں پر گر کے گل چھوٹ جائے
اپنی لیلیٰ کو نہ دیکھے ایک لحظہ گر کوئی
بن کے مجنوں واسطے لیلیٰ کے وہ چوکھوٹ جائے
مار کر فرہاد تیشہ غم میں شیریں کے موا
سر ہوا ٹکڑے گویا پتھر سے کوئی کوٹ جائے
گل سے بلبل گر جدا ہو جائے تو یہ جان لو
پارہ پارہ ہو جگر گل سے اگر وہ چھوٹ جائے
گر کوئی بولے مرے کو یاد جاناں نے کیا
دوڑ سر سے جائے طرفہؔ بول کر کوئی جھوٹ جائے
دل شکستہ نہ جڑے کرتے رہو تم توڑ توڑ
جوڑ دیکھا تو بھلا لعلِ بدخشاں پھوڑ کر

حامد۔سید غلام رسول عرف جیا میاں پیر زادہ

دستِ بلوریں پہ جب رنگ رچائی مہندی
خونِ عاشق کے تئیں جوش میں لائی مہندی
ایک زمانہ ہوا پر نور یدِ بیضا سا
مٹّھیاں کھول کر جس وقت توڑائی مہندی
آپ کو پیسنا اور غیر کو کرنا رنگیں
سب سے الفت میں زیادہ نظر آئی مہندی
چشم امدادؔ سے کیوں کر نہ ہو خوں جاری
ہاتھ سے غیر کے جب اوس نے لگائی مہندی

عرفان۔ سید میاں عرف چھجو میاں

ہو کے تیار چلے تیز قدم ٹپ ٹپ
حاجیاں حج کے لیے سوئے حرم ٹپ ٹپ ٹپ
صید کیا ایسا گرفتار ہوں مرغانِ چمن
دیدے کرتے ہیں سب دام میں دم ٹپ ٹپ ٹپ
واقعہ سن کے یہ سب ان کی زباں سے اپنے
اشک خونبار ہوئے دیدۂ نم ٹپ ٹپ ٹپ
پوچھا کیا تجھ پہ گزرتا ہے دِوانے سچ کہہ
حالِ دل کہہ نہ سکے رو دئے ہم ٹپ ٹپ ٹپ

محزوں۔ میر حیدر

یوں گرے جنبش مژگاں سے گہر ٹپ ٹپ ٹپ
جھڑے جیوں نخل ہلالی سے ثمر ٹپ ٹپ ٹپ
کیونکر آرام ہو اوس شخص کے تئیں اے یارو
ٹپکے برسات میں جس کا گھر ٹپ ٹپ ٹپ
جال کاکل کا تیری دیکھ کے دام و دانہ
مرغ دل گر پڑے سب باندھ کے پر ٹپ ٹپ ٹپ
جی بچانے کے لیے ہاتھ سے اس کافر کے
شیخ کعبہ کو چلا ہانک کے خر ٹپ ٹپ ٹپ

طرب۔ انبا پر شاد

آج وہ غنچہ دہاں ہم سے کشادہ لب ہے
عشق بازی کا مزہ ہم کو میسر اب ہے
دل ہے پابندِ بتاں، میں ہوں خدا کا مطلوب
فیصلہ کیا ہو تکرار و بحث مذہب ہے
شرم آتی ہے زباں سے یہ سخن کہنے کو
چلئے گوشے میں ذرا آپ سے کچھ مطلب ہے
ساقیا مے نہ پلائے، کبھی مانگیں گے نہیں
دھوم مستوں کی طرح مجھ کو مچانا کب ہے
بانگ ہنگامہ نہیں ہے یہ موذن کی طربؔ
ان کو اٹھنے نہ دے پہلو سے ابھی تو شب ہے

حاذق۔ محمد عظیم

آپ واقف ہیں مجھے عرض کی حاجت کیا ہے
نہیں پوشیدہ مرا آپ سے کچھ مطلب ہے
گیسوئے رخ دل دار نظر یوں آیا
قرض خورشید گویا آیا گہن میں اب ہے
قطرے یوں عرق کے آتے ہیں نظر زلفوں میں
کوئی پر وین و عطارد کوئی کوکب ہے
یاد میں زلف کی آیا یہ ضرر پیری میں
کاسۂ چینی میں بال آ گیا میری، اب ہے؟
دیکھتے ہیں وہ مجھے ترچھی نگاہوں سے ضرور
عشق گر ان کو مرا ہے تو بہت غایت ہے
آپ کی حسنِ لیاقت سے بھی معنی ہیں بعید
لے کے دل پاس نہیں کرتے یہ کیا موجب ہے
ہے گناہوں میں سراپا تو اگر چہ غرق آب

حاذقؔ اب تیرا شفیع خاص حبیبِ رب ہے

حافظ محمد ولایت اللہ

مسلم خواتین اور پردہ

ایک دن وہ تھا کہ ہر جانب یہ ہوتی تھی پکار
بیبیاں پر دے میں ہو جائیں کہ مرد آتے ہیں یاں
پھر یہ دیکھا لوگ کہتے تھے بہ آوازِ بلند
مرد کر لیں اس طرف منہ آ رہی ہیں بیبیاں
پارسل بن کر کبھی نکلیں جو تانگہ میں کہیں
اس کے اندر سے نظر آتی تھیں خالی انگلیاں
جھانکنے کا راستے میں اک عجب انداز تھا
کھلتی تھیں اور بند ہو جاتی تھیں فوراً کھڑکیاں
رفتہ رفتہ ہو گیا غائب وہ گھونگھٹ کا رواج
برقع اور پر دہ کہیں حائل نہیں ہے درمیاں
ریل گاڑی میں بھی اب وہ پردۂ چادر نہیں
جب سے رائج ہو گئیں یہ خوبصورت ساڑیاں
رنگ بدلا ہے زمانے نے بڑی تیزی کے ساتھ
آج جلسوں اور تماشوں میں نہیں وہ سختیاں
مرد اب رہتے ہیں پیچھے بیبیاں ہیں پیش پیش
اور سب ان کے لیے کرتے ہیں خالی کرسیاں
عام جلسوں میں صفِ اول میں ہے ان کی نشست
بیوی لکچر دیتی ہے خاموش بیٹھے ہیں میاں
۲۔مسلمان طلبا اور تعلیمی جد و جہد

ہمارے لڑکوں کو کتنا ہی کوئی سمجھائے
ہزار زور لگائے کہ راہ پر لائے
برادرانِ وطن کی مثال دے دے کر
ہزار پند و نصیحت سے ان کو سمجھائے
انھیں پسند نہیں، یہ طریقۂ تعلیم
کہ جو اٹھائے مشقت وہی سند پائے
تلاش ہوتی ہے آسانیاں ملیں گی کہاں
جو مدرسہ میں کوئی نام جا کے لکھوائے
کہیں یہ عذر ہے پنجاب میں پڑھیں گے ہم
کسی کے جی میں ہے بنگال کی طرف جائے
کتاب سال میں اک دن نہ کھول کر دیکھی
قریب آ گیا جب امتحاں تو گھبرائے
یہ آرزو ہے مہیا ہو ایسی آسانی
کوئی پڑھے نہ لکھے اور پاس ہو جائے
حصول علم کی ایسی کوئی بنا دے مشین

اکنی ڈال دیں اور اک سند نکل آئے

عبد الصمد جاوید(علامہ گنبد)

یہ لیڈر پر نوازش ہو رہی ہے
سڑے انڈوں کی بارش ہو رہی ہے
سموسے کھا لئے تھے کل سڑک پر
گلے میں آج خارش ہو رہی ہے
وہ غیروں پر کرم فرما رہے ہیں
ہماری آزمائش ہو رہی ہے
ریا کاری کا آیا ہے زمانہ
محبت کی نمائش ہو رہی ہے
تمنا ہے انھیں عمرِ خضر کی
مرے مرنے کی خواہش ہو رہی ہے
میاں مٹھو ہیں گنبدؔ سارے شاعر
خود اپنی ہی ستائش ہو رہی ہے

۔۲
ہو نہ جائے جس بات سے ڈر لگتا ہے
ضبطِ تولید کی سوغات سے ڈر لگتا ہے
کل پریشان تھے حالات بدلنے لئے لیے
آج بد لے ہوے حالات سے ڈر لگتا ہے
سر پہ آفات و حوادث کا ہے اس درجہ ہجوم
اب تو خوشیوں کے بھی لمحات سے ڈر لگتا ہے
کر دے غارت نہ کوئی حاتمِ ثانی بن کر
ہم کو الطاف و عنایات سے ڈر لگتا ہے
جانے کس وقت مریدوں کا صفایا کر دیں
پیر صاحب کی کرامات سے ڈر لگتا ہے
ہر طرف جال سیاست کے بچھے ہیں گنبدؔ
رہنماؤں کے مفادات سے ڈر لگتا ہے

فیاض افسوس

۔۱
سوچنا تھا کچھ تو اس دن کے لیے
تھا تکلف کس لیے، کن کے لیے
ان گنت لینے تھے کیوں گن کے لیے
تو نے بلبل جب سے دو تنکے لیے
’’ٹوٹتی ہیں بجلیاں ان کے لیے‘‘

چوڑیاں، انگشتری، پازیب، ہار
بڑھ گئیں فرمائشیں جب بے شمار
چڑ کے میں نے کہہ دیا جانِ بہار
ہے جوانی خود جوانی کا سنگھار
''سادگی گہنا ہے اس سن کے لیے''

تیری ہمدردی نے دنیا تنگ کی
ہے کمی ہر تول میں پا سنگ کی
بات ہونی چاہئے کچھ ڈھنگ کی
''باغباں کلیاں ہوں ہلکے رنگ کی
بھیجنی ہیں ایک کم سن کے لیے''

دل فریبِ حسن میں جب آ گیا
ساری دنیا سے میرا جھگڑا ہوا
حشر لیکن عشق کا الٹا ہوا
وہ زمانے بھر کے ہیں میرے سوا
میں نے دنیا چھوڑ دی جن کے لیے
کھو گئی رنگیں نظاروں میں نظر
شکل بھی دیکھی نہ گھونگھٹ کھول کر
ہو گئی باتوں ہی باتوں میں سحر
''وصل کی شب اور اتنی مختصر
دن گنے جاتے اس دن کے لیے''

۲

نت نئے سینکڑوں اشعار کہاں سے لائیں
وقت اتنا بھلا بے کار کہاں سے لائیں
سوچے سمجھے ہی بنا داد جو دیتے جائیں
ایسے با ذوق سمجھدار کہاں سے لائیں
حشر قربانی کے بکروں کا بہت دیکھ چکے
لوگ اب جذبۂ ایثار کہاں سے لائیں
ٹمٹماتے سے دئے کوہی غنیمت جانو
روشنی کا کوئی مینار کہاں سے لائیں
مانا بے تاب زلیخائیں بہت ہیں لیکن
ہند میں مصر کا بازار کہاں سے لائیں
سر ہمیں اپنے رقیبوں کا قلم کرنا ہے
دور ایٹم کا ہے تلوار کہاں سے لائیں

ناظم انصاری

بیگم کی خواہشات ارے باپ کیا کروں
مانگے ہے کائنات ارے باپ کیا کروں
کرنی جو ہوتی ان سے تو کر لیتا کچھ نہ کچھ
ان کے پِتا سے بات ارے باپ کیا کروں
کھائی تھی میں نے جینے کی جن کے لیے قسم
وہ پا گئے وفات ارے باپ کیا کروں
بیٹھے ہیں کر کے وہ بھی مجھے جن پہ ناز تھا
ترکِ تعلقات ارے باپ کیا کروں
سیدھی کمر ہوئی بھی نہیں تھی ابھی کہ پھر
ماری ہے اس نے لات ارے باپ کیا کروں
ناظم میں ان سے مل کے کھٹائی میں پڑ گیا
روز ایک واردات ارے باپ کیا کروں

۲

صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجئے

کب یہ کہتا ہوں کہ کر سی صدارت دیجے
صرف دو شعر سنانے کی اجازت دیجئے
سینکڑوں میل کی دوری پہ ہے میرا گاؤں
چل کے آیا ہوں بمشکل یہاں پاؤں پاؤں
دھوپ ہی دھوپ تھی اب آنے دو تھوڑی چھاؤں
جیب خالی ہے مری پھر بھی نہ اجرت دیجئے
صرف دو شعر۔۔۔۔۔

اوپننگ چاہیں تو مجھ سے بھی کرا سکتے ہیں
شاعروں کے لیے ماحول بنا سکتے ہیں
مجھ سے شاعر کو بہ آسانی کھپا سکتے ہیں
بولڈ ہو جاؤں گا ناچیز کو زحمت دیجے
صرف دو شعر۔۔۔۔۔

فلمی دھن میں بھی غزل اپنی سنا سکتا ہوں
اور قوالی کے لہجے میں بھی گا سکتا ہوں
ایک ہی تان میں اس چھت کو اڑا سکتا ہوں
اس کلاکار کو اک موقع تو حضرت دیجے
صرف دو شعر۔۔

اے ڈیویزن کے نظر آتے ہیں فنکار یہاں
ایک سے ایک سنائیں گے جو اشعار یہاں
کچھ تو کر دیجئے ناظمؔ کا بھی پر چار یہاں
ہوٹ ہو جاؤں گا اس کی نہ ضمانت دیجے
صرف دو شعر۔۔

جمال الدین جملوآ انصاری

شاعرو پڑھتے رہو کاٹے کٹے نہ جب بھی رات
فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلاتن، فاعلات
سینیئر علمائے دیں کی جانتے ہو تم غذا
قورماتن، اَنڈیاتن، مرغیاتن، مچھلیات
اب گویّوں کے عوض گانے لگی ہیں گائکہ
ٹھمریاتن، دادراتن، مالکوسن، غزلیات
صدرِ جلسہ کو چکن، میرے لئے رکھّا گیا
کھچڑیاتن، مِرچیاتن، چٹنیاتن، دال بھات
سرجنوں کو اِن کی معلومات ہونی چاہیے
پھونک پھاکن، گنڈیاتن، دھونیاتن، عملیات
اے جملوآ اِنڈیا میں ہے غریبوں کے لئے
گھونسیاتن، گالیاتن، انٹھیاتن، واردات

۲

تمہارے رخ پہ چمکتا جو نُور آج بھی ہے
ہمارے واسطے وہ مِثلِ طُور آج بھی ہے
امیر جس کا لہو چوس کر بنا زر دار
وہی غریب مشقّت میں چُور آج بھی ہے
سب اس کے چاہنے والوں نے تھام لی لاٹھی
جنابِ شیخ کی دختر تو حُور آج بھی ہے
وہ لڑکی جس نے کہ مونچھوں کو نیچی کروائی
اسی پہ باپ کو دیکھو غرور آج بھی ہے
تمہارے چہرے کی جھُرّی سے ہم کو کیا لینا
تمہاری آنکھ میں کیف و سرور آج بھی ہے
یہ کس نے کہہ دیا مَیرِج ہوئی اور ساتھ میں ہیں
جملوآ بنتِ مُجاور سے دور آج بھی ہے
(جوشاندہ۔ ۱۹۹۴)

سر فراز کاتب، بدنیروی

باوا سمج رئے اسکول جاریا لاتا آپھت
دو دو پچّر دیکھ کے آریا لاتا آپھت
ٹھیلا لگّاریا ڈی ایڈ کر کے کیلے کا
نوی دُولن سا شر ماریا لاتا آپھت
کھیتی بیچا کٹّلا لیاگوں سے آیا امراؤتی
دیسی پی کربھجئے کھا ریا لاتا آپھت
میکو بولا پائے پکے کھا کے جانا بھئی صاب

میرا سالا میکو بنا ریا لاتا آپھت
کھولا پور سے بھگ کے آیا عالم بنتے بنتے
اب ماموں کے بکریاں چرا ریا لاتا آپھت
نیلے پیانٹ پہ پیلا کرتا، اودی ٹوپی، جوتے لال
کالے خاں پیغام کو جا رہا لاتا آپھت
بھگے سو گئے بڈّا بڈّی، سالے کو پر وا نئیں
جورو کو جلبّی کھلاریا لاتا آپھت
آخر تو نے کاتبؔ کو کیا سمجھا ہے رے
بے فالتو کے اس سے کھجا ریا لاتا آپھت
- - - - - - - - - - - - - - - -
سمج۔ سمجھ، پچّر۔ پکچر، ٹھیلا۔ خوانچہ، دولن۔ دلہن، گوں۔ گاؤں، امراؤتی۔ مہاراشٹر کا ایک شہر، بھجئے۔ پکوڑے، میکو۔ مجھے، کھولا پور۔ امراؤتی ضلع میں واقع ایک قصبہ جہاں ایک مشہور دینی مدرسہ ہے۔ بھگے۔ بھوکے، جلّبی۔ جلیبی، بے فالتو۔ فضول

۲۔
یار کی یاری گھر سے باہر یہ بیماری گھر سے باہر
آگ لگا سکتی ہے سالی یہ چنگاری گھر سے باہر
گھر میں تو بس چور رہو جی تھانیداری گھر سے باہر
گھر میں ہا ہا کار مچی ہے فیض ہے جاری گھر سے باہر
شوہر بیوی، بیوی شوہر باری باری گھر سے باہر
بچوں کا بھگوان ہے مالک نر اور ناری گھر سے باہر
پیار کے دشمن گھر کے اندر پریم پجاری گھر سے باہر
کاتب جی گھر لوٹ چلو اب رات گزاری گھر سے باہر

فنی ایوت محلی

ہم ترقی میں کسی بھی دیش سے پیچھے نہیں
جگ سے پوشیدہ نہیں سچائی میرے دیش کی
کیا ہوا گر چاند پر راکیٹ پہنچا روس کا
آسماں کو چھو رہی مہنگائی میرے دیش کی

ایک ان پڑھ کا ذکر کیا یارو
آپ جیسے عقیل کہتے ہیں
قتل کرتا ہے جو حقیقت کا
لوگ اس کو وکیل کہتے ہیں

یارو اسی کی آج زمانے پہ چھاپ ہے
اب کیا بتاؤں حال تمہیں اقتدار کا
سو میں دو ہی کام پہ لڑ کے لیے گئے
ایک آم دار کا ہے تو دوسرا خاص دار کا

ہزل

جوشِ جنوں میں عشق بڑھانے چلا ہوں میں
اک بے وفا سے پیار جتانے چلا ہوں میں
دنیا کو یاد آئے گا افسانہ طور کا
زلفیں کسی کے رخ سے ہٹانے چلا ہوں میں
ساحل کے رہنے والو! تمہیں دور سے سلام
طوفاں سے رسم و راہ بڑھانے چلا ہوں میں
اڑ کر فلک پہ پہنچی میری خاکِ آشیاں
اب آشیاں فلک پہ بنانے چلا ہوں میں
شاید حیات بھی نہ میرا ساتھ دے سکے
ان کی گلی کی خاک اڑا نے چلا ہوں میں
دیر و حرم کا فرق نہ محسوس ہو جہاں
دنیا کو اس مقام پہ لانے چلا ہوں میں
فنّیؔ ہوں کائنات میں ذرہ صفت مگر
کوہِ غمِ حیات اٹھانے چلا ہوں میں

عبد الحفیظ لقب عمران
اچلپور

درشن مری آنکھوں کو کرانے نہیں آتے
کچھ دن سے وہ چکی پہ پسانے نہیں آتے
وہ آنکھ ملانے کی روش چھوڑ چکے ہیں
حد ہو گئی اب آنکھ دکھانے نہیں آتے
وہ جان ہتھیلی پہ لئے ملتا ہے تجھ سے
عاشق کو ترے حیلے بہانے نہیں آتے
برسوں سے مرا دل ہے حسینوں کے اثر میں
برسوں سے مرے ہوش ٹھکانے نہیں آتے
داداؤں کا سردار سمجھتے ہیں مجھے سب
اب غنڈے ادھر رنگ جمانے نہیں آتے
تھپّڑ ہے خزاں کی نہ بہاروں کے اشارے
موسم بھی تری یاد دلانے نہیں آتے
دولت کی مرے دیش میں تقسیم غلط ہے
حصے میں غریبوں کے پھُٹانے نہیں آتے
در اصل ہمیں ہاتھ دکھانے کا جنوں ہے
ہم تجھ سے کبھی ہاتھ ملانے نہیں آتے
طاقت کا مری اس طرح پر چار ہوا ہے
رستم بھی لقبؔ مجھ سے کھجانے نہیں آتے

رہنے لگے ہیں جا کے وہ اب نینی تال میں
دیوانہ ہو گیا ہوں میں جن کے خیال میں
سمجھو کہ اس کی دنیا سے چھٹّی قریب ہے
جو پھنس گیا کسی کی محبت کے جال میں
اللہ کا کرم کہ ترقی ہوئی مری
دشمن نے لاکھ چاہا میں آؤں زوال میں
بادِ صبا نصیب تجھے ہو گی کیا بھلا
شوخی جو پائی جاتی ہے اس بت کی چال میں
مخصوص کمرہ چاہئے آرام کے لیے
اور تم بضد کہ ٹھہروں میں اس عام حال میں
جی چاہتا ہے اس میں لقبؔ ڈوب جاؤں میں
پڑتا ہے جو حسین گڑھا ان کے گال میں

فوجی جلگانوی

١

ہوئی ہے حالت یہ آج اپنی اناج گنتی کا کھا رہے ہیں
اور اس پہ بھی ہم کو داد دیجے کہ اپنی جنتا بڑھا رہے ہیں
وہ اپنی کھڑکی میں آ کے بھونڈے سروں میں اک گیت گا رہے ہیں
تو کھد کی گاڑی پہ بیٹھے ہم بھی گھمیلا پھٹکا1 بجا رہے ہیں
سنا ہے میں نے بھی پوٹٹے کی وہ اپنے شادی رچا رہے ہیں
نہ کپڑا لتّا، نہ کھانا دانا، پھکٹ2 میں باجے بجا رہے ہیں
شکار ترپٹ نظر کا شاید ہوا نہیں ہے اسی لیے تو
وہ بھیں گی آنکھوں میں بھر کے کاجل نظر کو اپنی پجا3 رہے ہیں
تمہاری چلتی میں صرف تم نے تو بہتی گنگا میں ہاتھ دھویا
اور ہم کو دیکھو کہ بن کے لیڈر ہم اس میں کیسے نہا رہے ہیں
نہیں ہے جب ان کو کام دھندا تو گول کر دیتے ہوں گے چندا
جبھی دھڑا دھڑ مشاعروں پر مشاعرے یہ کرا رہے ہیں
ہماری قسمت میں اور بھی کیا بندھی ہوئی ہے یہ دال روٹی
خدایا اب تو پلٹ دے پانسہ مزے دلندر اڑا رہے ہیں
چلیں گے ان کے نہ چترے چالے 4تو ان کو فوجیؔ نہ چن کے لانا
یہی الکشن میں ناچتے تھے جو آج ہم کو نچا رہے ہیں

1۔ لوہے کا ٹوکرا جس میں بوسیدگی کے سبب سوراخ ہو گئے ہوں
2۔ مفت
3۔ تیز کر رہے ہیں، دھار دار بنا رہے ہیں۔
4۔ عیاریاں

قطعات

خوش ہیں لیڈر ہی اس زمانے میں

نام ہوتا ہے، کام ہوتا ہے
ہم نے دیکھا ہے آج کا راون
صرف نوٹوں سے رام ہوتا ہے

کار والے بھلا یہ کیا جانیں
کتنی آنکھوں میں دھول جاتی ہے
اپنی جنتا ہی بھولی بھالی ہے
پونچھ لیتی ہے بھول جاتی ہے

پڑوسن
میرے گھر کے بازو پڑوسن کا گھر ہے
جو پورے محلے میں شیرِ ببر ہے
اکیلی چلی تو کہاں چھوڑ کر ہے
ابھی پیار میں بھی تو تھوڑی کسر ہے
نبھے کیسے ان کی یہی مجھ کو ڈر ہے
ڈبل روٹی بیگم تو میاں بٹر ہے
کوئی راز کی بات اس سے نہ کہنا
اِدھر کی وہ جا کر لگاتا اُدھر ہے
رقیبوں کو نقدی بھی دیتے نہیں وہ
محبت کا کھاتا میرے نام پر ہے
ذرا مشورہ دو کہ اب کیا کروں میں
کھچاکھچ بھرا میہمانوں سے گھر ہے
محبت کی راہوں میں اڑچن1 یہی ہے
کہیں گاڑ2رستہ کہیں پر سگر 3ہے

1۔ رکاوٹ 2۔ بیل گاڑی کا رستہ 3پگڈنڈی

غنی اعجاز

ہزل

حیران ہو گیا ہوں میں ان کی اڑان پر
اک پیر ہے زمین پر اک آسمان پر
ہے عاشقوں کی دھوم تمہاری دکان پر
بلّوں کی ہے قطار گلہری کی جان پر
گردی تھی اس غضب کی محبت کی ریل میں
مشکل سے مل سکی ہے جگہ پائیدان پر
واعظ ہوں، شیخ ہوں کہ ہوں زاہد سبھی کے دل
دیکھے لٹکتے حسن کی ہم نے دکان پر
بیٹھے رہے بس الّو کے پٹھّے بنے ہوئے
ہم لا سکے نہ حرفِ محبت زبان پر
مہتاب و آفتاب ہیں خورد و کلاں تمام

اترا ہے حسن صرف ترے خاندان پر
ہم جھاڑیوں میں خوف سے اوندھے پڑے ہوئے
چیتا براجمان ہماری مچان پر
کشتی پہ ناخدا کی نوازش نہ پوچھئے
طوفان سے بچی تو چڑھا دی چٹان پر

٢

مزاحیہ سہرا

مبارک بنتِ شاعر سے نکہ خوانی مبارک ہو
تیرے اُ ولے کو اب یہ مصرعۂ ثانی مبارک ہو
تجھے دیوانۂ الفت، یہ دیوانی مبارک ہو
مبارک، زندگی بھر کی پریشانی مبارک ہو
ہمیشہ بس یونہی بیٹھا ہوا رہ تو اسی در پر
تجھے اپنے خسر کے گھر کی دربانی مبارک ہو
اگر دلہن کو تو نے واقعی دیکھا نہیں اب تک
تو پھر اے عقل کے دشمن یہ نادانی مبارک ہو
اگر جی بھر کے دیکھا ہے ہمیشہ ہر گھڑی تو نے
تو پھر تجھ کو یہ دلہن جانی پہچانی مبارک ہو
اگر بچپن میں دیکھا اور رشتہ کر لیا تو نے
تو پھر اب وقت جلوا، تجھ کو حیرانی مبارک ہو
جہیز کے ساز و ساماں کی فراوانی مبارک ہو
تیری سوئی کے رکھنے کو تِلے دانی مبارک ہو

رفیق شاکر، کھامگانوی

بڑے خالو

محلے بھر کے لوگوں کو جگاتے ہیں بڑے خالو
بڑی خالہ سے لڑنے پر جو آتے ہیں بڑے خالو
کوئی بیگن میں تلی بھر رہا ہے ایسا لگتا ہے
جو اپنی نک پڑی میں نس لگاتے ہیں بڑے خالو
سری دیوی کی کوئی فلم آ جائے جو گاؤں میں
جیتندر کی طرح ہلّڑ مچاتے ہیں بڑے خالو
سلو بیٹنگ ہی چلتی ہے اگر ہو دال دستر پر
مٹن مل جائے تو سکسر لگاتے ہیں بڑے خالو
بڑے خالو سے بچوں کو ڈراتی ہے بڑی خالہ
بڑی خالہ سے بڈھوں کو ڈراتے ہیں بڑے خالو
وہ ہنستے ہیں تو سولہ دانت کا چوکا چمکتا ہے

بنا کا گیت مالا بن کے آتے ہیں بڑے خالو
جہاں پر دال کس کی بھی نہیں گلتی کبھی شاکر
وہیں اکثر سری پائے گلاتے ہیں بڑے خالو

پھپّا

چاندنی سے چٹک گئے پھپّا
بس کے پیچھے لٹک گئے پھپّا
لوگ لائے ہیں ان کو مسجد میں
یا کہ خود ہی بھٹک گئے پھپّا
پھوپی بی اے بھی ہو گئی لیکن
پانچویں میں لٹک گئے پھپّا
سارے پر چوں میں پاس تھے لیکن
ہسٹری میں اٹک گئے پھپّا
دام دینے کے وقت اے شاکرؔ
خالی بٹوا جھٹک گئے پھپّا

انوار احمد قریشی نشتر
اکولہ

گانجے کا اثر

ہر گھڑی میرا خلاؤں میں گزر ہوتا ہے
پاؤں دھرتی پہ مگر عرش پہ سر ہوتا ہے
کس قدر گانجے کی پڑیا میں اثر ہوتا ہے

ڈر تھا نظروں کا تصادم نہ بنا دے پاگل
بزم جاناں میں گئے شیخ لگا کر گاگل
جیسے موٹر کی حفاظت کو ”بفر“ ہوتا ہے

وائے قسمت مجھے معشوق ملا ہے بھینگا
ٹیڑھی آنکھوں کا ہر اک تیر نظر ہے ترچھا
دل نشانہ ہے مگر چھلنی جگر ہوتا ہے

ناقدِ شعر و سخن ہوں کرو عزت میری
خام کارانِ ادب کو ہے ضرورت میری
جیسے پنسل کے مٹانے کو ربر ہوتا ہے

بوجھئے آپ بھلا کیا ہے تخلص میرا
نشر ہو حال اگر ”تے“ کا اٹھا دیں ڈیرا
نون اور شین ہٹا دینے پہ نر ہوتا ہے

قرضوں کا ایک پہاڑ ہے خادم کی جان پر
بیگم کی ہے نگاہ فقط نائیلان پر
آدھی پگار اٹھتی ہے اک پاندان پر
دو بار قرقی آ چکی میرے مکان پر
جوں پھر بھی رینگتی نہیں بیگم کے کان پر

’’بَٹ‘‘ اور ’’پُٹ‘‘ کا کیوں ہے تلفظ جدا جدا
’’واک‘‘ اور ’’ٹاک‘‘ میں نہ کریں ’ایل‘‘ کو کیوں ادا
’’سی ایچ‘‘ سے نکلے ’’چے‘‘ کی، کہیں ’’کاف‘‘ کی صدا
انگلش زبان کیسی نرالی ہے اے خدا
حاوی ہو کیسے کوئی بھلا اس زبان پر

کڑکی کا سخت دور ہے تنخواہ ہوئی تمام
مہماں بھی آ گئے مرا کرنے تمام کام
طعنے بھی سن کے جانے کا لیتے نہیں ہیں نام
’’کل جائیں گے‘‘ وہ کہتے ہیں ہنس ہنس کے صبح و شام
لعنت خدا کی ایسے ’’چکٹ‘‘ میہمان پر

معشوق اس صدی کا وفا سے ہے بے خبر
آہ و فغاں کا اس پہ نہیں ہوتا کچھ اثر
عشاق کے دلوں پہ نہیں جیب پر نظر
یوں بن سنور کے بام پہ ہوتا ہے جلوہ گر
بیٹھا ہو جیسے کوئی شکاری مچان پر

نشتر ترے رقیب ہوئے جاتے ہیں کباب
پیتے گھونٹ خون کے کھاتے ہیں پیچ و تاب
باتوں کا تیری ان کو نہیں سوجھتا جواب
سر جوڑ کے بناتے ہیں منصوبے بے حساب
بیٹھے ہوں جیسے چار چغد اک چٹان پر

عظیم۔ محمد عظیم ناگپوری

خرام ناز سے کوئی چلا ہے
جدھر دیکھو ادھر محشر بپا ہے
بظاہر دیکھنے میں پارسا ہے
مگر زاہد بہت بہکا ہوا ہے
ہمارے حال سے آگاہ ہو کر
ہمیں سے اور پوچھا جا رہا ہے
فقط اک بات ہنس کر آپ کر لیں
عظیم اس کے سوا کیا چاہتا ہے

۲

مری جب ملاقات ہوتی ہے ان سے
محبت کی ہر بات ہوتی ہے ان سے
لگاتا ہوں آنکھوں سے منظور کر کے
میسر جو سوغات ہوتی ہے ان سے
جس عنوان پر گفتگو کل ہوئی تھی
وہی بات پھر آج ہوتی ہے ان سے
فضا ایک چھا جاتی ہے خوش دلی کی
جہاں بھی ملاقات ہوتی ہے ان سے
منا لیتے ہیں مسکرا کر خوشی سے
ستم کی اگر بات ہوتی ہے ان سے

منہ پھٹ ناگپوری

جیتے تو ہیں سب بوڑھے پر ضعف کی حالت میں
ہوتی ہے یہی درگت عمروں کی طوالت میں
اس وقت ہی مر جانا ہر حالت میں بہتر تھا
جب گھر سے نکالا تھا بیٹوں نے علالت میں
مسجد کے امام اکثر چائے کو ترستے ہیں
دیتا ہے مجھے لاکھوں اللہ وکالت میں
اس وقت کی دو لاتیں کھالوں تو خدا پاؤ
جب پیرِ مغان اپنے رہتے ہیں جلالت میں
بے جوڑ کی شادی کا انجام برا دیکھا
بیوی بھی خجالت میں شوہر بھی خجالت میں
اس دورِ سیاست میں ہم نے تو یہی دیکھا
بگلوں کی ہوئی پیشی کووں کی عدالت میں
لکھ پڑھ کے بھی ہم جیسے پہنچے نہ جہاں منہ پھٹؔ
وہ نام کمایا ہے بیٹوں نے جہالت میں
(ماہنامہ شگوفہ، سالنامہ ۲۰۰۰)

۲

منتری نے دل دکھایا عزت افزائی کے ساتھ
کچھ اضافہ کر دیا بونس میں مہنگائی کے ساتھ
اس سے تنہا بات کرنے کی تمنا رہ گئی
وہ نظر آئی کبھی تایا کبھی تائی کے ساتھ
پھول کے سہرے نے بدلا خون کے رشتے کا رنگ
بیوی آتے ہی لڑائی ہو گئی بھائی کے ساتھ
لوگ پھر بھی ہم کو کہتے ہیں کریلا نیم کا

دوستانہ گانٹھ کر رہتے ہیں حلوائی کے ساتھ
امن کی صورت نظر آتی نہیں اب شہر میں
مل گئے ہیں آج کل نیتا بھی بلوائی کے ساتھ
منتری ہنستے ہی اخباروں میں اسکینڈل چھپے
ہم کو شہرت بھی ملی منہ پھٹ تو رسوائی کے ساتھ
(ماہنامہ شگوفہ جون ۱۹۹۴)

مسعود احمد جھانپڑ،
ناگپور

۱

اس کی گلی سے آج گزر جائیں ہم تو کیا
تڑوا کے ہاتھ پاؤں سدھر جائیں ہم تو کیا
گھر میں ہماری بیوی ہی قابو میں جب نہیں
باہر جو سب کے کان کتر جائیں ہم تو کیا
لوفر کی طرح زندگی اپنی گزار کر
زندہ ہیں ہم تو کیا ہیں، جو مر جائیں ہم تو کیا
جب وقت تھا تو بھَیڑ کی صورت بنے رہے
بے وقت مثلِ شیر بپھر جائیں ہم تو کیا
پاپوں کے گہرے تال سے اک لاش کی طرح
پھر ڈوبنے کے بعد ابھر جائیں ہم تو کیا
چندہ یتیم خانے کا کر کر کے رات دن
اپنی بھی جیب مال سے بھر جائیں ہم تو کیا
کر سی ہمارے نام کی ہے کام کی نہیں
بیٹھے رہیں تو کیا جو اتر جائیں ہم تو کیا
جھانپڑؔ دکھائی دیتے ہیں تگڑے ضرور ہم
جا کر مقابلے میں پسر جائیں ہم تو کیا
(ماہنامہ شگوفہ، جولائی ۱۹۹۴)

۲۔

داؤں اپنا جب چلا دیتی ہے موت
اچھے اچھوں کو ہلا دیتی ہے موت
صرف اک کمزور کی کیا بات ہے
بارہ رستم کے بجا دیتی ہے موت
آپ چاہیں کتنا بھی میک اپ کریں
رنگ چہرے کا اڑا دیتی ہے موت
ہو گیا ہے جو تکبر کا مریض
عاجزی اس کو سکھا دیتی ہے موت
مال و زر پر جو اکڑتا ہے اسے
ناچ تگنی کا نچا دیتی ہے موت

زیست پر اپنی نہ جھانپڑؔ ناز کر
زیست کو جھانپڑ لگا دیتی ہے موت
(ماہنامہ شگوفہ، جنوری۱۹۹۸)

مفلس قارونی

میں کیا کر سکتا ہوں

حلوہ پوری گدھے اڑائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
انساں روکھی سوکھی کھائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
اندھے آنکھیں مجھے دکھائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
اور گونگے بے نقط سنائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
ٹانگوں والے اپنی ٹانگیں توڑے گھر میں بیٹھ رہیں
لنگڑے سر پٹ دوڑ لگائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
کوئل دم سادھے بیٹھی ہو، بلبل پر سکتہ طاری ہو
ڈال ڈال پر کوے گائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
آگے پیچھے اوپر نیچے گھپلے ہوں گھوٹالے ہوں
اور رشوت ہو دائیں بائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
جب قانون تماشائی ہو اور فسادی بلوائی
بستی بستی آگ لگائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
ہر دم امن اور یکجہتی کی مالا جپنے والے
بھائی کو بھائی سے لڑائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
املا انشا درست جن کا اور نہ ہجا جن کا ٹھیک
وہ بھی پی ایچ ڈی ہو جائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
وہ حضرت جو شعر وا دب کی ابجد سے بے بہرہ ہوں
استاذ الشعرا کہلائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
کچھ اندھے مانگے کی عینک رکھ کر اپنی آنکھوں پر
رعب جمائیں اپنی بصیرت کاتو میں کیا کر سکتا ہوں
داد طلب نظروں سے دیکھیں راہیؔ پھر احباب مرے
میرے شعر مجھے سنائیں تو میں کیا کر سکتا ہوں
(ماہنامہ شگوفہ، فروری ۲۰۰۳)

تضمین بر غزلِ غالبؔ

کبھی دن بھر وہ گھر نہیں آتی
اور کبھی رات بھر نہیں آتی
وہ رہِ راست پر نہیں آتی
کوئی امید بر نہیں آتی
کوئی صورت نظر نہیں آتی

کبھی چوہوں پہ ان کے بل پہ ہنسی
کبھی بٹّے پہ اور سِل پہ ہنسی
کبھی رخسار اور تِل پہ ہنسی
پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی
اب کسی بات پر نہیں آتی

دانت جب تک ہیں پیسٹ منجن ہے
سانس جب تک ہے، دل ہے دھڑکن ہے
کیسی بے چینی، کیوں یہ الجھن ہے
موت کا ایک دن معین ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی

جب بھی ہو گا حسابِ طاعت و زہد
کیسے دوں کا حسابِ طاعت و زہد
دیکھتا ہوں میں خوابِ طاعت و زہد
جانتا ہوں ثواب، طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

سب تجھے چھوڑ کر گئے مفلس
کچھ ادھر کچھ ادھر گئے مفلس
یار تیرے کدھر گئے مفلس
سب کہاں جا کے مر گئے مفلس
کیوں کسی کی خبر نہیں آتی
(ماہنامہ شگوفہ، مارچ ۱۹۹۲)

اقبال خلش

مال یتیموں کا بھی کھا رئے قہرِ خداسے ڈرتے نئیں
لائے امر پٹّہ لکھوا کر، بیمار ہوئے مرتے نئیں
چمٹا، بیلن، چمچہ، جھاڑو کی تو ہم کو عادت ہے
یہ بیگم کی مار ہے ورنہ اپُن کسی سے ڈرتے نئیں
جان تمنا! آپ ہمارے دلبر ہیں یا لیڈر ہیں؟
وعدے تو کرتے رہتے ہیں لیکن پورے کرتے نئیں
تم نے چنے کے جھاڑ پہ یارو! چڑھا دیا ان کو ناحق
ان کی فطرت کیا بتلاؤں چڑھ جائیں تو اترتے نئیں
اہلِ ہوس کا پیٹ تو بھر جاتا ہے نیت نئیں بھرتی
پھوٹے ہوئے مٹکے میں لیکن ہم بھی پانی بھرتے نئیں
اپنے ہاتھوں خنجرؔ صاحب اپنا کچرا کرتے ہو
چاہے ہوٹنگ ہی ہو جائے، شعر تمہارے سرتے نئیں

۲۔

جب سے کرسی بچھڑ گئی ماموں
توند لیڈر کی جھڑ گئی ماموں
آنکھ یہ کس سے لڑ گئی ماموں
یہ تو پیچھے ہی پڑ گئی ماموں
کونسِلر بن گیا ہے وہ جب سے
اس کی گر دن اکڑ گئی ماموں
آپ نے کیا کیا پڑوسن سے
کیوں تماچہ وہ جڑ گئی ماموں
شیر وانی تھی، بن گئی جاکٹ
یوں سلائی ادھڑ گئی ماموں
آپ اوروں کو درس دیتے رہے
اور اولاد سڑ گئی ماموں
رہنما ہو گئے ضمیر فروش
شرم سے قوم گڑ گئی ماموں
- -- -- --

قطعہ

اوروں کے قد ناپنے والے اصلی بونے ہیں
چند ہیں ان میں پورے اکثر آدھے پونے ہیں
کِبر و انا کے کٹھ پتلے ہیں مکر و ریا کے بندے
کھیل حسد کا کھیل رہے ہیں خود ہی کھلونے ہیں

خواجہ سعید الدین اکولوی، سر خاب

نہ کیوں ہو جائے دل اس بات سے جل کر کباب آدھا
مرے پورے سوالِ وصل پر ان کا جواب آدھا
جو دیکھی اس کی کالی آنکھ تو غش آ گیا مجھ کو
ابھی رخ سے ہٹایا بھی نہ تھا اس نے نقاب آدھا
یہ قسمت ہے نہ نکلی نیند میں بھی وصل کی حسرت
بغیر عینک کے سویا تھا دیکھا میں نے خواب آدھا
بالآخر ہو گئے ہم بھی تو چپراسی منسٹر کے
خدا نے بعد مدت کے کیا عزت مآب آدھا
کچھ اس انداز سے بدلا ہے رنگ و روپ کڑ کی نے
کہ اب سرخابؔ کو کوئی بھی کہتا ہے عقاب آدھا

سوامی کشنانند۔ سوختہ

پینشن لینے خزانے میں گئے کوئی بزرگ
ان کو لینا تھا وہاں سے دو مہینے کا حساب
مل گئی چالو مہینے کی انھیں پوری رقم
اور ملا پچھلے مہینے کے متعلق یہ جواب
کیجئے داخل سول سرجن کا اک سرٹیفکٹ
یہ کہ اب سے تیس دن پہلے بھی تھے زندہ جناب
آپ کے جینے کا مل جائے گاتحریری ثبوت
پھر تو کیا ہو جائے گا فوراً بقائے کا حساب
پینشنر بوڑھا بیچارہ گھر کو واپس آ گیا
سوچتا ہے کس طرح دیں اس حماقت کا جواب

خواجہ زین العابدین۔ نایاب

ہے ان کا دوا خانہ خیراتی دوا خانہ
پر لیتے ہیں نذرانہ لاحول ولاقوت
اوروں سے تو تھرّانا اپنوں ہی پہ غرّانا
یہ ہمّتِ مردانہ لاحول ولاقوت
ٹُن ٹُن سا بدن جس کا ہے نام رکھا اس کا
ماں باپ نے دردانہ لاحول ولاقوت
نایابؔ مرا فن ہے ہر شعر دنادن ہے
پر آتا نہیں گانا لاحول ولاقوت

حیدر بیابانی

ضرورتِ رشتہ

یہ اشتہار اے مرے خم خوار چھاپنا
اے ساکنانِ کوچۂ اخبار چھاپنا
بیوی کی بے شمار ضرورت ہے اب مجھے
ٹی بی ہو یا بخار ضرورت ہے اب مجھے
کالی بھی ہو اگر تو گوارا لگے مجھے
تاکہ بری نظر سے ہمیشہ وہ بچ رہے
ہو بڑبڑی اگر تو مجھے کوئی غم نہیں
کیونکہ حضور میری سماعت میں دم نہیں
ساری پڑوسنوں کو جولڑنے میں مات دے
میرے حریف کے بھی مقابل کمر کسے

گر جاؤں ضعف سے تو مجھے گھر میں لا سکے
چھ سات من کا بوجھ جو تنہا اٹھا سکے
انگلی پکڑ کے جاؤں میں اس کی ہر ایک جا
بیوی کے روپ میں ہو جہاں دیدہ رہنما
اک شرط یہ بھی ہے کہ ملے اتنا کچھ جہیز
تا عمر میں کمائی سے کرتا رہوں گریز
دس سال ہو جسے بھی گرہستی کا تجربہ
شادی کا پیش آئے جسے پہلے حادثہ
ترجیح اس کو دوں گا ہر امید وار پر
ہووے نہ اس کا حسن اگر چہ بہار پر
بچپن میں میں پلا ہوں بڑے لاڈ و پیار سے
تھا دور کا نہ واسطہ جھڑکی سے مار سے
مرکز تھا ماں کے پیار کا بابا کی جان میں
پی پی کے ''نو نہال'' ہوا ہوں جوان میں
اک پیر چھوٹا ہے مرا ایک پیر ہے بڑا
چلتا ہوں تو لگے ہے کہ کرتا ہوں بھانگڑا
قبضہ جما چکی ہے مرے گھر میں مفلسی
لیکن ہے میرے پاس تو دولت خلوص کی
ایک بار اتفاق سے شادی ہوئی مری
کُڑھ کُڑھ کے لوگ کہتے ہیں بیوی وہ مر گئی
روتی تھی میری شکل کو وہ دیکھ دیکھ کے
کس قدر با وفا تھی خدا مغفرت کرے
اب جو بھی خوش نصیب مرا گھر بسائے گی
کچھ بچیوں کی پہلے سے ماں کہلوائے گی
(ماہنامہ شگوفہ، فروری ۱۹۸۳)

خوشامد

ہر سمت لگا رہتا ہے بازارِ خوشامد
ہر کوئی جہاں میں ہے طلب گارِ خوشامد
ہاریں وہ الکشن میں تو اس بات پہ روئیں
ہو گا نہیں برسوں انھیں دیدارِ خوشامد
بن جائے گا سسرال بھی گھر آپ کا ایک دن
ہے ساس اگر آپ کی بیمارِ خوشامد
روٹھی ہوئی بیوی کو منانے کے وظیفے
کچھ اور نہیں صرف ہیں اوزارِ خوشامد
حیدرؔ ہیں خوشامد کے پرستار سبھی لوگ
اٹھتا ہی نہیں تم سے فقط بارِ خوشامد
(ماہنامہ شگوفہ، ستمبر ۱۹۸۸)

متین اچلپوری

ملیریا

ودھیارتھی نہ جا سکا شاڑا ملیریا
تو نے پڑھایا خوب پہاڑا ملیریا
تو نے پڑھایا خوب پہاڑا ملیریا

پکّے مکان کی، کہیں کچّے کی لی خبر
سایہ بُرے پہ ڈال کے، اچّھے کی لی خبر
جھوٹا جو مات کھا گیا، سچّے کی لی خبر
پوچھا پتہ بزرگ کا، بچّے کی لی خبر
تو نے کہیں جوان کو تاڑا ملیریا!
تو نے پڑھایا خوب پہاڑا ملیریا

لہرایا تیرے خوف کا سایا نگر نگر
منزل اداس اداس ہے، سونی ڈگر ڈگر
لیٹا ہوا مریض کے بستر پہ ڈاکٹر
موٹر کو چھوڑ چھاڑ کے بیٹھا ڈرائیور
تیرا شکار باڑا کا باڑا ملیریا
تو نے پڑھایا خوب پہاڑا ملیریا

تھی دور، پاس تو نے بلایا ہے موت کو
دکھلا کے رنگِ خون لبھایا ہے موت کو
جی بھر کے چکھ چکا تو چکھایا ہے موت کو
تو نے ہی دل کا خون پلایا ہے موت کو
تو نے ورق حیات کا پھاڑا ملیریا
تو نے پڑھایا خوب پہاڑا ملیریا

رہ رو کا خون راہ میں، رہبر نے لے لیا
باقی بچا کھچا تھا جو، مچھر نے لے لیا
عشرہ جنابِ شیخ کا، بستر نے لے لیا
یو ٹرن آج شہر کے افسر نے لے لیا
پربت کا سلسلہ ہے کہ آڑا ملیریا
تو نے پڑھایا خوب پہاڑا ملیریا

اپنے مطب میں روز بلاتا ہے ڈاکٹر
اے چشمِ انتظار! لے آتا ہے ڈاکٹر
پچکارتی ہے نرس، ڈراتا ہے ڈاکٹر
لے لے کے فیس، ہوش اڑاتا ہے ڈاکٹر
جیتے جی تو نے قبر میں گاڑا ملیریا

بھینس

کہا ہم نے اُٹھا کر فون ہیلو
جواب آیا، سنو میں ہوں بفیلو
کہا جھنجلا کے ہم نے 'رانگ نمبر'
صدا آئی۔ نہ رکھنا فون مسٹر
مجھے ایک بات ہے تم سے یہ کہنا
جب اک ماحول میں ہم کو ہے رہنا
نظر جس رہگذر میں آپ آتے
میاں کیوں ناک بھوں مجھ سے چڑھاتے؟
خدا نے آپ کو اشرف بنایا
قرینہ زندگانی کا سکھایا
مروّت چاہیئے ہر اک شجر سے
محبت ہو تمھیں ہر جانور سے
بجا ہوں بدنما کالی کلوٹی
ہیں تم پہ بار یہ سینگ اور سنگوٹی
فقط تم شکل و صورت کو نہ دیکھو
سیاہ مٹّی کی مورت کو نہ دیکھو
یہ دیکھو مجھ سے پایا فائدہ کیا
بنایا ہے خدا نے قاعدہ کیا
نہ ہوتی میں اگر، زحمت اُٹھاتے
نہ ایسے دودھ تم سیروں سے پاتے
یہ قوت بخش مکھن اور ملائی
دہی اور چاچھ میں ہے جو بھلائی
فراغت سے نہ یوں کر پاتے حاصل
ادیب، اُستاد، عالم اور فاضل
نہ یوں سیراب ہوتے بچے بالے
یہ محنت کش، یہ گبرو، یہ جیالے
یہ سُن کے ہو گئے ہم پانی پانی
گئے سب بھول اپنی لن ترانی

فصیح اللہ نقیب
اکولہ

کیسے کہے گا آب بھلا تو سراب کو
کیسے بدل سکے گا حقیقت سے خواب کو
گھٹ بڑھ ہے آتے جاتے ہوئے ماہتاب کو
معلوم ہے ہے ساری کریڈٹ خضاب کو
تو لاکھ سینت سینت کے رکھیو شباب کو

ہے بعد دوپہر کے زوال آفتاب کو

ہلکٹ حوالدار ہوئے قربِ حشر ہے
قزاق شہر یار ہوئے قربِ حشر ہے
بچے بزرگوار ہوئے قربِ حشر ہے
شاہین مردہ خوار ہوئے قربِ حشر ہے
ہے ذلتوں کا سامنا عزت مآب کو
گدھ بھی دکھانے آنکھ لگے ہیں عقاب کو

جو رعب و دبدبہ تھا وہ کب کا اکھڑ گیا
نٹ بولٹ ڈھیلے ہو گئے چیچس بگڑ گیا
وہ نوجواں تھا جس کو پنپنا سکڑ گیا
اکبر زمیں میں غیرتِ قومی سے گڑ گیا
کس کی نظر لگی ہے تری آب و تاب کو
اے قوم ہائے کیا ہوا تیرے شباب کو

تھا چودھویں کی شب میں حسیں چاندنی کا نور
آئی نظر چمکتی ہوئی شے کہیں پہ دور
لپکے تھے اس طرف کہ وہ آئینہ ہے ضرور
ٹکلا چمک رہا تھا کوئی پارک میں حضور
کیسے کروں بیان میں اس تب کو تاب کو
فوکس سا کر رہی تھی زمیں ماہتاب کو

صاحب! تمہارے نام کا جھنڈا بلند ہو
صاحب! تمہیں عوام کی واحد پسند ہو
صاحب! تم ہی تو ایک پُلِ ارجمند ہو
صاحب! تم اس وطن کے چمن کی سگند ہو
تالے لگیں گے ایسی سیاست کے باب کو
چمچوں کی فوج کھائے گی عزت مآب کو

کیسے ستم ظریف ستم گار لوگ ہیں
جتنے ہیں سخن سنج مزیدار لوگ ہیں
کیوں شاعروں کے در پے ٔ آزار لوگ ہیں
ہم تو نقیبؔ قوم کے بیمار لوگ ہیں
دو مصرعے دے دئے تھے انھوں نے جلاب کو
ہنستے ہیں دیکھ دیکھ کے اب پیچ و تاب کو

لگا کر چلم کا جو دم دیکھتے ہیں
نظر جو نہ آئے وہ ہم دیکھتے ہیں
کہ سوکھے ہوئے کو بھی نم دیکھتے ہیں
جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں

’’خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں‘‘

عجب ہے درازیِ قامت کا عالم
تو میٹر، امیتابھ بچّن ہے اک سم
وہ ہے جزو ضربی تو ہے عادِ اعظم
ترے سر و قامت سے اک قدِ آدم
’’قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں‘‘

وہ آئینہ جو خود ہے جذبوں سے عاری
تمھیں کیا بتائے گا بیوٹی تمہاری
کبھی خود کو دیکھو نظر سے ہماری
تماشا کہ اے محوِ آئینہ داری
’’تجھے کس تمنا سے ہم دیکھتے ہیں‘‘

مرے درد کو پوچھ بگ سے لٹل سے
حکیموں کے دل سے طبیبوں کے دل سے
مرض کا پتہ لے دواؤں کے بل سے
سراغِ تف نالہ بے داغ دل سے
’’کہ شب رو کا نقش قدم دیکھتے ہیں‘‘

ہے اہلِ کرم کا عجب کیس غالبؔ
کرم میں ریا کی ہے اب ریس غالبؔ
دکھاتے ہیں اوریجنل فیس غالبؔ
بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
’’تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں‘‘

ح خ جھنجھٹ اکولوی

حسن کا ہے زور پر بیوپار تیرے شہر میں
خود مسیحا بن گئے بیمار تیرے شہر میں
تیر نظریں، بھوں کٹاری، توپ خانہ ہے ادا
کتنے بے لائسنس ہیں ہتھیار تیرے شہر میں
پوچھتا کوئی نہیں تم کون ہو کیوں آئے ہو
ہم پڑے ہیں صورت بھنگار * تیرے شہر میں
ہے کہاوت ایڑے * بن کر پیڑے کھانا چاہئے
ہم ادا کرتے ہیں یہ کردار تیرے شہر میں
لگتا ہے اب چیونٹیوں کے بھی نکل آئے ہیں پر
مفلسی بھی کر رہی ہے پیار تیرے شہر میں
یوں تو جھنجھٹؔ کی ہزل میں کچھ شگفتہ پن نہیں
ہو گئے رنگین یہ اشعار تیرے شہر میں

۔۲
ملے نجات مجھے ذیل کی بلاؤں سے
سکوں حرام ہے بچوں کی کاؤں کاؤں سے
ہے شہر بھر میں ترا حسن ٹارگٹ سب کا
اتار دوں میں نظر تیری آ بلاؤں سے
مری ہزل کو ہضم کر کے چین آ جائے
شکم کا درد بڑھاتا ہے کیوں دواؤں سے
سنا ہے شہر کو ریلی چلی ہے بھانڈوں کی
ہوئے ہیں جمع سبھی بھانڈ گاؤں گاؤں سے
یہ کم سنی میں مِری وسعتِ سخن دیکھو
کہ داد پائی ہے میں نے مرے چچاؤں سے
فدا ہے اس لیے جھنجھٹ بھی آج ٹن ٹن پر
سنے ہیں تذکرے ٹن ٹن کے پارساؤں سے۔
- - - - - - - - - - - - -
* بھنگار۔ Scrap ردّی سامان، ایڑے۔ دیوانے
- - - - - - - - - - - - -
(ماہنامہ شگوفہ جولائی ۹۴)

ریاض الدین کاملؔ

دردِ جدائی

ناراض ہوکے چھوڑ گیا گھر تُو لوٹ آ
کانٹا لگے ہے مخملی بستر تُو لوٹ آ
کھو کھو کبڈّی کھیل رہے ہیں رسوئی میں
کیڑے مکوڑے چوہے چھچھندر تُو لوٹ آ
سبزی بنائی میں نے تو کچھ اور بن گئی
روٹی بھی کوئلہ ہوئی جل کر تُو لوٹ آ
دروازہ ٹوٹا دیکھ کے خستہ مکان میں
کھاتے ہیں کھانا کتّے بھی گھس کر تُو لوٹ آ
تنخواہ پوری ہوٹل و دھوبی میں بٹ گئی
میں ہو گیا فقیر و فٹیچر تُو لوٹ آ
دیتا ہوں وارننگ میں ہڑتال کی تجھے
حد ہو گئی ستم کی ستم گر تُو لوٹ آ
ہو جائے گم نہ ہوش ہی دردِ جدائی سے
میں ہو نہ جاؤں مست قلندر تُو لوٹ آ
ظالم زمانے والے مرا حلیہ دیکھ کے
مجنوں سمجھ کے ماریں نہ پتھر تُو لوٹ آ
کھا کر قسم جدائی کی کہتا ہے عمر بھر
کاملؔ پڑھے گا بس یہی منتر تُو لوٹ آ

ہزل

کل نشے میں کام وہ سب آڑا ٹیڑھا کر گیا
اپنے گھر بھیجا کسی کو خود کسی کے گھر گیا
تھوبڑا اُن کا سناتا ہے کہانی رات کی
لے کے گورے گال کے بوسے کوئی مچھر گیا
دل میں لڈّو پھوٹتے تھے خوب شادی کے لئے
مار مُسّل کی پڑی جو اوکھلی میں سر گیا
جو سناتا تھا ہمیں رُستم گری کی داستاں
سامنا ہوتے ہی بیوی سے وہ رُستم ڈر گیا
دیکھ لے انجام رشتہ توڑنے کا دیکھ لے
ساتھ بیگم کے تِری کھٹیا گئی بستر گیا
کس لئے ماتم کناں ہے آج کوؤں کا ہجوم
کیا محلے کی گلی میں اُن کا نیتا مر گیا
فائدہ کاملؔ نہیں کچھ موسمِ برسات سے
چار قطرے آپ نے ڈالے سمندر بھر گیا

محمد توحید الحق
کامٹی

دنیا میں اپنے نام کا ڈنکا بجا کے رکھ
القاب جتنے ہو سکیں اتنے لگا کے رکھ
آتے ہیں آڑے وقت میں یہ کام بھی بہت
غنڈے ہیں جتنے شہر میں سب کو پٹا کے رکھ
تاکید میری ساس کی بیٹی کو ہے یہی
شوہر ہو سامنے تو سدا منہ پھلا کے رکھ
نکلے ہیں پھر وہ شہر میں خیرات بانٹنے
تو بھی کسی فقیر کا حلیہ بنا کے رکھ
پڑھ لے جو ایک بار تو ہو جائے بیڑا پار
دیوان اس طرح سے نہ میرا سجا کے رکھ
نادان یہ نہیں تیرے باوا کی خانقاہ
یہ محفلِ ادب ہے یہاں سر جھکا کے رکھ
(ماہنامہ شگوفہ، سالنامہ ۲۰۱۹)

طالبِ علم کی التجا

ہم کو مرغا جو کسی روز بنایا جائے

التجا ہے کہ نہ والد کو بتایا جائے
کوئی مضمون بھی پورا نہ پڑھایا جائے
ہم ہیں معصوم ہمیں یوں نہ ستایا جائے
نقل کرنے کی ذرا سی بھی جہاں چھوٹ نہیں
ایسے اسکول میں ہم کو نہ پڑھایا جائے
ایک تھیلا جسے کہتا ہے زمانہ بستہ
اتنا بھاری ہے کہ ہم سے نہ اٹھایا جائے
ایسے استاد جو فطرت سے ''جلالی'' ہیں بہت
ان کو فوراً کسی باوا کو دکھایا جائے

ان کے گھر کے ہی جھمیلوں سے نہیں جب فرصت
حالِ دل کس کو بھلا اپنا سنایا جائے
جتنے استاد پڑھانے میں ہوں کمزور بہت
ان کو ہمدرد کا معجون کھلایا جائے
سب سے ناکارہ مدرس کو ہی انعام ملے
ایسا قانون ریاست میں بنایا جائے
(سالنامہ ماہنامہ شگوفہ ۲۰۲۰)

ڈاکٹر محمد کلیم ضیاؔ

جوتیاں کرتے ہیں سیدھی رات دن سرکار کی
تاکہ حاصل ہوں اُنھیں بھی کرسیاں دربار کی
سات پھیرے کیا لگے سب ہیکڑی جاتی رہی
انگلیوں پر ناچتا پھرتا ہے اب دِل دار کی
کل صحافی اور مدیر و منتظم تھا جس کا میں
ردّیاں اب بیچتا پھرتا ہوں اُس اخبار کی
بے خودی میں غیر کو ہسبنڈؔ سمجھ کر لڑ پڑے
ان کو عادت پڑ گئی ہے ہر گھڑی تکرار کی
ہر گھڑی دھڑکا لگا رہتا ہے چپّل کا اُنھیں
کاش کر سکتے شکایت اِس انوکھی مار کی
کالی چوٹی، موٹی عینک، نقلی بتیسی لیے
وہ نشانی ڈھونڈتے پھِرتے ہیں اپنے پیار کی
فکر ہم پر اے ضیاؔ لازم مرمّت کی ہوئی
کافی اینٹیں گِر چکی ہیں قوم کی دیوار کی

ؔHusband

پہلے پاپا کو میرے پِلا ساقیا
دیکھ پھر زندگی کا مزہ ساقیا

خواب میں بڑبڑاتی تھیں اُن کی ماں
میرے بُڈھے کو مجھ سے مِلا ساقیا
سب زَنانوں کو ملنے لگیں کُرسیاں
کوئی سرکاری عہدہ بچا ساقیا
اُن کے بیلن سے زخمی ہوا میرا سر
ہو گئی ظلم کی انتہا ساقیا
ہے مرے پیٹ میں درد اُن کی طرح
گھُس گئی پیٹ میں کیا بَلا ساقیا
اِک منسٹر نے پرمِٹ دیا ہے مجھے
مئے کدہ ہے میرے باپ کا ساقیا
مئے کدے میں ضیاؔ شیخ جی آ گئے
اُن کو پیپسی کی بوتل پِلا ساقیا

نادرؔ بالاپوری

ڈھوتا ہی رہوں بار میں امی کی بہو کا
اتنا ہوں وفا دار میں امی کی بہو کا
سینے میں بساؤں کبھی پلکوں پہ سجاؤں
ایسا ہوں جاں نثار میں امی کی بہو کا
مل جائے الیکشن میں ٹکٹ جو کسی دَل کا
کرتا رہوں پر چار میں امی کی بہو کا
ہوتا ہوں شب و روز ہر اک حکم کے تابع
محکوم ہوں سر کار میں امی کی بہو کا
آتے ہی مرے گھر وہ چلی جاتی ہے پکنک
جیسے ہوا اتوار میں امی کی بہو کا
بنتی ہیں بنیں، چاہے مقدر مرا ڈانٹیں
چھوڑوں گا نہ گھر دار میں امی کی بہو کا
آنکھیں وہ دکھائے، کبھی انگلی وہ نچائے
شوہر ہوا لاچار میں امی کی بہو کا
دل میں یہ خیال آئے گلا گھونٹ کے نادرؔ
قصہ ہی کروں پار میں امی کی بہو کا

اترا اترا کے پھرو گی مجھے معلوم نہ تھا
مونگ چھاتی پہ دلو گی مجھے معلوم نہ تھا
ہو کے رہ جائے گی ارمانوں کی ایسی تیسی
وصل کی شب ہی لڑو گی مجھے معلوم نہ تھا
جینس بھی پہنو گی، کٹواؤ گی چوٹی
سوانگ ایسے رچو گی مجھے معلوم نہ تھا

بے حیائی کے دکھاؤ گی مناظر مجھ کو
تیر کی طرح چبھو گی مجھے معلوم نہ تھا
ہیں فدا اس پہ اگر ہوں یہ زمانے والے
تم بھی نادر پہ مرو گی مجھے معلوم نہ تھا

انیس احمد شوق

ہوش اب آنے لگا کس لیے بے ہوش رہوں
کب تلک اشک پیوں محو غمِ دوش رہوں
ساس کے طعنے سنوں اور ہمہ تن گوش رہوں
یعنی ذلت بھی سہوں اور میں خاموش رہوں

ساس کہتی ہے کہ منہ زور ہوں مغرور ہوں میں
میری فطرت ہے یہ عادت نہیں مجبور ہوں میں
گھر کے ہر چھوٹے بڑے کام پہ مامور ہوں میں
ایسا لگتا ہے کہ جیسے کوئی مزدور ہوں میں
میرے خاوند ذرا میری کہانی سن لے
سن چکا ماں کی ذرا میری زبانی سن لے

گھر میں رائج ہے بڑی بی کا ہی دستور قدیم
پاؤڈر پاس ہے میرے نہ میسر ہے کریم
دس عدد بچوں کی جو تم نے بنائی ہے ٹیم
چپ کراتی ہوں سمیہ کو تو روتا ہے ندیم

میرے ابا کو ہی شادی کی پریشانی تھی
ورنہ کیا عمر تھی گڑیوں کی میں دیوانی تھی
جم گئے آ کے یہاں جیٹھ بھی جیٹھانی بھی
ٹک گئے آ کے کبھی نانا کبھی نانی بھی
نندیں آ آ کے یہاں کرتی تھیں من مانی بھی
ہاتھ سے لیتی نہیں تھی جو کبھی پانی بھی
یہ بتاؤ کہ نحوست یہ بھگائی کس نے
گر رہی تھی جو معیشت وہ بچائی کس نے

روز دو وقت کا کھانا بھی پکایا میں نے
جھاڑو دی صحن میں پونچھا بھی لگایا میں نے
جا کے بازار سے سامان بھی لایا میں نے
گھر کی عزت کو کئی بار بچایا میں نے
ساس کہتی ہے مجھے پھر بھی وفا دار نہیں
مجھ پہ الزام ہے میں صاحب کردار نہیں

آ گئی عین رکابی میں اگر کچی پیاز
چھوٹے دیور نے بجایا جو مذمت کا ساز
تھا وہاں کون جو سن لیتا ابھاگن کا جواز

چار جانب سے دبائی گئی میری آواز
جو کسی بات پہ پہلے نہ کبھی ایک ہوئے
میں جو تھی مد مقابل تو سبھی ایک ہوئے

لطف آتا نہیں مر مر کے مجھے جینے میں
ہے نظر سب کی مرے کھانے میں اور پینے میں
دیکھتی ہوں جو کبھی خود کو میں آئینے میں
ایک طوفان سا اٹھتا ہے میرے سینے میں
اب مقدر میں میرے نرم نوالے ہی نہیں
ایسا لگتا ہے کہ قسمت میں اجالے ہی نہیں

خواب دیکھوں کہ مسرت کے سہانے دن ہوں
عیش و عشرت کے محبت کے ترانے دن ہوں
ہے یہ خواہش کہ میسر وہ پرانے دن ہوں
زندگی میں میری ہر وقت سہانے دن ہوں

بے سبب تم سے کہاں لہجہ درازی ہے میری
زندگی کیا ہے کہ ہاری ہوئی بازی ہے مری

وحیدؔ شیخ
ناگپور

طرحی مزاحیہ غزل

سُن سُن کے لوگ ہو گئے بیمار دوستو
''تفسیرِ زیست ہیں مِرے اشعار دوستو''
فہرِس میں حاضرین کی لکھوا کے اپنا نام
چہلم کی راہ تکتے ہیں غمخوار دوستو
کل تک جو اپنے آپ کو کہلاتے تھے مدیر
سائیکل پہ بیچتے ہیں وہ اخبار دوستو
میں نے ارادہ عشق کا تبدیل کر دیا
عاشق پہ پڑتی دیکھی جو کل مار دوستو
اپنی حدیں پھلانگ کے کرتے تھے جو گناہ
پولسِ نے اُن کو کر دیا حد پار دوستو
گوشے میں ایک بیٹھ کے کرتا ہوں اب شمار
بچوں کی گھر میں ہو گئی بھرمار دوستو
بیگم کے آج لگتے ہیں تیور کڑے وحید
پھر گھر میں آج، جنگ کے ہیں آثار دوستو

طرحی مزاحیہ غزل

غمِ رسوائی پینا آ گیا ہے
مجھے اس طرح جینا آ گیا ہے
ہوا جب سامنا ڈیڈی سے اُن کے
مِرے رُخ پر پسینہ آ گیا ہے
تِری محفل میں رُسوا ہونے عاشق
تِری خاطر حسینہ آ گیا ہے
یہ پِٹنے پر کہا عاشق نے اُن کے
''محبت کا قرینہ آ گیا ہے''
نئی آفت کوئی اے شیخؔ لے کر
وہ دیکھو پھر کمینہ آ گیا ہے

التمش شمس اکولوی

طرحی کاوش

مستقل ہو، عارضی اچھی نہیں
چار دن کی چاندنی اچھی نہیں
آؤ کچھ باتیں کریں رومان کی
وصل کی شب مسخری اچھی نہیں
عشق دو طرفہ اگر ہو تو بجا
بے سبب دیوانگی اچھی نہیں
ہر کسی کو کہہ رہے ہو ہینڈ سم
آپ کی یہ پالیسی اچھی نہیں
جلنے والوں سے کوئی کہہ دے ذرا
عاشقوں کی مخبری اچھی نہیں
انکساری عاجزی سے کام لے
یہ تری دادا گری اچھی نہیں
بے دھڑک گھس جا دیارِ شمس میں
جانِ من آوارگی اچھی نہیں

گھومتا رہتا ہے اکثر شمس کوئے یار میں
مبتلا ہے ان دنوں وہ عشق کے آزار میں
اک خبر دلچسپ آئی آج کے اخبار میں
''اب شفا خانے کھلیں گے حسن کے بازار میں''
تیری خاطر لے رہا ہوں دشمنی ہر ایک سے
اتنی طاقت آ گئی ہے اب ترے بیمار میں

عشق جب حد سے گزر جاتا ہے تو عالم پناہ
فرق آتا ہے نظر کب پھول میں انگار میں
بس اسی اک بات سے قائم وفا کا ہے بھرم
سینکڑوں اقرار بھی ہیں اک ترے انکار میں
زن مریدوں سے ہے قائم رونقِ بزمِ جہاں
تذکرہ یہ ہو رہا ہے جاہل و ہشیار میں
حسن والوں کو ہے میرا مخلصانہ مشورہ
جو مزہ ہے سادگی میں وہ کہاں پندار میں

عقیل ساحر
اکولہ

اب کہاں وہ پہلے جیسی پاس داری ہائے ہائے
میرے ہی سالے نے لی میری سپاری ہائے ہائے
کیا کہوں کیسے کہوں، سکتہ ہے طاری ہائے ہائے
اس برس بھی پاؤں سمدھن کا ہے بھاری ہائے ہائے
ایسی ماری گل بدن نے دل کے ٹکڑے ہو گئے
کس قدر تھی تیز نینوں کی کٹاری ہائے ہائے
بن سنور کر شہر میں جس وقت ہم داخل ہوئے
کوئے جاناں میں ہوئی چلّہ پکاری ہائے ہائے
برف باری میں پھنسا ہوں میں یہاں کشمیر کی
چھوڑ کر ظالم گئی کنیا کماری ہائے ہائے
عشق کا جو بھوت تھا یک لخت غائب ہو گیا
اپنی جوتی اس نے میرے سر پہ ماری ہائے ہائے
تھے کنوارے تو مزہ تھا، عقد ہو جانے کے بعد
آ گئی میک اپ کی ہم پہ ذمہ داری ہائے ہائے
ایسے ویسے بھی بہت اترا رہے ہیں آج کل
ہم کو بھاری جا رہی ہے انکساری ہائے ہائے
چلمنیں اب پہلے جیسی ہیں کہاں ساحر میاں
ختم ہوتی جا رہی ہے پردہ داری ہائے ہائے

ہزل

بینڈ باجا تیرا بجا دیوں کیا
نوکری والی ہے جمادیوں کیا
دور ہو جائے گا یہ دبلا پن
شہد کی مکّھیاں بھڑا دیوں کیا
اس مداری کے ہاتھ کی ہڈّی

کھوپڑی پر تری گھما دیوں کیا
تم جو آئے اجالا پھیل گیا
زیرو لائٹ کو اب بجھا دیوں کیا
جب بھی ٹکلا کوئی نظر آئے
یوں مچل جائے دل، بجا دیوں کیا
میں نے جوتا نیا خریدا ہے
پیٹھ ساحر تری کھجا دیوں کیا

بشیر بشر
بدنیرہ (امراؤتی)

وہ شہر کے چمچے ہوں کہ ہوں گاؤں کے چمچے
آتے ہیں سیاست میں تمناؤں کے چمچے
بزدل ہوئے اس قوم کی نیّا کے کھویّا
طوفانوں سے ڈر جاتے ہیں دریاؤں کے چمچے
نادان مسلمانو! کبھی غور کیا ہے
لوگوں کو لڑاتے ہیں ملّاؤں کے چمچے
لاتے ہیں مریضوں کو کرامات سنا کر
چلتے ہیں کمیشن پہ یہ باواؤں کے چمچے
ہم نے بھی فلاں بھاؤ کے جوتے کئے سیدھے
نازاں ہیں اسی بات پہ نیتاؤں کے چمچے
سیٹنگ میں لگے صاحبہ کی محترمہ کی
لگتے ہو بشرؔ تم بھی حسیناؤں کے چمچے

۲

نہ ہی تُکا نہ تیر وھاٹ از دھس
شہر کا ہے امیر وھاٹ از دھس
قیس رانجھا کو مل گیا گانجا
کوئی لیلیٰ نہ ہیر وھاٹ از دھس
پانچ سو ایک ووٹ کے بدلے
بیچ ڈالا ضمیر وھاٹ از دھس
ڈالتا ہے دہی کو بیسن میں
اور بناتا ہے کھیر وھاٹ از دھس
موٹی بیوی ہے پتلا شوہر ہے
دائرے پر لکیر وھاٹ از دھس
جو بھی شاعر ہے وہ قلندر ہے
ہر بھکاری فقیر وھاٹ از دھس
لوگ غزلیں چرا کے غالب ہیں
تو بشرؔ ہی بشیر وھاٹ از دھس

ڈاکٹر عمران علی خاں عمران

آج ہم زیرِ عتاب وقت وقت کی بات ہے
آپ اور عزت مآب وقت وقت کی بات ہے
جھوٹ مکاری فریب اور دکھاوے کا چلن
اب یہی سب کامیاب وقت وقت کی بات ہے
بے لباسی جب تمدن کی علامت بن گئی
کیسا پردہ کیسا حجاب وقت وقت کی بات ہے
یاد جب وعدے دلائے ہنس کے لیڈر نے کہا
ہو چکا اب انتخاب وقت وقت کی بات ہے
اب نہ چھیڑو دوستو باتیں لب و رخسار کی
ڈھل چکا ہے اب شباب وقت وقت کی بات ہے
کل تلک کوڑی نہ تھی آج جب کرسی ملی
کھا رہا ہے بے حساب وقت وقت کی بات ہے
خیر و شر کا ذکر تم عمرانؔ کرنا چھوڑ دو
اب کسے فکر حساب وقت وقت کی بات ہے

۲

میں بے خودی میں سر کو کھجاتا چلا گیا
خفّت کچھ اس طرح سے مٹاتا چلا گیا
جوتے پڑے تو شوق سے کھاتا چلا گیا
یوں عاشقی کا فرض نبھاتا چلا گیا
پتلی گلی سے بھاگنا شیوہ رہا مرا
دامن ہمیشہ ایسے بچاتا چلا گیا
چورن کی پڑیا جیب میں رکھی رہی سدا
دعوت میں بے دریغ بھڑاتا چلا گیا
دامن ہمیشہ ایسے بچاتا چلا گیا
عمران لیڈری میں سدا سرخ رو رہا
پبلک کو سبز باغ دکھاتا چلا گیا

جمیل انصاری

۱

بچوں کو چھوڑ چھاڑ کے میکے چلی گئی
رشتوں کو توڑ تاڑ کے میکے چلی گئی
میں نے کہا کہ دیکھنا ٹی وی کا ہے برا
ٹی وی کو پھوڑ پھاڑ کے میکے چلی گئی

۲

تعلیم پا کے منزلِ مقصود پائے گا
سوچا تھا، پر یہ چھوکرا رستہ بھٹک گیا
کالج میں چھوڑ چھاڑ کر اپنی پڑھائی کو
اک چھوکری کی زلف میں جا کر اٹک گیا

۳

ملّا مزے میں ہے نہ پجاری مزے میں ہے
مالِ حرام کھا کے جُواری مزے میں ہے
گھر بار کی ہے فکر نہ بچوں کا ٹینشن
ہے موج میں کنوارا، کنواری مزے میں ہے

۴

باتیں تو کر رہے ہیں بڑی آن بان کی
کرتے رہیں صفائی بھی اپنے مکان کی
کیا کہئے اس ادا کو مگر آنجناب کی
پچکاریاں ہیں چار طرف ہے ان کے پان کی

شاداب انجم
کامٹی

بیگم نے آج کوئی تقاضا نہیں کیا
اور ہم نے خرچ ایک بھی پیسا نہیں کیا
مہمان بن کے جیل بھی جاتے رہے ہیں ہم
پر اس کو پرمننٹ ٹھکانا نہیں کیا
دیکھی رقم جہیز کی اور کہہ دیا قبول
زوجہ کے رخ کا ہم نے نظارہ نہیں کیا
ہر ایک سوچتا ہے اسے دیکھتی ہے وہ
ترچھی نظر نے کس کو دوانہ نہیں کیا
دل میں چھپا کے راز کیا عقد دوسرا
پہلے نکاح کا بھی خلاصہ نہیں کیا
حصہ نہیں دیا ہمیں چوری کے مال میں
انجمؔ میاں یہ آپ نے اچھا نہیں کیا

۲۔
منھ کھولنے کی ہم کبھی ہمت نہ کر سکے
بیگم ترے ستم کی شکایت نہ کر سکے
مرنے کے بعد بھی ہے سسر جی سے یہ گلا
کیوں میرے نام پر وہ وصیّت نہ کر سکے

اف کاروبار بال اگانے کے تیل کا
ہم اپنے گنجے سر کی بدولت نہ کر سکے
ان سے رکھوں میں مرغِ مسلم کی کیا امید
جو پیش میرے سامنے شربت نہ کر کے
انجمؔ نے تین بار کہا تھا قبول اور
پھر اس کے بعد کوئی حماقت نہ کر سکے

آصف نعیم

منگرول پیر (ضلع واشم)

دیارِ حسن میں چرچے بہت ہیں
مرے محبوب کے نخرے بہت ہیں
ترقی کیسے مل پائے گی ان کو
سنا ہے یہ کہ وہ سچے بہت ہیں
شجر ہو تم مگر بے فیض بھی ہو
تمہاری ذات سے خدشے بہت ہیں
سنبھل کر راز دل ان کو بتانا
سنا وہ کان کے کچے بہت ہیں
جو تم کہہ دو وہی دہراتے جائیں
تمہاری بزم میں توتے بہت ہیں
ترے حلقے میں آصف میں بتاؤں
کھرے کم ہیں مگر کھوٹے بہت ہیں

پکّا عاشق ہوں سر پھرا ہوں میں
یہ نہ سمجھو کہ بیوڑا ہوں میں
مجھ کو مت ڈھونڈ میری ٹیرِس پر
تیرے آنگن ہی میں کھڑا ہوں میں
تو نے پِٹوایا تھا جہاں مجھ کو
پی کے اوندھا وہیں پڑا ہوں میں
چَل ہی جاؤں گا عشق نگری میں
کھوٹا سکہ نہیں کھَرا ہوں میں
تیری چیخوں سے بجھ نہ جاؤں کہیں
"رات کا آخری دیا ہوں میں"
عشق میں کی ہے میں نے پی ایچ ڈی
قیس و فرہاد سے بڑا ہوں میں
کھوٹا سکہ ہی ڈال کاسے میں
در پہ آصف کھڑا ہوا ہوں میں

شناس نامہ

نام : محمّد اسد اللّٰہ
مقامِ پیدائش : وروڈ، ضلع امراوتی (مہاراشٹر)
تاریخِ پیدائش: 16 جون 1958ء
تعلیم: ایم۔ اے۔ (اردو، عربی، انگریزی، فارسی)، بی ایڈ، پی ایچ ڈی، ڈپلوما ان جرنلزم اینڈ ماس کمیونی کیشن۔
پتہ: 30۔ گلستان کالونی، پانڈے امرائی لانس (ویسٹ)، جعفر نگر ناگپور 440013 (مہاراشٹر)
فون نمبر: +91 957 959 1149
ای میل: zarnigar2006@yahoo.com
بلاگ: bazmeurdu.blogspot.com
(اس بلاگ پر محمد اسد اللّٰہ کی آن لائن کتب دستیاب ہیں)
تصانیف:
1۔ بوڑھے کے رول میں (انشائیے)1991
2۔ پر پرزے (طنزیہ و مزاحیہ مضامین) 1992
3۔ ہوائیاں (مزاحیہ مضامین، ریڈیو نشریات) 1998
4۔ خواب نگر (بچوں کے لئے نظمیں) 2008
5۔ پیکر اور پرچھائیاں (تحقیقی و تنقیدی مضامین) 2012
6۔ گپ شپ (بچوں کے لئے کہانیاں و مضامین) 2013
7۔ انشائیہ کی روایت: مشرق و مغرب کے تناظر میں (تحقیق) 2015
8۔ ڈبل رول (انشائیے) 2015
تالیفات:
1۔ جمالِ ہم نشیں (مراٹھی مزاحیہ ادب کے تراجم) 1985
2۔ دانت ہمارے۔۔ (مراٹھی مزاحیہ کہانیوں کے تراجم) 1996
3۔ صبحِ زرنگار (مرتبہ یک بابی ڈرامے) 2001
4۔ پرواز (مرتّبہ کوئز) 2005
5۔ یہ ہے انشائیہ (تنقید و تحقیق) 2017
6۔ انشائیہ شناسی (مرتبہ مضامین، مذاکرہ) 2019
7۔ مزاحیہ مضامین (درسی کتابوں سے انتخاب) 2019
8۔ ماہنامہ کھلونا: ایک انتخاب (منتخب تحریریں) 2019

انعامات و اعزازات:
مراٹھی اردو خدمات کے لیے مہاراشٹر اسٹیٹ اردو اکادیمی ممبئی کا سیتو مادھو پگڑی ایوارڈ اور کتابوں پر مہاراشٹر، بہار، اتر پردیش اور مغربی بنگال اردو اکادمیوں کے انعامات۔

مجلسِ ادارت میں رکنیت:
1۔ مدیر: مُجلّہ تہذیب الکلام، ناگپور، چھ شمارے (2000) تا 2011))
2۔ رکن: مجلسِ ادارت، مشاہیرِ برار (جلد دوّم)
3۔ رکن: مجلسِ ادارت، کمار بھارتی، 2007، (اردو کی درسی کتاب برائے جماعت دہم) مہاراشٹر اسٹیٹ بورڈ آف ایجوکیشن، پونہ
4۔ رکن: مجلسِ ادارت مجلہ عروج، بیادگار 125 سالہ جشنِ یومِ تاسیس، انجمن حامیِ اسلام، ناگپور 2013
5۔ رکن: مجلسِ مطالعات و ادارت، اردو لسانی کمیٹی، بال بھارتی، پونے۔

(برائے جماعت اول تا دوازدہم)

انتخابات اور درسی کتابوں میں شمولیت:
1۔ بائیسکل کی رفاقت میں (انشائیہ)
مشمولہ: تعارفِ اردو، برائے جماعت نہم، مہاراشٹر ایجوکیشن بورڈ، پونے 1994
2۔ پیڑ نہ کٹنے پائے (نظم) مشمولہ: بال بھارتی، برائے جماعت دوم، پونے 2013
3۔ پریس کئے ہوئے کپڑے (انشائیہ)
مشمولہ: منتخب انشائیے، مرتبہ، سلیم آغا قزلباش، لاہور 1984
4۔ انڈر لائن (انشائیہ) مشمولہ: نئے انشائیے، مرتبہ، سلیم آغا قزلباش، لاہور 1992
5۔ ڈاکٹر رادھا کرشنن (مضمون) مشمولہ: بال بھارتی، برائے جماعت پنجم، پونے 2014
6۔ یشونت راؤ چوہان مہاراشٹر اوپن یونی ورسٹی، ناسک کی نصابی کتابوں کی تدوین۔
۱۔ غیر افسانوی ادب (اردو انشائیہ)،
۲۔ (مراٹھی تراجم)
7۔ مجلسِ مترجمین، ماحول کا مطالعہ برائے جماعت سوم (بال بھارتی) میں شمولیت
8۔ بخار (انشائیہ) مشمولہ : درسی کتاب مہاراشٹر جماعت نہم، کمار بھارتی، پونے
9۔ انڈر لائین (انشائیہ) مشمولہ : درسی کتاب برائے بی۔ اے، امراؤتی یونیورسٹی، امراؤتی
***

تشکر: مصنف جنہوں نے اس کی فائل فراہم کی
ان پیج سے تبدیلی، تدوین اور ای بک کی تشکیل: اعجاز عبید